اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جُدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

نوادرات

مجمُوعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری (مدظلہ العالی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

مخدومی المحترمی علامہ اسلم جیراجپوری کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس مقامِ بلند پر فائز ہیں کہ اچھے اچھے اربابِ فکر کو ان کی طرف نسبت سے اپنے تعارف میں فخر محسوس کرنا چاہیئے۔ بایں ہمہ، اگر کسی نووارد بساطِ علم و بصیرت کو ان کے تعارف کی ضرورت ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لئے اقبالؔ کے دو شعر کافی ہیں۔ جو "مردِ بزرگ" کے عنوان سے ضربِ کلیم میں درج ہیں۔ اقبالؔ مردِ بزرگ کے بارے میں لکھتا ہے کہ

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق

علامہ اسلم نے کس ماحول میں پرورش و تربیت پائی اس کا اندازہ ان کے اس مضمون سے لگ سکے گا جو "میری طالب علمی" کے عنوان سے اسی مجموعہ میں شائع ہو رہا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ وہ ماحول کس قدر کورانہ تقلید اور جمود و تعطلِ فکر و نظر کی تاریکیوں سے گھرا ہوا تھا۔ آپ کی تعلیم و تربیت ایسے ماحول میں ہوئی ہے لیکن اس کے بعد دنیا دیکھتی ہے کہ آپ اپنی ذاتی بصیرت سے تدبر فی القرآن کے اس مجتہدانہ مقام پر پہنچتے ہیں جو اس سے پہلے شاید ہی کسی اور کے حصے میں آیا ہو۔ ہمارے زمانے میں، قرآن سے دور گشتہ مسلمان کو پھر سے اس سرچشمۂ علم و حقیقت کے قریب لانے میں جو مستحسن کوششیں ہوئیں ان میں علامہ اسلم کے قرآنی فکر کا ایک خاص اور نمایاں حصہ ہے۔ انہوں نے فہمِ قرآن کی وہ راہیں (خود قرآن سے تلاش کر کے) متعین اور نمایاں کیں جو صدیوں سے امت کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔

قرآنی بصیرت کے علاوہ، آپ کی سیرت کی بلندی بھی کچھ کم مایۂ ناز نہیں۔ ابتدائی تعلیم و تربیت سے آپ کو جس منصب کے لئے تیار کیا گیا تھا، ظاہر ہے کہ اس میں ہاتھ چومنے والوں کی ایک دنیا آپ کی پرستش کرتی۔ نفسِ انسانی کے لئے یہ جاذبیت کچھ ایسی کم نہیں ہوتی کہ اس سے بآسانی دامن چھڑایا جا سکے۔

اس کے لئے بڑی قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن علامہ اسلم کی نگہ حقیقت بیں نے جب دیکھا کہ قرآن جس صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے وہ اس راہ سے مختلف ہے، تو انہوں نے قبائے مشیخت اور جبۂ پیشوائیت کو جس "قلندرانہ" انداز سے جھٹک کر الگ کر دیا اور اس کی جگہ "طالب العلمی درویشی" کی زندگی کو از خود اختیار کر لیا ، وہ ان کی پختگی ایمان اور بلندی کردار کا ایسا درخشندہ آئینہ ہے جس کی مثال علماء کے طبقہ میں بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اس کی وجہ سے انہیں کن دشوار گزار اور صعوبت انگیز مراحل سے گزرنا پڑا اور ان صبر آزما مراحل سے وہ دل کے کامل سکون اور پیشانی کی پوری کشادگی سے کس طرح شاداں و فرحاں گذر گئے، راقم الحروف کو اس کا ذاتی علم ہے۔ لیکن اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔ قرآن نے مردِ مومن کی جن نمایاں خصوصیات کا ذکر کیا ہے آج ان کا دلآویز پیکر دیکھنا ہو تو اوجھلے کے خاموش گوشے میں اسلم جیراجپوری کی ذات میں دیکھئے۔

فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمان

ندرتِ فکر و نظر کے علاوہ، علامہ اسلم کی دوسری خصوصیت ان کے اسلوب بیان کی سادگی اور جامعیت ہے۔ جس کے متعلق اقبالؔ نے (مرد بزرگ کے عنوان میں) کہا ہے کہ

مثلِ خورشید سحر فکر کی تابانی میں بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق

اس مصرعہ کو ایک مرتبہ پھر دہرائیے۔ بات میں سادہ و آزادہ، معانی میں دقیق۔ علامہ اسلم کے اسلوب نگارش کے متعلق سب کچھ سامنے آجائے گا۔ یہ پیرایۂ بیان بھی کسی اور کو کم ہی نصیب ہوا ہے۔

علامہ اسلم کی مستقل تصانیف کے علاوہ ان کے مضامین کے دو مختصر مجموعے، اس سے پہلے، اُمتِ مسلمہ، امرتسر کی طرف سے شائع ہوئے تھے لیکن وہ اب نایاب ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ کو صاحبِ مضامین نے خود (۱۹۴۹ء) میں اپنے قیام پاکستان کے دوران میں، مرتب کیا تھا۔ اس مجموعہ میں قرآنی معنا کے علاوہ آپ کے بہت سے ادبی اور تاریخی مقالات بھی شامل ہیں۔ ہر مضمون کے ساتھ اس کا سنِ تخلیق بھی دے دیا گیا ہے تاکہ صاحب تحریر کے ذہنی ارتقاء کے مختلف مدارج سامنے آجائیں۔ انسانی فکر جوں جوں آگے بڑھتا ہے، نئے نئے حقائق اس پر منکشف ہوتے جاتے ہیں۔ اسی کا نام ذہن کا تدریجی ارتقاء ہے۔ لیکن ذہن انسانی کے کسی دَور کا نتیجۂ فکر ہو، اسے حقیقت کا درجہ اسی صورت میں مل سکتا ہے جب اسے

قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی سند حاصل ہو جائے۔ علامہ اسلم اسی مسلک کے حامل اور داعی ہیں۔ وہ دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے ہیں اور خود اپنی تحریروں کو بھی اسی معیار پر پرکھنے کے لئے پیش کرتے ہیں۔

ادارۂ طلوعِ اسلام شکریہ کا مستحق ہے کہ اس نے ان نوادرات کی اشاعت کا انتظام کیا۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ علامہ اسلم کے دیگر مضامین کو بھی (جن کے مجموعے آج نایاب ہو رہے ہیں) رفتہ رفتہ شائع کرتے جائیں گے کہ۔۔۔ بعدِ او نایدچو او مردِ فقیر۔

کراچی، یکم اکتوبر ۱۹۵۱ء

پرویز

جملہ حقوق بحقِ طلوعِ اسلام ٹرسٹ محفوظ ہیں

نام کتاب ———— نوادرات
مصنف ———— علامہ محمد اسلم جیراجپوری
ناشر ———— طلوعِ اسلام ٹرسٹ ۲۵۔ بی گلبرگ ۲۔ لاہور ۱۱
طابع ———— خالد منصور نسیم۔ النور پرنٹرز و پبلشرز
۲/۳ فیصل نگر، ملتان روڈ، لاہور ۲۵
ایڈیشن ———— دوم (۱۹۸۹ء)
صفحات ———— ۲۵۴
قیمت ————

طلوعِ اسلام ٹرسٹ کی شائع کردہ جملہ کتب کی آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

فہرست عنوانات

شمار	عنوان	صفحہ	شمار	عنوان	صفحہ
۱	آنحضرت صلعم کا بچپن	۷	۱۶	مثنوی مخزن الاسرار	۱۲۴
۲	اُسوۂ محمدیہ پر ایک نظر	۱۳	۱۷	التفہیمات الالٰہیہ	۱۳۶
۳	معراج	۱۸	۱۸	اسبابِ زوالِ اُمّت	۱۵۵
۴	معاہدۂ نبویؐ	۲۲	۱۹	مسئلۂ خلقِ قرآن	۱۶۶
۵	ختمِ نبوّت	۲۹	۲۰	وہمِ تعارض	۱۷۹
۶	گنبدِ خضرا	۳۸	۲۱	وقت کی دینی حیثیت	۱۸۸
۷	حضرت ابوذر غفاریؓ	۴۶	۲۲	ملکِ یمین	۱۹۳
۸	حضرت اُویس قرنیؓ	۵۴	۲۳	جغرافیہ اور مسلمان	۱۹۵
۹	صباح	۶۵	۲۴	عربی خط	۲۰۳
۱۰	حلیمہ نجدیہ	۶۹	۲۵	نابینائی	۲۲۱
۱۱	مثنوی اسرارِ خودی	۷۴	۲۶	نادرشاہ اور اتحادِ سنّی و شیعہ	۲۴۴
۱۲	پیامِ مشرق	۸۹	۲۷	سفرِ حج	۲۶۴
۱۳	جاوید نامہ	۱۰۷	۲۸	حالاتِ حج	۲۷۴
۱۴	ضربِ کلیم	۱۱۷	۲۹	حقیقتِ حج	۲۹۶
۱۵	یہ یومِ اقبال	۱۲۱	۳۰	میری طالب العلمی	۳۰۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آنحضرتؐ کا بچپن

(از رسالہ طلوع اسلام دہلی مئی ۱۹۴۱ء)

عرب کے شہر مکہ کے سب سے بڑے سردار عبدالمطلب تھے، جن کے دس نامور بیٹے تھے۔ ایک بیٹے کا نام عبداللہ تھا۔ عبدالمطلب نے ان کا نکاح حضرت آمنہ کے ساتھ کیا جو قریش کے قبیلہ کی ایک شاخ بنی زہرہ کی عزیزترین بیٹی تھیں۔ نکاح کے تھوڑے دنوں بعد حضرت عبداللہ نے تجارت کی غرض سے مکہ سے ملک شام کا سفر کیا۔ راستہ میں مدینہ میں جہاں اُن کا ننہال تھا بیمار ہو کر ٹھہر گئے اور وہیں انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے چند مہینوں کے بعد دوشنبہ کے دن صبح کے وقت ۹ ربیع الاوّل مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء میں حضرت آمنہ کے شکم سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ یہ وہی سال تھا جس میں یمن کے بادشاہ ابرہہ نے ہاتھی لے کر خانۂ کعبہ کو ڈھانے کے لئے مکہ پر چڑھائی کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھی اور اس کی فوج کے بڑے حصہ کو عذاب سے تباہ و برباد کر دیا تھا۔

حضرت عبدالمطلب اپنے اس پوتے کی پیدائش کی خبر سن کر بہت خوش ہوئے۔ عرب کی رسم کے مطابق ساتویں دن ختنہ کیا اور محمدؐ نام رکھا۔ یہ نام نیا تھا۔ عربی قبیلوں کے نسب ناموں کے دیکھنے سے سوائے بنی تمیم کے ایک سردار کے اس نام کا اور کوئی آدمی سارے عرب میں اس سے پہلے نہیں ملتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے ان کی والدہ نے دودھ پلایا۔ پھر ثُویبہ دودھ پلانے لگیں، جو آپؐ کے چچا ابولہب کی لونڈی تھیں۔ اس زمانہ میں مکہ کے سرداروں میں یہ دستور تھا کہ وہ اپنے نوزائیدہ بچوں کو دیہاتی اور بادیہ نشین قبیلوں کی عورتوں کو دودھ پلانے اور پرورش کرنے کے لئے سپرد کر دیتے تھے تاکہ ان کے بچے بدوی گھرانوں اور کھلے بیابانوں میں پل کر توانا اور تندرست ہوں اور عرب کی خصوصیات اور خصلتیں ان میں محفوظ رہیں اور فصیح عربی زبان سیکھیں۔ اس دستور کی وجہ سے ہر سال دو مرتبہ مکہ میں اکثر کے دیہاتی قبیلوں کی عورتیں آیا کرتی تھیں۔ اور قریش کے رؤسا اپنے بچوں کو ان کے حوالے کر دیتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے کچھ دنوں کے بعد قبیلہ بنی سعد کی کچھ عورتیں بچوں کی تلاش میں مکہ میں آئیں۔ ان میں ایک عورت حلیمہ سعدیہ بھی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ نے ان کو اپنا بچہ دینا چاہا مگر انہوں نے اس خیال سے کہ یتیم بچہ کی پرورش میں مجھکو کیا ملے گا قبول نہ کیا۔ اتفاقاً ان کو کوئی دوسرا بچہ مل نہ سکا اور خالی ہاتھ جانا بھی مناسب نہ سمجھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لے لیا۔ مگر پھر ان کو اپنی ہر چیز میں برکت نظر آنے لگی۔ اس لئے اس بچہ کی بہت قدر اور محبت کرنے لگیں۔ ان کی ایک بیٹی کا نام شیما تھا۔ اُن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت انس تھا اور وہی آپ کو کھلایا کرتی تھیں۔ دو سال کے بعد حلیمہ نے جب دودھ چھڑایا تو آپؐ کو مکہ میں لائیں۔ مگر اس زمانہ میں مکہ میں وبا پھیلی ہوئی تھی اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ نے فرمایا کہ ابھی واپس لیجاؤ۔ حلیمہ خوش ہو کر پھر آپ کو گھر لائیں اور چوتھے سال مکہ میں لیجا کر آپ کی والدہ کے سپرد کیا۔ اس طرح پر تقریباً چھ سال آپ کی پرورش قبیلہ بنی سعد میں حلیمہ سعدیہ کے گھر میں ہوئی۔

بنی سعد کا قبیلہ فصاحت میں مشہور تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسالت کے زمانہ میں فرمایا کرتے تھے کہ میں تم سب سے اچھی عربی بولتا ہوں کیونکہ ایک تو میں قریشی ہوں دوسرے میری زبان بنی سعد کی زبان ہے۔ حلیمہ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت محبت تھی۔ نبی ہونے کے بعد جب وہ مکہ میں آئیں تو آپؐ میری ماں، میری ماں، کہہ کر اُن سے لپٹ گئے اور چالیس بکریاں اور اونٹ عطا کئے۔ حضرت حلیمہ بھی اسلام لائیں۔ اور ان کے شوہر حارث بھی مسلمان ہوئے۔ حضرت خلیفۂ اوّل ابوبکر صدیق رضؓ کے زمانہ تک زندہ رہیں۔ وہ بھی ان کے ساتھ وہی مہربانی اور سلوک کرتے تھے جو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا تھا۔

جنگِ اوطاس میں جب بنی سعد کے لوگ مسلمانوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوئے تو ان میں حضرت حلیمہ کی بیٹی شیما بھی تھیں۔ انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ میں تمہارے رسول کی بہن ہوں۔ لوگ اُن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے۔ شیما نے اپنی پیٹھ پر ایک نشان دکھایا اور کہا کہ ایک بار بچپن میں آپؐ کو کھلا رہی تھی آپ نے دانتوں سے کاٹ لیا تھا۔ حضورؐ کی آنکھوں میں محبت کی وجہ سے آنسو بھر آئے۔ اُن کے بیٹھنے کے لئے خود اپنی چادر بچھائی اور دیر تک باتیں کرتے رہے پھر اونٹ اور بکریاں دے کر عزت و آرام کے ساتھ ان کو ان کے گھر پہنچا دیا۔ شیما بھی اور ان کی بھائی عبداللہ دونوں اسلام لائے۔

حضرت ثُوَیبَہ جو ابولہب کی لونڈی تھیں اور جنہوں نے آپؐ کو چند روز دودھ پلایا تھا ان کے لئے ہر سال مدینہ سے انعام اور جوڑا بھیجتے تھے، جب وہ انتقال کر گئیں تو دریافت فرمایا کہ ان کا کوئی وارث ہے، معلوم ہوا کہ نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کبھی کبھی مکہ سے مدینہ کو اپنے شوہر کی قبر پہ زیارت کو تشریف لیجایا کرتی تھیں۔ جب آنحضرتؐ حلیمہ کے ہاں سے آگئے تو ان کو بھی اپنے ساتھ لے گئیں۔ حضرت عبدالمطلب بھی ہمراہ تھے۔ مدینہ میں وہ بیمار ہوگئیں اور واپسی کے وقت مقام ابواء میں پہنچ کر انتقال ہوگیا اور وہیں دفن کی گئیں۔ حضرت عبدالمطلب پوتے کو لے کر مکہ واپس آئے۔ اس سفر میں اُمِّ ایمن بھی ساتھ تھیں جو آپؐ کی دایہ تھیں۔ آنحضرتؐ کی عمر اس وقت چھ سال کی تھی مگر بہت سی باتیں مدینہ کی یاد رہ گئیں تھیں۔ جب ترپن سال کی عمر میں ہجرت کر کے آپؐ مدینہ تشریف لے گئے تو ایک بار محلہ بنی عدی میں گذر ہوا۔ لوگوں سے فرمایا کہ اس مکان میں میری والدہ ٹھہری تھیں اور یہ وہ تالاب ہے جس میں میں نے تیرنا سیکھا تھا اور اس میدان میں ایک لڑکی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا جس کا نام انیسہ تھا۔

آپؐ کی والدہ کے انتقال کے بعد حضرت عبدالمطلب آپ کو اور بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے وہ بے حد محبت کرتے تھے۔ کعبہ کے سایہ میں ان کے لئے فرش بچھایا جاتا تھا، ان کے بیٹے ادب سے اس کے کنارے بیٹھتے تھے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب آتے سیدھے فرش پر اپنے دادا کے پاس چلے جاتے۔ ان کے چچا ان کو پکڑ کر کھینچتے کہ اپنے برابر بٹھائیں۔ عبدالمطلب فرماتے کہ نہیں، اس کو چھوڑ دو، میرے اس بچہ کا مزاج شاہانہ ہے اور اس کی شان ہی کچھ اور ہے۔ پھر ان کو اپنے پاس بٹھاتے اور محبت سے ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تندرستی، قوت، شکل اور خوش مزاجی کے لحاظ سے اپنے ہم عمروں میں ممتاز تھے اس لئے نہ صرف گھر کے لوگ بلکہ ہر شخص آپؐ سے محبت کرتا تھا۔

جب آٹھ سال کے ہوئے اس وقت آپؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب جن کی عمر ۸۲ بیاسی سال کی ہو چکی تھی وفات پا گئے۔ اُن کا جنازہ اٹھا تو حضورؐ محبت کی وجہ سے اس کے ساتھ ساتھ روتے ہوئے جاتے تھے۔

حضرت عبدالمطلب کے دس بیٹوں میں سے آنحضرتؐ کے والد عبداللہ اور ابوطالب اور زبیر تینوں ایک

ماں سے تھے جن کا نام فاطمہ مخزومیہ تھا۔ اسی وجہ سے حضرت عبدالمطلب نے اپنی وفات کے وقت حضورؐ کو پرورش کے لیے آپ کے حقیقی چچا ابوطالب کے حوالہ کیا۔ وہ آپ کو اپنے گھر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے اور نہایت محبت اور پیار سے پرورش کرتے تھے۔ خود اپنے بچوں سے بھی زیادہ آپ کا خیال رکھتے تھے سوتے تو ساتھ لیکر سوتے اور باہر جاتے تو ساتھ لے کر جاتے۔

اس زمانہ میں مکہ میں کسی قسم کی تعلیم نہیں تھی، نہ کوئی مکتب یا مدرسہ تھا، نہ کوئی تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ شرفاء کے لڑکے سادہ اخلاق و عادات اپنے گھروں کے بڑے بوڑھوں سے سیکھتے تھے، اور دن بھر میں ان کا مشغلہ بکریاں چرانا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس زمانہ میں بکریاں چراتے تھے۔ سمجھو تو دراصل یہ دنیا کی گلہ بانی کی ابتداء تھی۔ چنانچہ اکثر انبیاء جو گذرے ہیں پہلے انہوں نے بکریاں چرائی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ جو بنی اسرائیل میں سب سے بڑے نبی گزرے ہیں وہ تو شبان یعنی چرواہے مشہور تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہو جانے کے بعد کبھی کبھی اپنے بکریاں چرانے کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ ایک بار اصحاب کے ساتھ جنگل میں جانا ہوا لوگ جھڑبیر یاں توڑ توڑ کر کھانے لگے۔ حضورؐ نے فرمایا جو خوب سیاہ ہو جاتی ہیں وہ زیادہ مزے کی ہوتی ہیں اور یہ میرا اس زمانہ کا تجربہ ہے جب بچپن میں یہاں میں بکریاں چرایا کرتا تھا۔

قریش کا قبیلہ تجارت کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ دستور تھا کہ سال میں گرمی کے موسم میں تجارت کی غرض سے ان کا قافلہ ملک شام میں جاتا تھا اور سردی کے موسم میں یمن میں۔ اس طرح یہ وہ ایک ملک کا مال دوسرے ملک میں لے جا کر فروخت کرتے تھے اور نفع کماتے تھے۔ یہی ان کا ذریعہ معاش تھا اور اسی سے وہ خوشحال تھے۔ ایک بار حسب دستور حضرت ابوطالب قریش کے قافلے کے ساتھ شام کے سفر پر جانے لگے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جن کی عمر اس وقت نو سال کی تھی ان کے ساتھ جانا چاہا۔ وہ سفر کی تکلیف کے خیال سے آپ کو اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتے تھے مگر آنحضرتؐ کو ان کے ساتھ اس قدر محبت تھی کہ جب وہ روانہ ہونے لگے تو آپ دوڑ کر لپٹ گئے۔ حضرت ابوطالب نے آپ کا دل توڑنا گوارا نہ کیا اور ساتھ لے لیا۔ اہل قریش جب ملک شام کے مشہور بازار بصریٰ میں پہنچے تو وہاں ایک راہب نے جس کا نام بحیرا تھا ان لوگوں کو اپنی خانقاہ میں ٹھہرایا۔ اس کی نظر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی تو ابوطالب سے کہا کہ تم جس قدر جلد ممکن ہو اس بچہ کو لے اپنے

وطن واپس لے جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی یہودی دشمن ان کو دیکھ پائے اور نقصان پہنچائے کیونکہ آسمانی کتابوں میں آخری پیغمبر کی جو نشانیاں بتائی گئی ہیں وہ ان میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوطالب خرید و فروخت سے فارغ ہوتے ہی نہایت حفاظت کے ساتھ آپ کو مکہ واپس لائے۔

جب آپ کی عمر چودہ سال کی ہوئی اس وقت مکہ میں فجار کی لڑائی پیش آئی جو زمانۂ جاہلیت کی بڑی ہولناک اور مشہور لڑائیوں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ جنگ قریش اور بنی قیس میں ہوئی تھی۔ قیس کے قبیلے نے عہد توڑ دیا تھا اور حرم کے اندر گھس آئے تھے اور اس مہینہ میں جس میں لڑائی حرام ہے بعض آدمیوں کو قتل کر ڈالا تھا اسی وجہ سے اس جنگ کا نام فجار یعنی ناحق کی لڑائی رکھا گیا۔

مقابلہ کے لئے قریش کے تمام خاندان متفق ہوئے اور ایک لشکر تیار کیا جس میں ان کا ہر ایک کنبہ اپنی الگ جماعت بنا کر شریک ہوا۔ آنحضرتؐ کے حقیقی چچا زبیر بن عبد المطلب اپنے کنبہ یعنی آل ہاشم کے علمبردار تھے۔ روزانہ کچھ لوگ مقابلہ کے لئے نکلتے۔ ایک دن بڑے زور کا رن پڑا۔ اس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہوئے۔ آپؐ دشمنوں کے تیروں کو چن چن کر اپنے چچاؤں کو لا کر دیتے تھے۔

آخر میں دونوں فریقوں میں آپس میں صلح ہوئی اور لڑائی ختم ہو گئی، لیکن چونکہ اس لڑائی میں بہت سے لوگ مارے گئے تھے اور بہت سے بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہو گئی تھیں اس وجہ سے قریش کے سرداروں نے مل کر آپس میں قسم کھائی کہ وہ ہمیشہ ان کی حمایت کریں گے جن پر ظلم کیا جائے گا اور ظالموں کا مقابلہ کریں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس حلف میں موجود تھے اور نبوت کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ میں خوش ہوں کہ اس محفل میں شریک تھا اور آج بھی اس معاہدہ کے لئے اگر کوئی جماعت مجھ کو بلائے تو میں تیار ہوں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے چونکہ اپنی آخری اور سب سے بڑی رسالت کے لئے پیدا کیا تھا اس وجہ سے ان کو بچپن ہی سے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ وہ بچوں میں سب سے بہتر اور پیارے تھے اور ان تمام عیبوں سے پاک تھے جو مکہ کے دوسرے بچوں میں تھے۔ وہ اپنے رفیقوں سے نہ کبھی لڑتے تھے نہ جھگڑتے تھے نہ کبھی کوئی برا کلمہ اپنی زبان سے نکال گوارا کرتے تھے۔ بچپن میں ایک بار آپ کے ساتھ کھیلنے والے بچے پتھر کے ٹکڑے کندھوں پر اٹھا اٹھا کر ڈھو رہے تھے۔ سب نے اپنے اپنے تہبند کھول کر کندھوں پر رکھ لئے تھے۔ آنحضرتؐ کا کندھا پتھروں کے ڈھونے کی وجہ سے چھل گیا تھا۔ یہ دیکھ کر آپ کے چچا حضرت عباسؓ نے کہا کہ بھتیجے تم بھی

اپنا تہمد کندھے پر رکھ لو۔ حضورؐ نے جوں ہی ان کے کہنے پر عمل کیا، اپنی عریانی کے خیال سے غش آنے لگا اور فوراً تہمد باندھ لیا۔

آپ کی قوم بُت پوجتی تھی، مگر آپ نہ کبھی ان کی عبادتوں میں جاتے تھے نہ بتوں پر چڑھائی ہوئی کوئی چیز کھاتے تھے اور نہ ان کی مشرکانہ رسموں میں شریک ہوتے تھے۔ جن محفلوں میں باجہ اور راگ ہوتا تھا ان میں کبھی نہیں جاتے تھے۔ غرض جاہلیت کی ہر قسم کی برائیوں سے اللہ نے آپ کو محفوظ رکھا۔ آپ شروع ہی سے اپنے عادات اور اطوار کی وجہ سے مکہ کے سب سے زیادہ ہر دلعزیز بچے تھے اور پھر آپ کی عمر جس قدر بڑھتی گئی، آپ کی نیکی، سچائی اور شریفانہ خصلتوں کی وجہ سے قوم کی نگاہوں میں آپ کی عزت بڑھتی گئی یہاں تک کہ جوان ہونے پر آپؐ کے اوپر سب کو بھروسہ ہو گیا اور ساری قوم آپؐ کو امین کے لقب سے پکارنے لگی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسوۂ محمدیہ پر ایک نظر

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل اور مہربانی سے نبوت کبریٰ اور رسالت عامہ سے سرفراز فرمایا اور آپ کی ذات بابرکات پر نبوت کے سلسلہ کو جو نوع انسانی کے آغاز سے چلا آتا تھا ختم کر دیا۔ آپ کے اوپر جو کتاب نازل فرمائی یعنی قرآن کریم اس کو جملہ انسانوں کے لئے خواہ کسی زمان و مکاں میں ہوں برحق اور اٹل قرار دیا اور تمام گذشتہ آسمانی کتابوں کی جامع تعلیمات کو اس میں شامل فرمایا اور آپ کو ایسا خلق عظیم عطا کیا جو سارے سابقہ رسولوں کے خلق [illegible] کا نمونہ ہے۔

یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جن کو ہر انسان جو صاحب بصیرت ہے ذرا سے غور و فکر سے نہایت آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ قرآن جس طرح اترا اسی طرح بلا ایک زیر زبر یا ایک نقطہ کے فرق کے آج دنیا میں مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک موجود ہے اور پڑھا جاتا ہے۔ اور وہ جس زبان میں اترا وہ زبان یعنی عربی اسی وقت سے برابر ترقی پذیر ہے اور اس کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے دیگر آسمانی کتابوں کی صحت یا بجنسہٖ محفوظ رہنے کا کوئی ثبوت نہیں دیا جا سکتا بلکہ ان میں تغیر و تبدل اور تحریف نے راہ پائی ہے اور مدتہائے دراز سے اس کی حفاظت کی کوئی ضمانت نہیں ہے اور وہ کتابیں جن زبانوں میں نازل ہوئیں یا جن میں ان کے نازل ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ سب کیا سب کبھی کی مردہ ہو چکی ہیں۔

اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے رسول اور نبی دنیا میں بھیجے گئے آج ان کے احوال و اعمال بجز ان کے جو قرآن کریم نے بیان کر دیئے ہیں۔ یقینی شکل میں موجود نہیں ہیں۔ اس لئے جو شخص صحیح اور محفوظ آسمانی کتاب تلاش کرے اس کے لئے سوائے قرآن کے کوئی دوسری کتاب روئے زمین پر نہیں

مل سکتی اور انبیاء کرام کے خلق عظیم کا روشن نمونہ جو زندگی کے ہر شعبہ میں راہنمائی کرے، سوائے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے جن کی زندگی کا ہر گوشہ نہ صرف تاریخ و سیرۃ بلکہ عملی تواتر کے ذریعہ سے نمایاں اور بے نقاب ہے اور کہیں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

یہ اسوۂ حسنہ انسانوں کی ہر قسم کی ہدایت کے لئے خواہ اجتماعی ہو یا انفرادی، دنیا کے سامنے کھلا ہوا موجود ہے۔ جس کی تفصیل میں بڑے بڑے دفاتر لکھے جا چکے ہیں اور لکھے جا سکتے ہیں۔ اس مختصر وقت میں میں اس کے عنوانات بھی نہیں گنا سکتا۔ صرف ایک بات اس میں سے سامعین حضرات کو سنانی چاہتا ہوں۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انسانوں اور ہر جگہ کے انسانوں نے اپنے اندر مختلف طبقات اعلیٰ اور ادنیٰ، شریف اور رذیل بنا رکھے تھے اور انسانی برادری کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اخوت اور مساوات باہمی کو بالکل مٹا رکھا تھا۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگ ادنیٰ طبقہ کے لوگوں پر دست درازیاں کرتے اور ان کے حقوق ہضم کر جاتے تھے اور ادنیٰ طبقہ کے لوگ اس قدر کمزور اور بے بس کر دیئے گئے تھے کہ وہ اس جبر و ستم کے خلاف آواز بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے بذریعہ وحی کے تعلیم دی کہ سارے انسان خواہ اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں اور سب کی ایک ہی برادری ہے۔ نسل یا خاندان کے لحاظ سے نہ کوئی بڑا ہے نہ کوئی چھوٹا۔ سب کے حقوق برابر ہیں۔ بڑائی اور چھوٹائی کا مدار خود ہر انسان کے اپنے عمل پر ہے۔ جو اللہ سے ڈرے اور اس کے خوف سے برائی سے بچے اور نیک کام کرے وہ بڑا ہے اور جو اللہ سے نہ ڈرے اور برے کام کرے وہ ذلیل و حقیر ہے خواہ اپنے آپ کو کتنی ہی اونچی نسل کا سمجھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی تعلیم کے مطابق اپنا اسوۂ حسنہ دنیا کی ہدایت کے لئے پیش کیا اور سارے انسانوں کو اخوت اور مساوات کی لڑی میں پرو دیا۔ آپ جس قبیلہ کے تھے یعنی قریش وہ اپنے آپ کو عرب کے تمام قبیلوں سے حسب اور نسب میں بڑھ کر سمجھتا تھا اور حضرت اسماعیلؑ کی اولاد اور خانۂ کعبہ کا متولی اور مجاور ہونے کی وجہ سے سارے اہل عرب بھی اس کو اپنے سے زیادہ معزز اور شریف مانتے تھے۔ لیکن آنحضرتؐ نے اس سارے نسلی فخر و غرور کو مٹا دیا۔ یہاں تک کہ اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کا نکاح

حضرت زید بن حارثہ کے ساتھ کر دیا جو غلام مشہور تھے، حالانکہ عرب کے نزدیک غلام بہت ادنیٰ اور حقیر سمجھے جاتے تھے۔ پھر ۸ھ میں جب مکہ فتح ہوا اس وقت خانۂ کعبہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر اپنے قبیلہ یعنی اہلِ قریش کو جو سامنے جمع تھے مخاطب کر کے فرمایا کہ "آج تمہارے سارے فخر کے دعوے میرے قدم کے نیچے ہیں"۔ اس طرح سب سے پہلے خود اپنی قوم کا نسبی فخر اور نسلی غرور پامال کر دیا اور بتا دیا کہ سارے انسان ایک برادری ہیں لہٰذا سب برابر ہیں۔ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے خطبہ میں امتِ اسلامیہ کو جو وصیتیں کیں ان میں یہ بھی فرمایا کہ

"نہ عربی کو عجمی پر فضیلت ہے نہ عجمی کو عربی پر، نہ گورے کو کالے پر، نہ کالے کو گورے پر، سارے انسان آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔"

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کا صحیح وقار قائم کیا اور نسلی اور خاندانی برتری اور فضیلت کے خیال کو بکھیر مٹا کر جملہ نوعِ انسانی میں خواہ وہ کسی ملک اور کسی نسل کے ہوں مساوات اور اخوت کی بنیاد رکھی۔

خاتم النبیینؐ کی دیگر جو خصوصیات ہیں ان میں سے اگر صرف اسی ایک خصوصیت کا ارباب بصیرت لحاظ کریں تو اسوۂ محمدیہؐ کی عظمت ان کو معلوم ہو سکتی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ دیگر انبیاء کرام میں یہ وصف نہ تھا بلکہ صرف یہ کہ مساوات اور اخوت دنیا کی قوموں میں حضورؐ ہی کی بدولت عام ہونی شروع ہوئی اور سارے عالم کو یہ روشنی اسوۂ محمدیہؐ ہی سے ملی جس کی طرف آج دنیا کی کل قومیں کشاں کشاں آ رہی ہیں۔ کیونکہ انسانیت کا امن صرف اسی ایک نقطہ پر پہنچ کر مل سکتا ہے۔

سرورِ عالم کی یہ کیفیت تھی کہ ہر انسان کے ساتھ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اس محبت کا سلوک کرتے تھے کہ ہر ایک آپ کو اپنے شفیق باپ سے بڑھ کر سمجھتا تھا۔ جو کوئی ملنے کے لئے آتا آپ اس کی تعظیم کرتے۔ اور جب تک وہ اٹھنے کی خواہش نہ کرتا خود نہ اٹھ جاتے۔ اکثر اپنا گدا یا کمبل اس کے لئے بچھا دیتے اور جو ملتا سلام اور مصافحہ میں اس سے پیش دستی کرتے۔ جب کسی کو بلاتے تو اس کا وہ نام لیتے جو عزیز ترین ہوتا۔ کسی کی بات کو جب تک وہ ختم نہ کرے بیچ میں سے نہیں کاٹتے تھے۔ نماز پڑھنے میں اگر کوئی ضرورت مند آ جاتا تو اس کے خیال سے نماز کو ہلکی کر دیتے۔ ہر شخص کی عزت کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے

ہر ایک یہی سمجھتا تھا کہ مجھ سے زیادہ آپ کسی کو نہیں چاہتے۔ کوئی شخص آپؐ کی ذات سے مایوس نہیں ہوتا تھا۔ فقراء اور مساکین کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ ان کے ساتھ بیٹھتے۔ ان میں سے کوئی بیمار ہوتا تو اس کی عیادت کے لئے جاتے۔ کوئی ان میں سے اپنی دعوت میں آپ کو بلاتا تو خوشی سے شریک ہوتے اور خود ان کی دعوتیں کرتے۔ اور جب کوئی تعظیم کے لئے کھڑا ہوجاتا تو منع فرماتے کہ یہ عجمیوں کا طریقہ ہے۔ ایسا نہ کرو۔ اپنے اصحاب میں اس طرح ہل جل کر بیٹھتے تھے کہ اجنبی شخص امتیاز نہیں کرسکتا تھا کہ ان میں سے رسولؐ اللہ کون ہیں۔ ایک بار ایک شخص سامنے آیا۔ حضورؐ کے رعب و جلال سے کانپنے لگا۔ آپ نے اس کی تسلی کے لئے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں۔ میں بادشاہ نہیں ہوں بلکہ قریش کی ایک بیوہ کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔

اپنے غریب ساتھیوں کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک بار مدینہ میں مجھ پر کئی فاقے گذر گئے۔ کسی سے سوال کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ گھر سے باہر نکل کر راستہ پر بیٹھ گیا کہ شاید کوئی راہگیر مجھے دیکھ کر میری حالت خود سمجھ جائے اور کچھ کھلادے۔ اتفاقاً حضرت ابوبکر صدیقؓ گذرے اور سلام و جواب کے بعد آگے بڑھ گئے۔ میں نے جب یہ دیکھا تو اپنے پاس بلایا اور ایک آیت کے معنی پوچھے۔ مطلب یہ تھا کہ وہ گفتگو میں میری حالت کا اندازہ کرلیں ورنہ اس آیت کے معنی میں خود اچھی طرح جانتا تھا۔ انہوں نے اس کا مطلب بیان کیا اور کوئی توجہ کئے بغیر ادھر جاتے تھے چلے گئے۔ پھر حضرت عمرؓ نکلے۔ ان کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی اور وہ بھی کیفیت کو نہ سمجھ سکے۔ تھوڑی دیر کے بعد رحمتِ عالم آتے ہوئے نظر آئے۔ دور ہی سے مجھے دیکھ کر مسکرائے۔ قریب آکر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے گھر تک ساتھ لائے۔ ازواج مطہرات سے دریافت فرمایا کہ کھانے کی کوئی چیز ہے۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ کچھ نہیں ہے۔ صرف ایک پیالہ دودھ ہے جو فلاں شخص کے ہاں سے تحفہ میں آیا ہے۔ حکم دیا کہ بھیجدو، جب وہ پیالہ آگیا تو میری طرف بڑھایا۔ میں نے کہا کہ جب تک حضورؐ نوش نہ فرمالیں میں نہیں پی سکتا۔ آپ نے چند گھونٹ پی لئے پھر مجھے عطا فرمایا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور یہ تھا کہ جو شخص آپ کے ساتھ کوئی سلوک کرتا اس کے ساتھ ہمیشہ اس سے بڑھ کر سلوک کرتے۔ غریب سے غریب آدمی بھی کوئی تحفہ بھیجتا تو اس کو قبول کرلیتے اور پھر اس کے لئے بھی تحفے بھیجتے۔ حبش کے بادشاہ نجاشی کے یہاں سے جب وفد آیا تو بذاتِ خود اس کی خدمت میں مصروف ہوئے۔ صحابہؓ نے کہا کہ یارسولؐ اللہ ہم تو موجود ہیں۔ فرمایا کہ ان لوگوں نے میرے مصیبت زدہ اصحاب کو راحت پہنچائی اور ان کو عزت کے ساتھ رکھا اسلئے میں چاہتا ہوں کہ اس احسان کے بدلہ میں خود ان کی خدمت کروں۔

بچوں کے ساتھ محبت کا یہ عالم تھا کہ جب حضورؐ کسی سفر سے واپس آتے تو بچے دور دور سے دوڑ دوڑ کر استقبال کے لئے آتے۔ آپ چھوٹوں کو اپنی سواری پر آگے پیچھے اور گود میں بٹھا لیتے اور اس طرح ان معصوموں کے جھنڈ کے ساتھ مدینہ میں داخل ہوتے۔

غرض اعلیٰ انسانی صفات بڑوں کی عزت، چھوٹوں پر شفقت، غریبوں کی امداد، مخلوق کے ساتھ محبت اور ان سب سے بڑھ کر اپنے خالق کی حقیقی عظمت اسوۂ محمدیہؐ کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معراج

معراج کے معنی زینہ یا سیڑھی کے ہیں۔ لیکن عام بول چال میں اس لفظ سے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا عروج عالم بالا پر مراد لیا جاتا ہے۔ تاریخی روایتوں سے یہ تعین کرنا کہ معراج کس تاریخ کو ہوئی تھی۔ نہایت مشکل ہے کیونکہ بیانات اس قدر مختلف ہیں کہ ان سے دن تو کجا مہینہ کا سال کا بھی تعین نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن عام طور پر یہ مان لیا گیا ہے کہ یہ ۱۲ نبوی کا واقعہ ہے اور رجب کی ستائیسویں رات کو ظہور میں آیا۔

اس رات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں حرم اور حطیم کے درمیان لیٹے ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت جبرئیلؑ آئے اور انہوں نے آپ کو لیجا کر عالم ملکوت کی سیر کرائی۔ اور آپ بیت المقدس کی مسجدِ اقصیٰ میں بھی تشریف لے گئے، جہاں بنی اسرائیل کے نبیوں اور رسولوں نے مل کر آپ کی امامت میں نماز پڑھی۔

قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ رات کو اپنے بندے (محمدؐ) کو مسجدِ حرم سے مسجدِ اقصیٰ یعنی بیت المقدس کی مسجد میں جو انبیاء بنی اسرائیل کا قبلہ تھی لے گیا۔ اور غرض یہ بیان کی گئی ہے کہ ان کو چند نشانیاں دکھلانا مقصود تھا۔ معراج کی صبح کو جب رسول اللہؐ نے ان مشاہدات کا ذکر کیا جو آپ کو دکھلائے گئے تھے تو قریش کے کافروں نے انکار کیا اور کہا کہ یہ شخص یہ باتیں اپنے دل سے جوڑ کر بیان فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ والنجم میں ان نشانیوں کا ذکر مختصراً کرتے ہوئے جو آپ کو دکھائی گئی تھیں، کافروں کا جواب دیا کہ ہمارا رسولؐ نہ بھٹکا ہے نہ بہکا ہے بلکہ جو کچھ آپ نے دیکھا ہے وہ برحق ہے نہ اس کے دل نے غلطی کھائی ہے نہ اس کی نگاہ اچٹی ہے، وہ بالکل سچ کہتا ہے۔

علماء اسلام نے اس امر میں اختلاف کیا ہے کہ معراج جسمانی تھی یا روحانی تھی۔ امیر معاویہؓ فرمایا کرتے تھے کہ یہ ایک سچا خواب تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا گیا تھا۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ جو اگرچہ زمانہ معراج میں آنحضرتؐ کی زوجیت میں نہ تھیں۔ لیکن عہدِ صحابہ میں آپ کے حالات سے سب سے زیادہ باخبر تھیں، انھوں نے بھی فرمایا کہ معراج روحانی ہوئی۔ مگر جمہور مسلمان جسمانی معراج کے قائل ہیں۔

ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ خواب میں ہوا ہوتا تو پھر مشرکین اس پر اس قدر تعجب اور اس کی تکذیب نہ کرتے۔ کیونکہ خواب میں زمین سے آسمان تک کی سیر کرنا کوئی عجیب و غریب بات نہیں ہے۔ مگر محققین زیادہ تر حضرت عائشہؓ اور امیر معاویہ کے ہم خیال ہیں۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ آنحضرتؐ سے اس قسم کے واقعہ کو قیاس سے بعید سمجھتے ہیں بلکہ جسمانی معراج کے ثبوت میں تاریخی شہادت کی کمی پاتے ہیں۔ اور آپ اگر ہم سے پوچھیں تو ہم تو یقین رکھتے ہیں کہ عالم ملکوت کی سیر اور مادیات سے بالاتر جا کر خدائی نشانیوں کو دیکھنا جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہی ہو سکتا ہے، چونکہ یہ بات مسلّم ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی نیند و بیداری یکساں ہے اور صرف ان کی آنکھیں سوتی ہیں اور دل بیدار رہتا ہے اس لئے روحانی اور جسمانی مشاہدہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اس معراج کا مقصد جیسا کہ میں نے کہا، بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی چند نشانیاں دکھلائیں، یہ انسانی کمالات اور نبوّت کے علم کی آخری حد تھی جس پر آپ پہنچائے گئے اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ جس کا ذکر قرآن میں معراج کے بیان میں ہے اس سے علم نبوت کی انتہائی حد مراد ہے۔

اس کو سمجھنے کے لئے کسی قدر نبوت کی تاریخ بیان کر دینے کی ضرورت ہے۔ صورت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو اپنا سب سے مقبول اور بزرگ ترین نبی بنایا تھا اور ان کو خلیل اللہ کا لقب عطا فرمایا تھا۔ اور ان سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہاری اولاد کو برکت دوں گا اور ان کو امامت اور دنیا والوں کو پیشوائی بخشوں گا اور بڑی سلطنت عطا کروں گا چنانچہ ارض مقدس یعنی شام اور عرب کو ان کی تولیت میں دے کر ان کا منصب بلند کیا۔ حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے ہوئے جو پیغمبر تھے یعنی حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ۔ ارض مقدس ان دونوں بیٹوں کے حصہ میں آئی۔ شام کا ملک اسحاقؑ کو دیا گیا کہ اس کی رہنمائی کریں اور عرب کے ملک میں خانہ کعبہ کو تعمیر کر کے حضرت اسماعیلؑ کو وہاں بسا دیا کہ ان موحدوں کے لئے جو کعبہ میں عبادت اور طواف کے لئے آئیں اس گھر کو پاک صاف رکھیں۔

حضرت اسحاقؑ جو سرزمین فلسطین میں تھے ان کے بیٹے یعقوبؑ ہوئے جو عظیم الشان پیغمبر اور اسرائیل کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کے بارہ بیٹے تھے جن کی نسلوں میں سلسلہ وار پیغمبری چلی آتی تھی حضرت موسیٰؑ حضرت ہارونؑ، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ۔ حضرت زکریاؑ و حضرت عیسیٰؑ اور حضرت یحییٰؑ

سب کے سب نامی اور گرامی پیغمبر بنی اسرائیل یعنی حضرت یعقوبؑ کی اولاد میں سے ہوئے۔

بنی اسرائیل کو جو فلسطین اور شام کے متولی تھے توریت میں بار بار اللہ نے آگاہ کر دیا تھا کہ اگر انہوں نے ہماری اطاعت اور ہمارے پیغمبروں کی تابعداری نہ کی تو یہ منصب ان سے چھین لیا جائے گا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد جب یہودی اور عیسائی یعنی بنی اسرائیل سب کے سب توحید سے منحرف اور شرک میں مبتلا ہو گئے اور انبیاء کی لائی ہوئی کتابوں اور ان کی تعلیموں سے منہ موڑ لیا اور یہودیوں نے حضرت عزیرؑ کو اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو خدا بنا لیا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور بنی اسماعیل میں اپنے سب سے بڑے پیغمبر اور آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا جن کو اسماعیلی اور اسرائیلی دونوں گھرانوں کا وارث اور ابراہیمیؑ نبوت کا حامل قرار دے کر ساری دنیا کی ہدایت قیامت تک کے لئے ان کے سپرد فرمادی یہ معراج جو آپ کو عطا ہوئی اس کا مقصد یہی تھا کہ جملہ علوم نبوت اور ہدایت و رہبری کے سارے کمالات اس میں آپ کو عطا کئے گئے اور اسرائیلی اور اسماعیلی دونوں گھرانوں کی وراثت اور ابراہیمیؑ نبوت کا حامل قرار دے کر ساری دنیا کی ہدایت قیامت تک کے لئے ان کے سپرد فرمادی یہ معراج جو آپ کو عطا ہوئی اس کا مقصد یہی تھا کہ جملہ علوم نبوت اور ہدایت و رہبری کے سارے کمالات اس میں آپ عطا کئے گئے اور اسرائیلی اور اسماعیلی دونوں گھرانوں کی پیغمبری آپکو دی گئی۔ یوں سمجھیے کہ انسانیت کا انتہائی کمال نبوت ہے اور نبوت کا انتہائی کمال رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات میں جمع کر دیا گیا۔

قبلۂ بنی اسرائیل جو ارض فلسطین یعنی بیت المقدس میں ہے اور قبلۂ بنی اسماعیل جو مکہ میں ہے۔ دونوں کے متولی آپ قرار پائے اور علم الاولین والآخرین آپ کو بخش دیا گیا۔ قرآن کریم میں سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ط

وہ اللہ پاک ہے جو رات کو اپنے بندہ (محمدؐ) کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ میں لے گیا جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں دے رکھی ہیں تاکہ ہم ان کو اپنی چند نشانیاں دکھلائیں۔

اس مسجد اقصیٰ میں پہنچکر جملہ انبیاء کی نماز میں امامت آپؐ نے فرمائی جو آپؐ کی نبوت ابراہیمی کی وراثت اور دونوں قبلوں کی تولیت کی دلیل ہے۔

تاریخوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہاں جبرئیل ؑ نے آپ کے سامنے دو پیالے پیش کئے جن میں سے ایک میں دودھ تھا اور ایک میں شراب۔ آپ نے دودھ والا پیالہ پکڑ لیا اور شراب کو ہاتھ نہیں لگایا جس پر کہا گیا کہ تم نے فطرت کو پسند کیا۔ جس سے اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ دین اسلام جو آپ کو دنیا کی ہدایت کے لئے عطا ہوا تھا وہ دین فطرت ہے اور اس میں ہر قسم کے نشے حرام ہیں۔ حدیثوں میں یہ بھی ہے کہ انبیاء کبار سے عالم بالا میں ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کے ساتھ باتیں ہوئیں اور انوار الٰہی اور عالم ملکوت کے مشاہدات دیکھے اور بارگاہ الٰہی سے رحم، معافی اور مغفرت کا عطیہ اپنی اُمت کے گنہگاروں کے لئے لائے بشرطیکہ وہ شرک سے بچے رہیں۔

روایت میں ہے کہ اسی معراج میں پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوئیں لیکن ثواب ان کا پچاس وقتوں کا ہی رکھا گیا۔ اور قرآن نے تو یہ اصول ہی مقرر کر دیا ہے کہ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا "جو شخص کوئی نیکی کرے گا تو اس کو اس کا دس گنا ثواب ملے گا" اس لئے نہ صرف پنجگانہ فرض نمازوں کا بلکہ ہر سنّت اور نفل کا ثواب بھی دس گنا ہی ہوتا ہے۔ (۶/۱۶۰)

الغرض یہ معراج کیا تھی، نبی عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم انبیاء کی وراثت تھی۔ ساری دنیا کی پیغمبری کے لئے ان کا شرح صدر تھا۔ عالم انسانیت کے لئے ایک ہادی، ایک امت، اور ایک دین ہونے کی بشارت تھی۔

ہزاروں درود اس ذاتِ والا صفات پر جس کو نبوت کبریٰ کا یہ شرف عطا کیا گیا
اور ہزاروں تعریف اس پروردگار کی جس نے نوعِ انسانی پر اپنی رحمت کیلئے یہ شرف عطا فرمایا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معاہدۂ نبویؐ

کوہِ طور کے راہبوں کے ساتھ

۲۶، اکتوبر ۱۹۲۵ء کے اخبار روزانہ ہمدرد دہلی میں ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری نے اپنے مکتوب میں ایک معاہدہ کا ترجمہ شائع کرایا ہے جس کی نسبت لکھا گیا ہے کہ اس کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ۳، محرم ۲ھ میں لکھوایا تھا۔

اس کے متعلق کئی صاحبوں نے مجھ سے استفسار کیا اور بعض احباب نے یہ خواہش بھی کی کہ اس کے اُوپر میں تفصیل کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کروں جن میں خود ڈاکٹر انصاری صاحب بھی تھے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ رسالہ جامعہ میں اس پر تاریخی حیثیت سے نظر ڈالوں۔

اخبار ہمدرد میں یہ عہد نامہ جس عبارت میں چھپا ہے حسب ذیل ہے۔

" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پروانہ جو انہوں نے کوہِ طور کے راہبوں اور عام عیسائیوں کو مرحمت فرمایا:-

خدا بڑا ہے اور احکم الحاکمین ہے۔ اسی کے پاس سے تمام پیغمبر پیام لاتے ہیں۔ کیونکہ انسان کو جو نعمتیں عطا ہوئی ہیں ان میں اس کی حکومت کے متعلق کسی قسم کی ناانصافی نہیں کی گئی ہے میں محمد بن عبداللہ نے (صلی اللہ علیہ وسلم) جو خدا کا رسول ہوں اور تمام دنیا کے لئے ہادی ہوں۔ یہ پروانہ ان سب لوگوں کے لئے لکھ دیا ہے جو میری قوم اور میرے مذہب کے ہیں تاکہ یہ عیسائیوں کے لئے اور نصرانیوں کے تمام رشتہ داروں کے لئے ایک حفاظتی پروانہ کا کام دے۔ خواہ وہ شریف ہوں یا رذیل، معزز ہوں یا ذلیل۔

دفعہ ۱ - میری اُمت کا جو کوئی اس وعدہ اور قسم کو توڑے گا جو اس اقرارنامہ میں ہے وہ خدا کے وعدہ کو توڑے گا اور قسم کے خلاف کرے گا اور دین کا مخالف ہوگا جس سے خدا پناہ میں رکھے کیونکہ وہ خواہ بادشاہ ہو یا غریب آدمی یا کوئی اور شخص بہر صورت لعنت کا

مستحق ہوگا۔

دفعہ ۲ ۔ جب کوئی راہب اپنے سفر کے دوران میں کسی پہاڑ، پہاڑی، گاؤں یا کسی قابلِ اسقامت جگہ پر سمندر میں یا جنگل میں یا کسی گرجا، خانقاہ یا عبادت کدہ میں ٹھہرے گا تو میں روحانی طریقہ پر اس کے ساتھ ہوں گا تاکہ اس کے جان و مال کی حفاظت کروں اور اس مدد اور حفاظت میں میری امت میرے ساتھ ہوگی کیونکہ وہ بھی میری اُمت کا ایک جزو ہیں اور میرے لئے باعثِ عزت۔

دفعہ ۳ ۔ علاوہ ازیں تمام افسروں کو حکم دیتا ہوں کہ ان سے کسی قسم کا خراج یا محصول نہ لیں کیونکہ ان کو اس قسم کی کسی بات پر مجبور نہ کیا جائے گا۔

دفعہ ۴ ۔ کوئی ان کے منصفوں یا حاکموں کے بدلنے کا خیال نہ کرے گا بلکہ وہ اپنے عہدوں پر بغیر معزولی کے قائم رہیں گے۔

دفعہ ۵ ۔ جب وہ راستوں پر سفر کرتے ہوں گے تو کوئی ان کو دق نہ کرے گا۔

دفعہ ۶ ۔ جس قدر گرجے ان کے قبضے میں ہیں ان سے کوئی انہیں محروم نہ کرے گا۔

دفعہ ۷ ۔ جو کوئی میرے ان احکام کو منسوخ کرے گا اسے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ خدا کے احکام کی نافرمانی کرے گا۔

دفعہ ۸ ۔ علاوہ ازیں نہ ان کے منصف، نہ حاکم، نہ راہب، نہ خادم، نہ مریدین نہ کوئی اور لوگ جو ان کے دستِ نگر ہوں کسی قسم کا خراج دیں۔ نہ اس سبب سے انہیں ستایا جائیگا کیونکہ میں ان کا محافظ ہوں خواہ وہ کہیں بھی ہوں، خشکی پر یا سمندر میں، مشرق میں یا مغرب میں۔ شمال میں یا جنوب میں، کیونکہ وہ خود اور جو کچھ بھی ان سے متعلق ہے وہ میرے اس وعدے اور قسم میں شامل ہے۔

دفعہ ۹ ۔ اور ان لوگوں میں سے جو خاموشی اور خلوت میں پہاڑوں میں رہتے ہیں وہ نہ تو معمولی خراج ادا کریں نہ اپنی آمدنی کا دسواں حصہ، نہ کوئی مسلمان ان کے مقبوضات میں حصہ لگائے گا کیونکہ وہ صرف اپنی زندگی قائم رکھنے کے لئے محنت کیا کرتے ہیں۔

دفعہ ۱۰ ۔ جب کبھی زمین کی پیداوار بکثرت ہوگی اور وقت پر ہوگی تو باشندگانِ شہر کے لئے لازمی ہے کہ ہر ناپ میں سے تھوڑا سا ان کو دیں۔

دفعہ ۱۱ ۔ جنگ کے زمانہ میں بھی ان کے گھروں سے نہ نکالا جائے گا، نہ انہیں لڑائی پر جانے کے لئے مجبور کیا جائے گا اور نہ ان سے کوئی خراج لیا جائے گا۔

مندرجہ بالا گیارہ دفعات میں تمام مواعید راہبوں کے متعلق ہیں۔ بقیہ سات دفعات میں وہ باتیں ہیں جو عام عیسائیوں کے متعلق ہیں۔

دفعہ ۱۲ ۔ وہ عیسائی جو شہر کے باشندے ہیں اور اپنی دولت و تجارت کی بدولت محاصل ادا کرنے کے قابل ہیں وہ بارہ درہم سے زیادہ ادا نہ کریں گے۔

دفعہ ۱۳ ۔ اس کے علاوہ عیسائیوں سے اور کچھ نہ مانگا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ صاف طور پر فرماتا ہے کہ "ان لوگوں کو مت ستاؤ جو ان کتابوں کی عزت کرتے ہیں جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں بلکہ بہتر یہ ہے کہ ازراہِ تلطف اچھی چیزیں ان کو دے دو اور ان سے گفتگو کرو اور ہر ایک کو انہیں ستانے سے روکو۔

دفعہ ۱۴ ۔ اگر کوئی عیسائی عورت کسی مسلمان سے شادی کرلے تو وہ مسلمان اپنی بیوی کے گرجا جانے سے معترض نہ ہوگا۔ اور اپنی مذہبی عبادت اور رسوم کے ادا کرنے سے نہ روکے گا

دفعہ ۱۵ ۔ کوئی شخص انہیں گرجاؤں کی مرمت سے نہ روکے گا۔

دفعہ ۱۶ ۔ جو کوئی میرے اس پروانہ کے خلاف کرے گا یا کسی اور بات کو ترجیح دے گا وہ خدا اور اس کے رسول ؐ کے نزدیک کافر ہوگا کیونکہ یہ تمام حقوقِ حفاظت ان کو میں نے دیئے ہیں۔

دفعہ ۱۷ ۔ کوئی ان کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائے گا بلکہ اس کے برخلاف ان کی حفاظت کے لئے مسلمان لڑیں گے۔

دفعہ ۱۸ ۔ اور اس کے ذریعہ سے میں حکم دیتا ہوں کہ میری اُمت میں کوئی اس وعدہ کی خلاف ورزی قیامِ دنیا تک نہ کرے گا۔

گواہان ۔ علی ابن ابی طالب ؓ ۔ عمر بن خطاب ؓ ۔ زفیر ابن ابوعمان ۔ لیث بن معاذ ۔ ثابت بن ۔۔۔۔۔ بن حسن ۔۔۔۔ اُذرین ۔۔۔۔ ابوبکر بن ابی قحافہ ؓ ۔ عثمان بن عفان ؓ ۔۔۔۔۔ بن مسعود ۔۔۔۔ طلحہ ۔۔۔۔ سعد بن عباس ؓ ۔ عبداللہ بن عمر ؓ ۔

(بعض نام انگریزی میں بالکل بدل گئے تھے وہ سمجھ میں نہ آسکے اس لئے چھوڑ دیئے گئے۔"

بیان کیا گیا ہے کہ اس پروانہ کے کاتب حضرت علیؓ تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں اس پر اپنے ہاتھ سے نشان بنایا تھا اور اس کی تاریخ ۳ محرم ۲ھ ہے۔ یہ پروانہ بیتھ کے لشپ رچرڈ پوکاک کی کتاب "مشرق اور دیگر ممالک کا بیان" کی پہلی جلد سے نقل کیا گیا ہے جو ۱۷۴۳ء میں طبع ہوئی تھی غالباً اصل کتاب روسی زبان میں لکھی گئی تھی اور وہیں طبع ہوئی ہے۔ ہندوستان میں اس کی کسی کاپی کا پتہ نہ چل سکا کہ اصلی عبارت ملائی جاتی۔ مگر پھر بھی ترجمہ میں اصل مقصد کی کہاں تک تحریف ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس پروانہ کو اپنی جگہ مسلم سمجھ کر اس کے مضمون پر تحقیقی نظر ڈالنا کچھ بے جا نہ ہوگا۔ مگر اس سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہئے کہ آیا صدر اسلام کی صحیح تاریخ کی رُو سے جو ہم تک پہنچی ہے اس قسم کے کسی پروانہ کا محرم ۲ھ میں امکان بھی ہے یا نہیں۔

نمبر۱ ، ہجرت کے بعد مسلمان مدینہ میں اپنے قدم جما رہے تھے اور قریش مکہ کے دسائس اور منافقین مدینہ کے فتنوں سے ہر طرف سے نرغہ میں تھے۔ محرم ۲ھ تک کوئی جنگ بھی کفار کے ساتھ نہیں ہوئی تھی۔ جس سے مسلمانوں کی کوئی ہیبت قائم ہو جاتی۔ کیونکہ سب سے پہلی جنگ مدینہ میں اگرچہ ہوئی وہ غزوہ ودان ہے جو صفر ۲ھ میں پیش آئی۔ اس لئے محرم ۲ھ تک مسلمان کوئی ملکی عزت یا سیاسی عظمت نہیں حاصل کر سکے تھے۔ وانہوں نے جہاد و قتال میں قدم رکھا تھا۔ نہ حربی، مستامن اور ذمی کے مسائل پیدا ہوئے تھے۔ نہ جزیہ، خراج یا عشر کا کوئی ذکر تھا۔ بلکہ زکوٰۃ بمعنی حق بیت المال بھی نہیں تھی اور اس کے معنی صرف خیرات کے سمجھے جاتے تھے۔ ایسی حالت میں کوئی شخص جس کے سر پر دماغ اور دماغ میں عقل ہے۔ یہ وہم بھی نہیں کر سکتا کہ کوہ طور کے راہب آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جزیہ عشر اور خراج کی معافی کا پروانہ لکھائیں اور سرورِ عالم ان خسروانہ مراعات کے ساتھ ان کو عہد نامہ لکھ کر عطا فرما دیں۔

نمبر۲ :۔ شام کے عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلہ کی تاریخ ۶ھ سے پہلے نہیں شروع ہوتی سب سے پہلا غزوہ دومۃ الجندل کا ہے۔ جس میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سات سو مسلمانوں کے ساتھ تبلیغ کے لئے بھیجا تھا۔ یہ مقام مدینہ سے تیرہ مرحلہ اور دمشق سے سات منزل پر ہے۔ اس میں کسی قسم کا عہد نامہ نہیں ہوا۔ صرف ان کا سردار اصبغ بن عمر کلبی اسلام لایا۔ دوسرا سریہ ذات السلاسل کا ہے جو حضرت عمرو بن عاص کی قیادت میں بنی قضاعہ پر مشارف شام میں بھیجا گیا تھا۔ اس کے ساتھ بھی

کسی قسم کا معاہدہ نہیں ہوا۔ تیسرا سریہ ذات اطلاح ہے جو کعب بن عمیر غفاری کی سرکردگی میں گیا تھا۔ اس میں کل پندرہ آدمی تھے جو سب کے سب شہید ہو گئے۔ صرف ایک شخص جو زخمی ہو گیا تھا بچ کر کسی صورت میں مدینہ واپس آسکا۔ چوتھا سریہ موتہ ہے جو شام کے غسانیوں کے مقابلے کے لئے بھیجا گیا تھا اس میں حضرت زید بن حارثہ۔ عبداللہ بن رواحہ اور جعفر طیار رضی اللہ عنہم شہید ہوئے۔ خالد بن ولیدؓ اس جماعت کو ورطۂ ہلاکت سے نکال لائے۔ کیونکہ مسلمان صرف تین ہزار تھے۔ اور کفار کی تعداد ایک لاکھ تک ہو گئی تھی۔ اس میں بھی کسی قسم کا عہد نامہ نہیں لکھا گیا۔ پانچواں غزوہ تبوک ہے۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف لے گئے تھے اور تیس ہزار صحابہ ہمراہ تھے۔ اس میں یحنہ بن روبہ والی ایلہ کے ساتھ عہد نامہ ہوا جس کی عبارت یہ ہے۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم یہ اللہ اور اسکے رسول محمد رسول اللہؐ کی طرف سے یحنہ بن روبہ اہل ایلہ ان کے اسقف اور ان کے تمام لوگوں کو جو خشکی یا تری میں ہیں امان ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی اور وہ تمام لوگ جو نبی کے ہمراہ ہیں خواہ شامی ہوں یا یمنی اس امان کے ذمہ دار ہیں ان میں سے جو شخص کوئی خلاف ورزی کرے گا اس سے فدیہ نہیں قبول کیا جائے گا۔ بلکہ اس کی سزا قتل ہے۔ اور اس کا مال حلال ہے۔ وہ مسلمانوں کے کسی کام میں حائل نہ ہوں گے اور خشکی یا تری کسی راستہ میں ان کو نہ روکیں گے۔

راقم جہیم بن الصلت وشرحبیل بن حسنہ بحکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"

دوسرا معاہدہ اسی غزوہ میں اہل اذرح کے ساتھ ہوا جس کا مضمون یہ تھا۔

"اہل اذرح کو اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امان ہے۔ ان کے اوپر سالانہ ایک سو دینار مقرر ہوا ہے جس کو یہ ہر رجب کے مہینہ میں ادا کیا کریں گے۔ اور اللہ اس بات پر کفیل ہے کہ یہ مسلمانوں کی خیر خواہی اور ان کے ساتھ احسان کریں گے اور اس مسلمان کے ساتھ بھی جو کسی خوف سے ان کے یہاں پناہ گیر ہو"

نیز اسی غزوہ میں اسی قسم کا معاہدہ دومۃ الجندل کے رئیس اکیدر کے ساتھ ہوا۔ اس کا مضمون بھی تقریباً یہی تھا۔ شامی عیسائیوں کے ساتھ آنحضرتؐ کی آخری زندگی تک سارے تعلقات اسی قدر پیش آئے۔ کوہ طور والے نہ کبھی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے نہ ان سے کسی قسم کا معاہدہ ہوا۔

اب اس پروانہ کے مضامین پر غور کرنا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جس قدر عہد نامے ہیں ان میں جہاں فریقِ ثانی کو حقوق دیئے گئے ہیں۔ وہاں اسلامی حقوق بھی ان کے ذمہ عائد کئے گئے ہیں۔ حضورؐ کے ہر معاہدہ سے اسلام کی سربلندی نمایاں ہوتی ہے۔ لیکن اس پروانے میں ابتدائی بارہ دفعات تک سلسلہ وار راہبوں اور اسقفوں کے حقوق مسلمانوں پر بیان کئے گئے ہیں اور مسلمانوں کا ان پر کسی قسم کا حق نہیں عائد کیا گیا ہے جو سراسر اس کے جعلی ہونے کی دلیل ہے۔

نمبر۱ :۔ اس کی عبارت اور طرزِ بیان سے وہ لوگ جو اسلامی تاریخ کے طرزِ بیان اور عبارت سے واقفیت رکھتے ہیں نمایاں طور پر اس کا موضوع ہونا سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ

"میں روحانی طور پر ان کے ساتھ رہوں گا" یا "یہ بھی میری اُمت کا ایک جزو ہیں اور میرے لیئے باعثِ عزت"

یہ جملے نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اندازِ بیان کے مخالف ہیں بلکہ صریح آیاتِ قرآنی کے معارض ہیں جن میں سے ایک خاص آیت یہ ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ (۲۹)

نمبر۲ :۔ دفعہ ۲ میں جو خدائی فرمان نقل کیا گیا ہے وہ نہ کوئی قرآن کی آیت ہے نہ کوئی حدیث قدسی۔ جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس پروانہ کے کاتب نے اپنی دروغ بافی کے مجموعہ لغویات میں جلد از جلد اپنے ہی حقوق۔ خراج کی معافی، عشر کی معافی، زکوٰۃ میں سے کچھ حقوق، پیداوار میں سے کچھ حصہ لینے کے لئے تسلیم کرانے کی کوشش کی۔ اور اس افتراء میں خدا کی طرف وہ قول منسوب کیا جو اس کا نہیں ہے اس لئے بداہتاً یہ جعلی ہے۔

نمبر۳ :۔ اس پروانہ میں کم سے کم تین جگہ راہبوں سے خراج نہ لینے کا ذکر ہے۔ دفعہ ۳۔ دفعہ ۹۔ دفعہ ۱۱ اس لایعنی تکرار کی کیا ضرورت تھی۔ علاوہ بریں اگر راہبوں کے پاس خراج والی زمین نہیں ہے تو اُن سے خراج کیوں لیا جائے گا۔ اور اگر وہ خراجی زمین رکھتے ہیں تو اسقاطِ خراج کے کیا معنی۔ پھر دفعہ ۹ میں اسقاطِ عشر کا ذکر ہے حالانکہ عیسائیوں پر اسلام نے عشر قائم ہی نہیں کیا ہے۔

اصلیت یہ ہے کہ اہلِ کتاب اس قسم کے جعلی عہد نامے بناتے تھے تاکہ مسلمانوں سے مراعات حاصل کریں۔ کیونکہ امام ابن فرحون کی کتاب الدیباج المذہّب کے حاشیہ میں ایک واقعہ اسی قسم کا لکھا ہوا ہے۔ کہ یہودیوں نے ایک بار رئیس الرؤسا کے سامنے لاکر ایک عہدنامہ پیش کیا جس میں تحریر تھا کہ خیبر کے یہودیوں سے جزیہ نہ لیا جایا کرے۔ اسی بنا پر ان کی درخواست تھی کہ ہمارے اوپر سے جزیہ ساقط کر دیا جائے۔

لوگ اس معاہدہ سے حیرت زدہ ہوگئے اور مسلمان امرار کو تردّد لاحق ہوا۔ اس زمانہ میں امام ابوبکر خطیب بغدادیؒ تھے۔ لوگوں نے اُن کے سامنے یہ معاہدہ پیش کیا۔ انہوں نے جب نظرِ تامل سے دیکھا تو فرمایا کہ یہ عہدنامہ جعلی ہے۔ اس لئے کہ اس کی تاریخ ۵ھ کی ہے اور اس پر گواہاں میں امیر معاویہؓ کا نام مندرج ہے جو ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد اسلام لائے تھے اور واقعہ خیبر میں شریک نہیں تھے۔ علاوہ ازیں اس پر سعد بن معاذ رئیس انصار کے دستخط ہیں جو فتح خیبر سے پہلے واقعہ بنی قریظہ میں وفات پا چکے تھے۔ اس وقت لوگوں کے سر سے یہ مصیبت کا پہاڑ ٹل گیا اور یہود شرمسار ہو کر رہ گئے۔

شام کے عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں نے جس قدر معاہدے کئے ہیں ان میں ان کا فریضہ مندرج ہے کہ عیسائی ان کی مہمانداری کریں گے اور اپنے مکانوں اور خانقاہوں میں ہر مسلمان مسافر، سیاح اور سپاہی کو ٹھیرنے دیں گے اور ان کی ضیافت کریں گے۔ غالباً انہیں حقوق کو مٹانے کے لئے یہ جعلی پروانہ بنایا گیا ہوگا۔

جو قوم اپنی آسمانی کتاب میں تحریف کر سکتی ہے اس کے لئے اس قسم کے پروانے بنا لینے کچھ مشکل نہیں ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ختم نبوت

(از رسالہ طلوع اسلام اکتوبر ۱۹۳۵ء)

قرآن کریم نے کھلے کھلے الفاظ میں تصریح کے ساتھ فرما دیا۔

مَاكَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۝ (۳۳/۴۰)

محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کی (خاتمہ کی) مہر۔

ختم کے معنی مہر لگانے کے ہیں اور خاتم مہر کو کہتے ہیں جو کسی شے یا تحریر کے خاتمے یا انقطاع پر لگائی جاتی ہے۔ اسی سے ختم کے معنی انقطاع کے لئے گئے ہیں اور عام طور پر لفظ ختم انقطاع ہی کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ آیت میں خاتم کے لفظ کو بعض لغویوں نے باب مفاعلہ سے فعل ماضی قرار دیا ہے۔ اس صورت میں بھی وہی معنی ہوں گے لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ اسم ہے اور اس کے معنی مُہر کے ہیں۔ محمد عربیؐ کے اوپر اللہ نے اس سلسلۂ نبوت کو ختم کر دیا جس کا وعدہ ازل میں بنی آدم سے کیا تھا۔

يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِىْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (۷/۳۵)

اے بنی آدم! اگر تمہارے پاس تمہیں میں سے رسول آئیں جو تم کو میری آیتیں سنائیں تو جو کوئی تقویٰ اختیار کرے گا اور (ان آیات کے مطابق) اپنے عمل کو ٹھیک کرے گا ان کے اوپر نہ کوئی خوف ہوگا۔ نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اس آیت کے مطابق اللہ کی طرف سے رسول ہدایتیں لیکر سلسلہ وار آتے رہے۔

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِى الْاَوَّلِيْنَ ۝ (۴۳/۶)

اور پہلے لوگوں میں ہم نے بہت سے رسول بھیجے۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ... ط (۲۳/۴۴)

پھر ہم نے لگاتار اپنے رسول بھیجے۔

سب کے آخر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے جو اس سلسلۂ نبوت کی مہر اور اس کی عمارت کی آخری اینٹ ہیں۔ ان کے بعد کوئی نبی نہیں۔ قرآن کریم نے یہ بھی تصریح کر دی کہ وہ دینِ الٰہی جو نبی آدم کے لئے ازل سے مقرر تھا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کی تکمیل کر دی گئی۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط (۵/۳)

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے واسطے مکمل کر دیا اور تمہارے اوپر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے دینِ اسلام کو پسند کیا۔

دینِ الٰہی جو ہر نبیؑ پر اترا ایک ہی تھا لیکن ہر نبیؑ کے بعد اس کی قوم اس کے لائے ہوئے پیغامات کو تحریف و تخریب سے ضائع کرتی رہی چنانچہ آج کوئی صحیح صحیفہ کسی سابقہ نبیؑ کی تعلیم کا روئے زمین پر موجود نہیں تاآنکہ قرآن کریم نازل ہوا جس نے جملہ سابقہ آسمانی کتب کی تصدیق بھی کی اور ان کی کل اصلی اور حقیقی تعلیمات کو اپنے اندر شامل کر کے ان کا مہیمن یعنی محافظ بن گیا۔

وَ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (۵/۴۸)

"اور ہم نے تیرے اوپر حق کے ساتھ کتاب اتاری جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق بھی کرنے والی ہے اور ان کی نگہبان بھی ہے۔"

پھر قرآن کو اللہ نے اپنی حفاظت میں لے کر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹)

"ہم نے ہی الذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔"

یہ الذکر قرآن ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ

وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ط تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴿۴۱ : ۴۲﴾

"جن لوگوں نے الذکر کا انکار کیا جبکہ وہ ان کے پاس آیا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ (الذکر) عزت والی کتاب ہے۔ باطل نہ اس کے آگے سے اس کے پاس پھٹکتا ہے، نہ اس کے پیچھے سے سزاوار حمد حکیم کی اتاری ہوئی۔

اس کے کسی لفظ کو ممکن نہیں ہے کہ بدل سکے۔

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ج لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهٖ ج ﴿۱۸ : ۲۷﴾

تیرے رب کی کتاب جو تیرے اوپر اتاری گئی ہے اس کی تلاوت کر، کوئی اس کے الفاظ کو بدلنے والا نہیں۔

اب ان تمام قرآنی تعلیمات کو اس ترتیب کے ساتھ ملاحظہ کیجئے۔

(۱) ازل میں اللہ نے بنی آدم سے وعدہ کیا تھا کہ ہم تمہاری ہدایت کے لئے رسولؐ اور کتاب بھیجتے رہیں گے۔

(۲) اس وعدہ کے مطابق رسول من جانب اللہ ہدایت لے کر بنی آدم کے لئے مسلسل آتے رہے۔

(۳) ان ہدایات و آیات کو جو نبیوںؑ اور رسولوںؐ کے ذریعہ سے موصول ہوتی رہیں ان کے بعد ان کی قومیں ضائع کرتی رہیں۔

(۴) محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ ہدایت قرآن اُتار کر مکمل کر دی گئی اور وعدہ کیا گیا کہ یہ کتاب اللہ کی حفاظت میں ہے اس کے کسی لفظ کو کوئی نہیں بدل سکتا۔

(۵) محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں جن کے اُوپر نبوت کا خاتمہ یعنی انقطاع ہو گیا۔

تعلیم الٰہی مکمل ہو چکی اور ابد تک کے لئے محفوظ کر دی گئی۔ آئندہ کے لئے سلسلہ منقطع کر دیا گیا کہ اب اس کی ضرورت نہ تھی۔

یہاں یہ بات بھی واضح کر دینی ضروری ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل یعنی بصیرت عطا فرمائی ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنی اصلاح و فلاح کو سمجھ سکتا ہے لیکن یہ بصیرت بلا وحی کے نور کے اسی طرح بیکار ہے جس طرح بصارت بلا خارجی روشنی کے۔ اس لئے اللہ نے وحی کے ذریعہ سے ان تعلیمات کو بھیجنے کی کفالت اپنے ذمہ لی۔ جو انسانی بصیرت کو اس کی صحیح فطرت "عبدیت" کی طرف

رہنمائی کریں۔ یعنی جن امور میں بصیرتِ انسانی وحی کی محتاج ہے۔ رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ سے ہی وحی موصول ہوتیں رہیں۔ یہاں تک کہ آخر میں خاتم النبیین پر قرآن اتار کر بنی آدم کو جس قدر وحی والی تعلیمات کی ضرورت تھی۔ اس کی تکمیل کر دی گئی۔ اب وہ مطلقاً اپنی بصیرت کی روشنی کے لئے کسی مزید وحی کے محتاج نہیں رہے بلکہ اسی قرآنی وحی کی روشنی میں اپنی انسانی عقل سے پورا پورا کام حسب منشار الٰہی لے سکتے ہیں۔

لہٰذا قرآن پر ایمان رکھنے والے کیلئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نبوت کا انکار محال ہے۔ اور یہ ایسا طے شدہ مسئلہ ہے کہ خود عہد رسالت میں مسیلمہ کذاب نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو اس کے کاذب ہونے میں ذرا تامل نہیں کیا گیا۔ یہاں تک کہ شاگردانِ نبوت یعنی صحابہ اکرام رضؓ نے جہاد کر کے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو کیفر کردار کو پہنچا دیا۔ اس کے بعد بھی جب جب اور جہاں جہاں اس قسم کے دعویدار کھڑے ہوئے نہ صرف یہ کہ متفقہ طور پر امت کے نزدیک کذاب قرار پائے بلکہ اچھی طرح ان کا قلع وقمع کیا گیا۔

تیرہ صدیوں کے اس منصوص، متفق علیہ اور اجماعی عقیدہ کے خلاف پنجاب میں مرزا غلام احمد قادیانی باوجود قرآن پر ایمان رکھنے کے ادعا کے اپنی نبوت کا دعویٰ لے کر کھڑے ہوئے۔ مجھے ان کے اس دعوے پر دلیل لانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ قادیانی جماعت جس کا عقیدہ اور عمل مرزا صاحب کے نوشتوں پر ہے خود اس کا ثبوت ہے، وہ ان کو انبیاء سابقین علیہم السلام کی طرح نبی مانتی ہے اور ان کی نبوت کے منکر کو کافر سمجھتی ہے۔

مرزا صاحب موصوف چونکہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اس لئے مسلمانوں کو قائل کرنے کیلئے اس مسئلہ کے متعلق انہوں نے کئی دلیلیں اپنے دل سے جوڑ رکھی تھیں جو دلیلیں نہیں ہیں بلکہ تدلیسات اور آیاتِ قرآنی کی سراسر تحریفات ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اللہ جل شانہٗ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم بنایا۔ یعنی آپ کو افاضۂ کمال کے لئے مہر دی جو کسی اور نبی کو ہرگز نہیں دی گئی۔ اسی وجہ سے آپ کا نام خاتم النبیین ٹھہرا یعنی آپ کی پیروی کمالاتِ نبوی بخشتی ہے اور آپ کی توجہ نبی تراش ہے۔

(حاشیہ حقیقۃ الوحی ص۹۷)

غور کرنے کی جگہ ہے۔ قرآن کریم تو یہ کہتا ہے کہ اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء کی مہر

بنایا یعنی جس طرح مہر ہر تحریر کے آخر یا انقطاع پر لگتی ہے اسی طرح آپؐ کے اوپر نبوت کو ختم کر دیا اور آپؐ کے بعد کوئی نبیؑ نہیں آئے گا۔ مگر مرزا صاحب کہتے ہیں کہ اللہ نے افاضۂ کمال کے لئے آپؐ کو مہر دی۔ قرآن میں کہاں مہر دینے کا ذکر ہے اور پھر یہ کہ وہ افاضۂ کمال کے لئے دی گئی یہ خالص تحریف ہے اور یہ لکھنا کہ حضورؐ کی توجہ نبی تراشں ہے شرک جلی ہے۔ کیونکہ آپؐ کا فریضہ جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے۔ صرف کلام الٰہی کی تبلیغ تھی۔ ایمان یا ہدایت کا افاضہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے نہ کہ رسولؐ کی طرف سے قرآن مجید نے صاف طور سے اس کی تصریح کر دی ہے۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ... (۲۸/۵۶)

"تو جس کو دوست رکھے اس کو ہدایت نہیں دے سکتا مگر اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔"

ان کی دوسری دلیل اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔

"افسوس حال کے نادان مسلمانوں نے اپنے نبی مکرم کا کچھ قدر نہ کیا اور ہر ایک بات میں ٹھوکر کھائی۔ وہ ختم نبوت کے ایسے معنی کرتے ہیں جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو نکلتی ہے نہ تعریف۔ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نفسِ پاک میں افاضہ اور تکمیل نفوس کے لئے قوت نہ تھی اور وہ خشک شریعت سکھانے آئے تھے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس اُمت کو یہ دعا سکھاتا ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۔ پس اگر یہ اُمت پہلے نبیوںؑ کی وارث نہیں اور اس انعام سے ان کو کچھ حصہ نہیں تو یہ دعا کیوں سکھائی۔ (حاشیہ حقیقۃ الوحی ص۱۰۱)

میں پہلے اس آیت کا صحیح مفہوم بیان کر دوں۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (۱/۵)

ہم کو سیدھا راستہ دکھا ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام فرمایا ہے۔

اللہ نے جن پر انعام فرمایا ہے ان کی تفصیل اس آیت میں ہے۔

وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ (۴/۶۹)

اور جو کوئی اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا تو یہی لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے۔ یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔

جن کے اوپر اللہ کا انعام ہے وہ چار قسم کے لوگ ہیں۔ ان چاروں کے راستہ کی جو رُشد و ہدایت کا ہے۔ دعا مانگنے کی سورۃ فاتحہ میں جو ہر نماز اور ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے نہ کہ طلب نبوت کی۔ اور یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ یہ اُمت پہلے نبیوں کی نبوت کی وارث ہے؟ وارث تو صرف کتاب کی ہے جس کی تصریح قرآن میں صاف صاف کر دی گئی ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ... ۵ (۳۵/۳۲)

پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا اپنے بندوں میں سے۔ ان لوگوں کو جن کو برگزیدہ کیا۔

نبوت یا اس کے کسی حصہ کی وراثت کا خیال از روئے قرآن قطعاً باطل ہے۔ صرف زمانۂ حال کے ناداں مسلمان ہی نہیں بلکہ زمانۂ گذشتہ کے تمام علماء و اولیاء بلکہ صحابہ کرام رضی بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے ورنہ مسیلمہ کذاب کو قتل نہ کرتے۔ حال کے نادان مسلمانوں کے ساتھ اس عقیدہ کو مخصوص کرنا محض تدلیس ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس پاک میں افاضہ اور تکمیلِ نفوس کی قوت سے یہ استدلال کرنا کہ آپ کے فیضان سے لوگ نبی بن سکتے ہیں۔ بحالیکہ خود آپ کی زندگی میں آپ کی اس قوت سے کسی کو نبوت کا شرف حاصل نہ ہو سکا کس قدر غلط ہے۔

ایک تیسری دلیل جس کو قادیانی بڑے شد و مد سے پیش کیا کرتے ہیں یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ

عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ (۲۵/۸)

(اے بنی آدم! اگر تمہارے پاس تمہیں میں سے رسول آئیں اور تم کو میری آیتیں سنائیں تو جو کوئی تقویٰ اختیار کرے گا اور اپنے عمل کو ٹھیک کرے گا ان پر کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ اندوہگین ہوں گے۔

اس سے ثابت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انبیاء آتے رہیں گے۔ کیونکہ "یاتین" میں نون تاکید ثقلیہ ہے جو مضارع کو زمانہ مستقبل کے ساتھ مخصوص کر دیتا ہے اور یہ آیت چونکہ قرآن میں اتری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر نازل ہوئی ہے اس لئے ان کے بعد انبیاء کا آنا ثابت ہو گیا۔ مگر انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ یہ قول کس وقت کا ہے اور اس کے مخاطب کون لوگ تھے؟

اس آیت میں خطاب بنی آدم سے ہے نہ کہ امت محمدیہ سے اور اس وقت کہی گئی ہے جبکہ آدمؑ کا ہبوط ہوا تھا۔ یہ مضمون قرآن میں تین جگہ بیان کیا گیا ہے اور تینوں جگہ قصہ ابلیس و آدم کے ساتھ ساتھ ہے ایک تو آیت مذکورہ بالا میں جو سورہ اعراف میں ہے دوسرے سورہ بقرہ میں۔

قُلۡنَا اهۡبِطُوۡا مِنۡهَا جَمِيۡعًا ۚ فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنۡ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ (۲/۳۸)

ہم نے کہا کہ تم سب وہاں سے نیچے اترو۔ سو اگر میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا۔ ان پر نہ کوئی خوف ہو گا نہ وہ اندوہگیں ہوں گے۔

پھر سورہ طٰہٰ میں ہے۔

قَالَ اهۡبِطَا مِنۡهَا جَمِيۡعًا بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَاىَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشۡقٰى (۲۰/۱۲۳)

اللہ نے فرمایا کہ وہاں سے تم دونوں سب کے سب (ذریۃ آدم و ابلیس) نیچے اترو اور ایک دوسرے کے دشمن ہو اگر میری طرف سے ہدایت پہنچے تو جو میری ہدایت کی پیروی

کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا نہ بدبخت۔

ان دونوں آیتوں میں ہدیٰ کا لفظ ہے اور سورۂ اعراف میں رسل و آیات کا۔ جو دراصل ہدیٰ کی تفصیل ہے کہ وہ رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ سے آئے گی چنانچہ ہبوط کے بعد اللہ تعالیٰ سلسلہ وار رسولوں کو بھیجتا رہا جو اس کی اتاری ہوئی آیتیں لوگوں کو پڑھ پڑھ کر سناتے رہے یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آکر یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ اس میں "یأتینّ" کے لفظ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی جن کو قرآن نے تصریح کے ساتھ خاتم الانبیاء قرار دیا ہے نبی آتے رہیں گے۔ قرآن کی سخت نافہمی ہے اور اس کی روشن تعلیم کو مسخ کرنا ہے۔

الغرض مذکورہ بالا اور اسی قسم کے لاطائل قیاسات اور بے معنی دلائل سے جو تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہیں ختم نبوت کی حقیقت پر پردہ ڈالنے اور مرزا صاحب کی نبوت کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح ظلی نبی، مجازی نبی اور بروزی نبی وغیرہ کے الفاظ صرف اس خود ساختہ نبوت کو پردۂ خفا میں رکھنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ جن کے قرآن کی رو سے حتماً کوئی معنی نہیں۔ نبوت ایک حقیقت ثابتہ ہے وہاں مجاز کا گذر نہیں نہ اس کا کوئی ظل ہے نہ بروز۔ وہ خود ایک بارز اور غیر مستتر صفت ہے۔ اس سے جو لوگ بذریعہ اطاعت اور اتباع کے اثر پذیر ہوتے ہیں وہ مومن اور صالح کہے جاسکتے ہیں نہ کہ نبی۔

یہاں تک جو کچھ بحث تھی وہ قرآن کریم کی رو سے تھی۔ اب عقلی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس مدعیٔ نبوت نے کوئی تعلیم ایسی پیش نہیں کی جس میں ادنیٰ شائبہ بھی نبوت کا ہو۔ ساری عمر کا سرمایہ صرف چند پیشین گوئیاں ہیں جن میں سے جو جس قدر زیادہ جزم و ادعا کے ساتھ کی گئی اسی قدر زیادہ غلط ثابت ہوئی۔ یہاں تک کہ ۱۵۔ اپریل ۱۹۰۷ء میں اشتہار دیا کہ

"اب میں تیری جناب میں ملتجی ہوں کہ مجھ میں اور ثناء اللہ میں سچا فیصلہ فرما۔ اور وہ جو تیری نگاہ میں درحقیقت مفسد اور کذاب ہے اس کو صادق کی زندگی ہی میں اس دنیا سے اٹھا لے۔"

تقدیر نے اس معاملہ میں سچا فیصلہ کر دیا جس سے اہل بصیرت پر حق روشن ہوگیا۔ یعنی اسی مدت میں جو اس دعا میں مقرر کی گئی تھی۔ مرزا صاحب کو ہیضہ کی وبا سے وفات دے دی اور مولانا ثناء اللہ ابو الوفا کو زندہ رکھا جو آج تک مرزائیوں کی تردید کر رہے ہیں۔

رہا مجدد کا عقیدہ جو ایک مذہب جماعت مرزا صاحب کے متعلق رکھتی ہے تو اس عقیدہ کو قرآنی تعلیم

سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر اس اُمت میں ایک مجدد پیدا کرتا ہے جو ان کے دین کی تجدید کرتا ہے۔ لیکن یہ روایت حقیقت میں اس وقت کے مسلمانوں کی ذہنیت کا اظہار کرتی ہے جبکہ پہلی صدی ہجری کے خاتمہ اور دوسری صدی کے آغاز پر حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ ہو گئے تھے۔ جنہوں نے بنی اُمیّہ کے مظالم کو مٹا کر پھر ایک بار عہدِ فاروقی کو تازہ کر دیا تھا ورنہ دین اللہ کے مقرر کیے ہوئے ان اٹل اور پختہ اصولوں کا نام ہے جو مطلقاً تجدد پذیر نہیں ہیں نہ ان کے لئے مجدد کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے مجدد کے عقیدہ کی تلقین نہیں کی، یہی کیفیت "مہدی موعود" کے عقیدہ کی ہے۔ اس کا بھی قرآن کے کسی حرف سے ثبوت نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تو محض مایوسی کی حالت کا عقیدہ ہے جس کو اہلبیت یعنی علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد نے سلطنت سے محروم اور نا امید ہو جانے کے بعد ڈھارس بندھائے رکھنے کے لئے قائم کیا تھا کہ ہم میں سے ایک مہدی پیدا ہوگا جو روئے زمین پر حکومت کرے گا۔ یہی نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر رجعت کا عقیدہ قائم کیا کہ ہمارے آئمہ پھر دنیا میں واپس آ کر اپنے دشمنوں کو فنا کریں گے اور قرنہا قرن تک حکومت کریں گے حالانکہ یہ قرآن کے سراسر خلاف ہے۔ اس میں بار بار تصریح کر دی گئی ہے کہ جو گیا اس کی واپسی نہیں۔ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ٥ (۳۶/۳۱)

حاصل یہ ہے کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی قسم کی نبوت یا مجددیت یا مہدویت کا عقیدہ کسی شخص کی بابت رکھنا شخصیت پرستی ہے جس سے قرآن اور اسلام کو قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ ایسے مدعی جب جب کھڑے ہوتے ہیں اُمت میں تفرقہ اور فتنہ کے باعث ہوئے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گنبدِ خضراء

(نوشتہ ۱۹۲۵ء)

(علی ساکنہا الف الف سلام)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں جب مسجد تعمیر فرمائی تو اس کے متصل ازواج مطہرات کے لئے حجرے بھی بنوائے۔ مسجد سے ملا ہوا حضرت عائشہ رضؓ کا حجرہ تھا جو کچی اینٹوں سے بنایا گیا تھا اور اوپر کھجور کے پتے تھے اس کا طول زیادہ تھا اور عرض علیٰ اختلافِ روایات سات آٹھ رہا، اور بلندی صرف اس قدر تھی کہ متوسط قد کا آدمی کھڑا ہو سکے۔ امام حسن بصریؒ کا بیان ہے کہ سن بلوغ کے قریب جب میں حجرے میں گیا تو میں نے ہاتھ سے اس کی چھت چھو لی تھی۔ اس کے ایک دروازہ میں عرعر کی لکڑی کا صرف ایک پٹ کا کواڑ لگا ہوا تھا، دوسرا دروازہ مسجد میں تھا۔

اسی حجرہ میں سرورِ عالمؐ نے انتقال فرمایا اور اسی میں لوگوں نے جنازہ کی نماز فرداً فرداً ادا کی۔ ایک دروازہ سے داخل ہوتے تھے اور جنازہ پڑھ کر دوسرے سے نکل جاتے تھے اور اسی میں دفن بھی کئے گئے۔

اس کے بعد حجرے کے دو حصے کر دیئے گئے ایک میں حضرت عائشہ رہتی تھیں دوسرے میں قبر شریف تھی۔ حضرت عمر رضؓ نے بعض لوگوں کو دیکھا کہ وہ تبرکاً روضہ کی مٹی اٹھاتے ہیں اس لئے اس کی حفاظت کے واسطے ایک دیوار بنوا دی۔ پھر اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور ان کے بعد حضرت عمر فاروق رضؓ دفن کئے گئے۔ یہ تینوں قبریں ایک سطر میں واقع نہیں ہیں بلکہ معتبر بیان کے مطابق حضرت ابوبکر رضؓ کا سر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دوشِ مبارک کے مقابل میں ہے اور حضرت عمر رضؓ کا صدیق اکبر رضؓ کے پہلو میں۔ اسی وجہ سے حضرت عمر رضؓ کے پاؤں حجرہ کی دیوار کے اندر آ گئے۔

ان تینوں قبروں کے بعد ایک قبر کی جگہ ابھی اور اس میں باقی ہے جہاں بنی ہاشم امام حسن رضؓ کو دفن کرنا چاہتے تھے لیکن اُن کو اجازت نہیں دی گئی اور وہ جگہ خالی رہی۔ اس کی بابت روایات میں پیشن گوئی ہے کہ یہاں عیسیٰؑ یا مہدی دفن ہوں گے۔ خلفاء بنی اُمیّہ نے اس خیال سے کہ مبادا پھر بنی ہاشم کوئی جھگڑا کریں

اس حجرہ کو ہر طرف سے بند کرا دیا اور کوئی کھڑکی یا دروازہ نہیں رکھا۔

۸۸ھ میں ولید بن عبدالملک اموی خلیفہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ والیٔ مدینہ کو حکم دیا کہ مسجد نبویؐ کو بڑھائیں اور امہات المومنین کے حجرے بھی اس میں شامل کر لیں۔ اہل مدینہ نے ہر چند واویلا کی کہ یہ حجرے بدستور قائم رکھے جائیں تاکہ اطراف عالم سے جو مسلمان زیارت کو آئیں وہ دیکھیں کہ ان کے نبیؐ نے کس سادگی کے ساتھ دنیا میں اپنی زندگی گزاری ہے لیکن کسی نے ان کی فریاد کو نہ سنا اور بجز حجرۂ عائشہ رضؓ کے تمام حجرے مسجد میں ملا لئے گئے۔

حجرۂ عائشہ رضؓ کو جس میں رسول اللہؐ اور شیخین کی قبریں ہیں مسجد کا جزو نہیں بنایا اور اس غرض سے کہ نماز میں وہ مصلیوں کے سامنے نہ پڑے ایک پنج گوشہ کچ حظیرہ اس کے گرد کھینچ دیا۔ حظیرہ کی تعمیر کے وقت تینوں قبریں نمایاں ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر سطح زمین کے برابر تھی اور شیخین کی قبریں کسی قدر مرتفع تھیں چونکہ ان کے اوپر چھت ہے، خس و خاشاک گرا تھا اور خاک پڑی ہوئی تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ارادہ کیا کہ اس کے جھاڑنے کی سعادت حاصل کریں، ان کو دیکھ کر قاسم بن محمد بن ابوبکر رضؓ نے بھی شرکت کے لئے اپنا دامن بھر لیا۔ امام زین العابدین رضؓ بھی تیار ہوئے اور سالم بن عبدالعزیز بن عمر رضؓ بھی اٹھے۔ ابن عبدالعزیزؒ نے دیکھا کہ اس مرقد پاک پر ہجوم ادب کے خلاف ہوگا اس لئے خود بھی بیٹھ گئے اور ان لوگوں کو بھی روک دیا اور اپنے خاص غلام مزاحم کو حکم دیا کہ اندر جا کر احتیاط سے صفائی کر دو لیکن ابن عبدالعزیزؒ کو اپنی اس محرومی پر سخت افسوس رہا۔

جب اس حظیرہ کی بنیادیں کھودی جا رہی تھیں تو یکایک دو پاؤں نمودار ہوئے۔ کھودنے والا جس کا نام وردان تھا یہ کچھ کہ بے ادبی کے خطرے سے سہم گیا اور نکل کر الگ کھڑا ہو گیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ بھی گھبرا اٹھے۔ اس وقت وہاں عروہ بن زبیرؒ بھی موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ دونوں پاؤں حضرت عمر رضؓ کے ہیں جن کے لئے حجرہ کی دیوار کو کھود کر جگہ نکالی گئی تھی۔ پھر ان کو بدستور مٹی سے چھپا دیا۔ ہٹ کر دیوار بنوائی اور حسب سابق کوئی دروازہ نہیں رکھا کہ قبروں کو کھود کر دیکھ سکیں۔ اس حظیرہ کی دیواریں سقف مسجد تک نہ تھیں اور نہ اس پر کوئی چھت تھی۔ صرف سال کی لکڑی ڈال کر اوپر سے موم جامہ کا پردہ اڑھا دیا گیا تھا۔

مدت ہائے دراز کے بعد چھٹی صدی کے وسط میں حجرۂ شریفہ میں اندر کی جانب دیوار کا ایک حصہ ٹوٹ گیا اور اس کے گرنے کی آواز باہر سنائی دی۔ خلیفۂ بغداد کو اطلاع دی گئی اس نے علماء و فقہاء سے مشورہ

لیا۔ انہوں نے کہا کہ کوئی متقی صالح مسجد کی اوپر کی کھڑکی سے حجرے کے اندر اتارا جائے تاکہ جو کچھ ٹوٹا ہوا اس کو درست کر دے۔ اس زمانہ میں عباسی خاندان میں بدر ضعیف نامی ایک عابد و زاہد شیخ تھے وہ اندر اتارے گئے۔ چند اینٹیں گری تھیں وہ مسجد کی مٹی سے تیار کی گئیں۔ جن سے اس شکست کی مرمت ہوئی۔

حجرے کے اندر گارا دھونے کا ایک کٹھرا جو پہلی تعمیر کے وقت کا پڑا ہوا تھا۔ اس میں وہاں کی خاکِ پاک بھر کر بطور تحفہ خلیفہ بغداد کے لئے روانہ کی گئی۔ جس روز بغداد پہنچی ہے اس کے استقبال کے لئے خلیفہ و اُمراء سے لیکر عام مخلوق کا اس قدر اژدحام تھا کہ کبھی اس سے پہلے دیکھا نہ گیا۔ شہر کے تمام کاروبار اس روز بند ہو گئے۔

اقوام کے فلسفۂ عروج و زوال کا یہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے کہ جب کسی جماعت پر دماغی موت طاری ہو جاتی ہے تو وہ عقیدت کے نمائشی مظاہروں پر قانع رہتی ہے اور دین کا حقیقی جذبہ جو محرک عمل تھا ان کے دلوں سے نکل جاتا ہے۔ چنانچہ اسی زمانہ میں شام میں صلیبی جنگ ہو رہی تھی اور غازی نورالدین شہید والیٔ حلب تھوڑی سی فوج لئے ہوئے صلیبی فدائیوں کے ٹڈی دل کے مقابلہ میں اپنا خون اور پسینہ ایک کر رہے تھے۔ لیکن یہ بغدادی اور خلیفہ مستضئی باللہ اس طرف رُخ بھی نہیں کرتے تھے اور جس رسول ؐ کی خاکِ مزار کی محبت کا یہ جوش و خروش دکھایا گیا تھا اس کے دین کی امداد کے لئے ان کی رگِ حمیّت ذرا بھی نہیں پھڑکتی تھی۔

تھوڑے ہی زمانہ کے بعد پھر روضہ کے اندر سے کچھ گرنے کی آواز آئی۔ مدینہ کا امیر قاسم بن مہنی حسنی تھا اس نے کہا کہ کوئی بزرگ تلاش کرو تو میں اس کو اندر جانے کی اجازت دوں۔ اس زمانے میں صوفیہ کے شیخ الشیوخ موصل کے عمر نسائی تھے جنہوں نے مجاورتِ رسول کی غرض سے مدینہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ لوگوں نے انہی کو منتخب کیا۔ مگر سلسل البول اور ریاح کے عارضے کی وجہ سے انہوں نے انکار کیا کہ کہیں روضہ شریف کی بے ادبی نہ ہو جائے۔ لیکن لوگوں کے سخت اصرار کی وجہ سے ان کو راضی ہونا پڑا۔ آخر وہ تین دن بھوکے پیاسے رہے۔ اس کے بعد مسجد کی چھت کے متصل جو روشن دان ہے اس سے لٹکائے گئے۔ حجرے کے اندر جا کر انہوں نے شمع جلائی۔ گرے ہوئے حصّہ کی مرمت کی اور قبروں پر جو گرد پڑی ہوئی تھی اس کو اپنی داڑھی سے جھاڑا۔

صلیبی جنگ کے دوران ۵۵۷ھ میں دو رومی عیسائی مغربی حاجیوں کے بھیس میں مدینہ میں داخل ہوئے۔ وہاں انہوں نے محبتِ رسول ؐ اور دینداری کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم تو صرف اس لئے ترکِ وطن

کر کے یہاں آئے ہیں کہ جوارِ رسولؐ میں رہیں اور عبادت کریں۔ اہلِ مدینہ نے جب ان کے اظہارِ محبت و عبادت اور بالخصوص ان کی خیرات و مبرات کو دیکھا تو گرویدہ ہو گئے اور ان کی خواہش کے مطابق حجرۂ مشریفہ کے متصل ان کو ایک مکان رہنے کے لئے دیا۔ ان دونوں نے اس مکان سے روضۂ اطہر کی طرف سرنگ کھودنی شروع کی۔ رات کو کھودتے اور صبح کو سویرے ہی مٹی کی مشک بھر کر شہر کے باہر لیجا کر پھینک دیتے اور دن بھر اِدھر اُدھر کے نخلستانوں اور قبا وغیرہ کی زیارت گاہوں میں گھوم گھوم کر پانی پلاتے۔

اس زمانہ میں عرب سلطان نورالدین شہید کے زیرِ اثر آچکا تھا اس نے ایک رات سرورِ عالم کو خواب میں دیکھا کہ آپؐ دو گورے آدمیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمارہے ہیں کہ یہ دونوں کتّے مجھے ستارہے ہیں اور تو خبر نہیں لیتا۔ سلطان یہ خواب دیکھ کر چونک پڑا اور صبح کو علماء کو بلا کر تعبیر پوچھی لیکن وہ صحیح بات سمجھنے سے قاصر رہے۔ متواتر اس نے تین رات یہی خواب دیکھا اور اب اس کو یارائے تحمل نہ رہا اور یہ خیال کر کے کہ مدینہ میں ضرور کوئی حادثہ گزر رہا ہے وہ اپنے وزیر جمال الدین موصلی اور بیس سواروں کو لیکر روانہ ہو گیا اور بر جناح استعجال سولہ روز میں مدینہ پہنچ گیا۔ لوگ اس کے یکایک اس طرح آجانے سے متعجب ہوئے امیرِ مدینہ نے آنے کا سبب پوچھا۔ اس نے تنہائی میں لے جا کر اس سے خواب کا واقعہ بیان کیا اور پوچھا کہ روضۂ شریف میں کوئی جدید امر ظہور پذیر تو نہیں ہوا۔ اس نے کہا نہیں۔ پھر سلطان کو بھی لے جا کر معائنہ کرایا۔ سب چیزیں بدستور تھیں۔ لیکن سلطان کو اطمینان نہ ہوا۔ تب امیر نے کہا کہ خواب میں جو دو شکلیں آپ کو دکھائی گئی ہیں انکو آپ پہچان سکیں گے اُسنے کہا کہ یقیناً کیونکہ متواتر تین راتیں میں نے ان کو دیکھا ہے۔ امیر نے کہا کہ اس کی آسان صورت یہ ہے کہ آپ مسجد نبویؐ میں بیٹھ جائیں ہم ملاقات اور سلام کے بہانہ سے سارے اہلِ مدینہ کو سامنے سے گزار دیتے ہیں چنانچہ یہی کیا گیا لیکن وہ دونوں صورتیں نظر نہ آئیں۔ سلطان نے کہا کہ کوئی اور باقی نہیں رہا۔ امیر نے کہا نہیں دو مغربی حاجی ہیں جو بقیع میں پانی پلاتے رہتے ہیں۔ اگر آپ حکم دیں تو ان کو بھی بلائیں۔ فرمایا کہ ہاں۔ اتنی دیر میں کہ وہ آئیں اہلِ مدینہ میں سے ان لوگوں نے جو ان کے زیر بارِ احسان تھے ان کی تعریفوں کے پُل باندھ دیئے جب وہ آگئے تو سلطان جو گھڑی بھر سے ان کی مدح وثنا اور دیانتداری اور تقوے کی تعریف سن رہا تھا حیران ہو گیا۔ امیر نے جب پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ ہیں تو یہی دونوں سلطان نے احترام کے ساتھ اُن سے ہاتھ ملایا اور گفتگو شروع کی۔ باتیں کرتا ہوا ان کے ساتھ اس گھر میں گیا جس میں وہ مقیم تھے گو ور پردہ غائر نگاہ سے دیکھا لیکن وہاں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ جب واپس آنے

لگا تو فرش کے نیچے پاؤں تلے کوئی چیز ہلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ فرش کو اٹھوایا تو دیکھا کہ ایک لکڑی کا تختہ ہے۔ اس کو ہٹایا تو اندر ایک سرنگ نظر آئی جو روضہ کی طرف کھودی جا رہی تھی۔ اسی وقت ان دونوں کو گرفتار کیا اور ان سے ٹھیک ٹھیک کیفیت دریافت کی۔ ان دونوں نے اعتراف کیا ہم اپنی حکومت کی طرف سے اس لئے بھیجے گئے تھے کہ رسولِ عربی ﷺ کے جسدِ مبارک کو نکال کر روم میں لیجائیں۔ اس کے بعد وہ دونوں حجرے کے متصل مالی والی دیوار کے نیچے قتل کر دیئے گئے۔

سلطان اس انعام پر کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے اس کام کو لیا اور اس کا اہل بنایا، دیر تک روتا رہا۔ اس کے بعد کثیر مقدار میں سیسہ جمع کیا اور حجرہ کی بنیادوں کو ہر طرف سے کھدوایا۔ ۹ ذراع پہنچ کر جب پانی نکلنے لگا تو نیچے سے سطحِ زمین تک ان میں وہی سیسہ پلوا دیا تاکہ آئندہ اسی قسم کی نباشوں سے محفوظ رہے پھر بدستور ان بنیادوں پر دیواریں تعمیر کرائیں۔

اس واقعہ سے پہلے اسی طرح کا ارادہ مصر کے فاطمی خلیفہ حاکم بامراللہ نے بھی کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین کے جسدوں کو مدینہ سے مصر میں منتقل کرالے تاکہ اس کا پایۂ تخت مقبولِ انام اور زیارت گاہِ خاص و عام بن جائے۔ اس کام کے لئے اس نے ایک درباری ابوالفتوح کو مدینہ میں بھیجا۔ اہلِ مدینہ مضطرب و بیقرار ہو کر اس کے پاس جمع ہوئے اور اس کو اس سے باز رکھنے کی منت سماجت کی لیکن شاہی حکم تھا وہ اس پر مصر رہا۔ اس مجمع میں ایک قاری زلبانی نامی تھا اس نے قرآن کی یہ آیت سنائی۔

أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ أَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ (۱۳)

"تم ان لوگوں سے کیوں نہیں لڑتے جنہوں نے اپنی قسمیں توڑ ڈالیں اور رسول کو نکالنے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے تمہارے ساتھ پہلے چھیڑ شروع کی۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ بس اگر ایمان رکھتے ہو تو اللہ زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔"

اس کے سننے سے مجمع میں اس قدر جوش پیدا ہو گیا کہ اگر وہ مصری حکومت کے ماتحت نہ ہوتے تو یقیناً ابوالفتح کو مار ڈالتے۔ اس سے اس کی آنکھیں کھل گئیں کہ وہ کس قدر سخت مہم پر بھیجا گیا ہے۔ کیونکہ جب ابھی سے یہ حالت ہے تو جب قبر کھدنی شروع ہو گی، اس وقت کیا ہو گا، اس لئے ڈر گیا۔ اسی رات

شام کے وقت ایک نہایت خطرناک آندھی آئی جس کو لوگوں نے اس ناپاک ارادہ کی نحوست قرار دیا۔ ابوالفتح ان سب باتوں سے مرعوب ہو کر واپس چلا گیا اور حاکم بامراللہ کو اس فعل کے انجام سے ڈرایا۔

حجرۂ شریفہ پر عقیدتمندوں نے سونے اور چاندی کے بے شمار قندیلیں ریشمیں اور اونی پردے چڑھائے تھے جو سب وہاں اسباب خانہ میں رکھے ہوئے تھے۔ ۶۵۴ھ میں جب وہاں آگ لگی تو یہ سب سامان جل گیا۔ ساری مسجدِ نبوی بجز اس تبرک خانہ کے جس میں قرآن شریف رکھا ہوا تھا اور جو صحن مسجد کے متصل واقع تھا جل گئی۔ حجرے کی دیواریں جابجا سے شق ہو گئیں اور سقف مسجد کا جلا ہوا ملبہ اس میں بھر گیا۔ لوگ سوءِ ادبی کے خیال سے جرأت نہیں کرتے تھے کہ ان کو اندر سے نکال دیں۔ جب مسجد کی مرمت شروع

لہ خلفائے فاطمیہ کی تاریخ یوں تو بالعموم افسوسناک ہے لیکن حاکم بامراللہ کی داستان تو سفاکیت اور طاغوتیت کا ایک عبرتناک افسانہ ہے۔ مورخین نے اس کو مصر کا فرعون ثانی قرار دیا ہے کیونکہ اس نے بھی خدائی دعویٰ کیا تھا اور حکم دیا تھا کہ جب خطبہ میں میرا نام آئے تو لوگ صفیں باندھ کر کھڑے ہو جائیں، راستہ میں مجھے دیکھیں تو سجدے کریں۔ اپنے نام حاکم بامراللہ کو حاکم بامرہ کر لیا تھا۔ کسی باطنی نے اس کو ایک کتاب لکھ کر دی تھی جس میں یہ بیان تھا کہ روح الٰہی حضرت آدمؑ میں آئی، ان سے حضرت علیؓ میں منتقل ہوئی پھر حاکم میں اس کا ظہور ہوا۔ یہ کتاب اس کے حکم سے جامع ازہر میں سنائی گئی۔ لوگ اس قدر برہم ہوئے کہ شورش کا اندیشہ ہوا اس لئے حاکم نے اس کو جبل دروز میں بھیج دیا جہاں کے لوگ اس کو خدا مانتے تھے۔ آج بھی وہ یہی اعتقاد رکھتے ہیں اور حضرت علیؓ کو خدا ماننے والے نصیریوں کی طرح اکثر ان کی توہم پرست نگاہیں بھی حاکم کو بادلوں کے تخت پر فضائے آسمانی میں سیر کرتا ہوا دیکھتی ہیں۔ اس کے ظلم کا یہ عالم تھا کہ ایک بار راستہ سے گزرتے ہوئے کسی حمام سے عورتوں کا شور سنائی دیا فوراً اس کو منہدم کرا دیا۔ اور کسی کو نکلنے بھی نہ دیا بیویاں عورتیں اسی میں دب کر مر گئیں۔ ۴۱۱ھ میں اپنی بہن پر تہمت لگا کر اس کے قتل کا ارادہ کیا لیکن اسے خبر لگ گئی۔ اس نے پیش قدمی کر کے اسی کو قتل کرا دیا۔

ہوئی تو ۶۵۴ھ میں خود خلیفہ مستعصم باللہ کو لکھا گیا کہ وہ بہ نفسِ نفیس آکر اس کو صاف کرے لیکن یہ خط وہاں اس وقت پہنچا جب ہلاکو محاصرہ کے لئے آرہا تھا اس لئے لوگوں نے اس کو بدستور اسی حالت میں چھوڑ دیا۔ صرف ارد گرد پردے کی ایک دیوار بنا دی۔

اب تک حجرۂ شریفہ پر کوئی قبہ نہیں بنایا گیا تھا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبہ پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا۔ سنن ابوداؤد میں ہے کہ آپؐ نے ایک انصاری کے مکان پر قبہ دیکھا صحابہؓ سے پوچھا یہ کس کا گھر ہے؟ لوگوں نے اس کا نام بتایا۔ آپ کا دل اس کی طرف سے بیزار ہو گیا۔ جب وہ خدمت میں حاضر ہوتا تو آپ اس کی طرف سے منہ پھیر لیتے۔ اس نے لوگوں سے ذکر کیا۔ جب معلوم ہوا کہ قبہ کی وجہ سے خفگی ہے تو جا کر اس کو توڑ ڈالا۔ پھر جب دوسری بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر سے گذر ہوا تو اس قبہ کو نہ دیکھا۔ صحابہؓ سے دریافت فرمایا انہوں نے کہا یارسول اللہ جب اس مالک مکان کو معلوم ہوا کہ آپ اسے ناپسند فرماتے ہیں تو اس نے گرا دیا۔ اس وقت آنحضرتؐ نے فرمایا کہ یاد رکھو ہر ایک عمارت بنانے والے پر وبال ہے بجز اس کے جس سے چارہ نہ ہو۔

لیکن ۶۷۸ھ میں ایک رئیس احمد بن برہان نے فرطِ عقیدت کے جوش اور تحصیلِ ثواب کی امید میں حجرہ پر قبہ تعمیر کرا دیا۔ اہلِ مدینہ بدعت سمجھ کر اس سے سخت ناراض ہوئے کیونکہ علاوہ ازیں کہ قبہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ناپسند فرماتے تھے، قبر شریف پر معمار اور مزدوروں کے چڑھنے سے اس کی بے حرمتی ہوئی۔

اتفاقاً اسی دوران میں کسی معاملہ میں دربار سے اس پر خفگی ہوئی اور امیر علم الدین شجاعی کے نام حکم آیا کہ اس کو پیٹو اور اس کا سارا مال متاع ضبط کر لو۔ اس نے اس حکم کی تعمیل کی۔ مدینہ والے احمد کی اس مصیبت کو روضۂ اطہر کی بے ادبی کی سزا سمجھتے تھے۔

حجرۂ شریفہ کے ساتھ جو مقصورہ ہے جس میں لوگ زیارت کے لئے جاتے ہیں وہ ملک ظاہر کے زمانہ میں مسجد کا ایک حصہ لے کر بنایا گیا تھا۔ اہلِ مدینہ اسی وجہ سے اس کو ہمیشہ سے ناپسند کرتے رہے۔ توشہ خانہ اس کے بعد بنا ہے۔

۸۸۱ھ میں حجرۂ شریفہ کی پھر از سرِ نو تعمیر ہوئی کیونکہ بیرونی دیوار خراب ہو گئی تھی جب وہ گرائی گئی تو اندر کی دیواروں میں شگاف نظر آئے۔ جلی ہوئی لکڑیوں اور اینٹوں کا انبار بھی دکھائی دیا۔ ان

سب کو نکال کر روضہ کو صاف کیا اور حسبِ سابق مع گنبد کے پھر تعمیر کر دیا۔

۸۸۶ھ میں پھر آتش زدگی کا حادثہ ہوا۔ اس میں حجرۂ شریف خراب ہو گیا اور مقصورہ بالکل جل گیا۔ ملک اشرف قایتبائی نے خاص اہتمام سے پھر تعمیر کرایا۔ پیتل کا قبہ اس کے بعد بنایا گیا ہے۔

حجرہ کی موجودہ شکل ملک اشرف ہی کی تعمیر ہے۔ بجز اس کے کہ سلاطینِ عثمانیہ کی طرف سے کبھی کبھی مرمت اور رنگ افروزی ہوتی رہی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ

(نوشتہ ۱۹۴۳ء)

ابوذر کنیت اور نام جُندب تھا۔ ان کے والد جنادہ بن کعب اور والدہ رملہ بنت ربیعہ دونوں قبیلہ غفار سے تھے جو کنانی نسل کی شاخ تھا اور مکہ سے شام کی طرف جو راستہ جاتا ہے اس کے کنارے مدینہ کے قریب آباد تھا۔

قبیلہ غفار اور اس کا پڑوسی دوسرا قبیلہ اسلم دونوں کا پیشہ عرب جاہلیت کی عادت کے مطابق لوٹ مار تھا۔ ان کی اوقات بسری ہی غارت گری پر تھی اور یہ لوگ غیر معمولی قسم کے ڈاکو تھے۔

اہل عرب بالعموم اپنے آپ کو دین ابراہیمیؑ کا پیرو کہتے تھے جس میں سال کے چار مہینوں، رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ، اور محرم میں جنگ و پیکار خصوصیت کے ساتھ ممنوع تھی، کیونکہ ان مہینوں میں قومی میلے اور بالخصوص حج کا اجتماع ہوتا تھا، جس میں ملک کے اطراف و دیار کے لوگ شرکت کے لئے آتے تھے۔ اس لئے عام طور پر عرب کے باشندے ان مہینوں کا احترام کرتے اور ان میں ہتھیار نہیں اٹھاتے تھے مگر قبیلۂ غفار نے ان کی حُرمت کا بھی لحاظ رکھنا چھوڑ دیا تھا اور ان میں بھی غارت گری کرتے تھے۔ یہاں تک کہ قریش کا قبیلہ جو بیت اللہ کا مجاور ہونے کے باعث تمام عرب میں محترم سمجھا جاتا تھا اور اس کے تجارتی قافلوں پر کوئی عربی قبیلہ ہاتھ نہیں ڈالتا تھا۔ وہ بھی غفاریوں کی دست بُرد سے ڈرتا اور موسم گرما میں ملک شام کی طرف آتے جاتے ان کی رعایت اور خاطر داری کرتا۔

ابوذرؓ جب جوان ہوئے تو اپنے قبیلہ کے ساتھ راہ چلتے قافلوں اور مخالف قبائل کو لوٹنے لگے۔ اور بہادری کی خصوصیت کی بدولت نامور ڈاکو ہو گئے۔ وہ قافلوں پر اس طرح جا پڑتے تھے جیسے بپھرا ہوا شیر۔

ایک مدت کے بعد خود بخود ان کے ضمیر نے ان کو ملامت کی اور ان سنگین قزاقانہ جرائم اور سمت

سفاکانہ مظالم کو صحیح شکل میں اُن پر آشکارا کر دیا جس سے ان کو نظر آگیا کہ یہ سب شیطانی حرص کا کرشمہ اور دنیاوی ہوس کی کارفرمائی ہے۔ اس احساس سے ان کا دل اس قدر پسیجا کہ توبہ کر کے خوف اور حساب کے ڈر سے دن رات عبادت کرنے اور معافی مانگنے لگے۔ ان کا خود بیان ہے کہ میں رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہونے سے تین سال پہلے ہی نمازیں پڑھتا تھا۔ کسی نے پوچھا، کس طرف؟ بولے کہ جدھر اللہ رُخ کر دیتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ گذشتہ گناہوں کی پشیمانی سے پوری پوری راتیں روتے اور خدا کے سامنے عاجزی سے گڑگڑاتے گزر جاتیں۔ ابن سعد نے طبقات میں ان سے روایت لکھی ہے کہ "میں عشاء کے وقت نماز کے لئے کھڑا ہوتا پچھلے پہر تک تھک کر زمین پر گر پڑتا پھر جب دھوپ لگتی تو اٹھتا۔"

انہوں نے اپنے قبیلہ کو بھی ان گناہوں سے روکنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے اس کے اکثر لوگ مخالف ہو گئے۔ اس لئے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اپنے چھوٹے بھائی انیس اور والدہ کو ساتھ لیکر مکہ کی طرف روانہ ہو گئے اور اس کے قریب پہنچ کر ایک بستی میں سکونت اختیار کی۔

جب مکہ میں ایک نبی کی بعثت کی خبر ملی، اس وقت اپنے بھائی انیس کو دریافت حال کے لئے وہاں بھیجا۔ انیس اچھے شاعر تھے جن کے اشعار کی لوگ تعریف کرتے تھے بلکہ مقابلہ میں بعض شعراء سے بازی بھی جیت چکے تھے۔ انہوں نے مکہ سے واپس آکر کہا کہ بے شک یہ خبر صحیح ہے اور قریش کے ایک شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ وہ لوگوں کو اکیلے معبود اللہ کی طرف بلاتے ہیں اور بتوں کی پرستش اور ہر قسم کے شرک اور مشرکانہ رسوم سے روکتے ہیں، جس سے ان کی قوم ان کے خلاف ہو گئی ہے۔

حضرت ابوذرؓ یہ اطلاع پاکر مکہ کو روانہ ہوئے وہاں جاکر حرم میں ٹھہر گئے۔ کفار مکہ سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف تھے، آپؐ کا پتہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ کئی دن کے بعد اتفاقاً حضرت علیؓ وہاں آگئے، جن کی عمر اس وقت دس گیارہ سال کی تھی۔ ابوذرؓ کو اجنبی دیکھ کر پوچھا کہ کیسے آنا ہوا؟ ابوذرؓ نے ان کے چہرے سے خیر کے آثار دیکھ کر اپنے آنے کی غرض بیان کی۔ حضرت علیؓ ان کو اپنے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے۔ ابوذرؓ سلام کر کے بیٹھ گئے اور کہا کہ جو کچھ آپؐ کہتے ہیں میں اس کو سننے کے لئے آیا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں نہیں کہتا، میرا رب کہتا ہے بولے کہ بس وہی سنائیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی چند آیات تلاوت فرمائیں۔ سننے کے بعد حضرت ابوذرؓ مسلمان ہو گئے

حضورؐ نے پوچھا کس قبیلہ سے ہو؟ بولے غفار سے۔ تعجب سے آپؐ نے ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھ لیا۔ یعنی ایسے لٹیروں میں سے ایک نیک نفس۔

حضورؐ نے ان کی ظاہری حالت فلاکت زدہ دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ کے سپرد کیا۔ وہ اپنے گھر لائے۔ کھانا کھلایا، صاف کپڑے پہننے کو دیئے اور اپنا مہمان بنا کر رکھا۔

یہ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا جس میں اس کی تعلیم مخفی طور پر ہوتی تھی۔ کیونکہ کفار مکہ سخت مخالفت کرتے تھے۔ اس وقت تک کل چار آدمی ایمان لائے تھے پانچویں حضرت ابو ذرؓ ہوئے۔ یہ اعلانِ حق میں نہایت بے باک اور نڈر تھے۔ ان سے نہ رہا گیا۔ خانہ کعبہ میں جا کر جہاں قریشی جمع تھے۔ توحید کا اعلان کیا۔ وہ صابی صابی (کافر کافر) کہہ کر ان پر ٹوٹ پڑے اور مارنے لگے۔ آخر قبیلہ بنی بکر کے چند نوجوانوں نے آ کر بچایا اور قریش سے کہا کہ یہ ایک پردیسی بے کس مہمان ہے اس کو کیوں مارتے ہو، خود تمہارے قبیلہ کے جو لوگ صابی ہو گئے ہیں ان کو مارو۔

باوجود اس کے پھر بھی ابو ذرؓ سے نہ رہا گیا۔ ایک دن دوبارہ جا کر خانۂ کعبہ میں زور سے کلمۂ طیبہ کا نعرہ لگایا۔ قریش کے لوگوں نے ان کو اس قدر مارا کہ ان کے سر سے خون جاری ہو گیا۔ حضرت عباسؓ نے دیکھا تو دوڑ کر آ گئے اور کہنے لگے، یہ تم کیا کر رہے ہو؟ جانتے ہو یہ کون ہے؟ قبیلۂ غفار کا ہے جو تمہارے شام کے راستے میں آباد ہے کیا چاہتے ہو کہ تمہارے تجارتی قافلے لوٹ لئے جائیں؟ یہ سن کر قریشیوں نے ہاتھ روک لیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیفیت دیکھ کر مناسب سمجھا کہ ان کو مکہ سے رخصت کر دیں، فرمایا کہ ابو ذرؓ! تم اپنی قوم میں جا کر توحید کی تبلیغ کرو۔ اس لئے وہ مکہ سے اپنے گھر چلے آئے۔ وہاں اپنے بھائی انیس کو سمجھایا وہ مسلمان ہو گئے۔ پھر اپنی والدہ کے سامنے توحید کی تعلیم پیش کی۔ وہ اسلام لائیں دونوں کو ساتھ لے کر قبیلۂ غفار میں پہنچے اور ان کو سمجھانا شروع کیا۔ ایک مدت کی محنت اور کوشش سے وہ ان دونوں کی طرف مائل ہوئے اور ان کی باتیں سننے لگے۔

ہجرت کے بعد جب خندق سے قریش اور ان کے حلیف قبائل جنہوں نے ۲۴ ہزار کی تعداد میں مدینہ پر اس غرض سے چڑھائی کی تھی کہ مسلمانوں کو بالکل فنا کر دیں، بے نیل و مرام واپس ہوئے اور ان کی اس ناکامی کا سارے عرب میں چرچا ہوا، اس وقت ابو ذرؓ اپنے قبیلۂ غفار نیز اپنے پڑوسی قبیلہ اسلم کو بھی ساتھ

لے کر مدینہ میں آئے۔ یہ دونوں قبیلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر مسلمان ہو گئے اس کے بعد اپنے اپنے مقامات کو واپس چلے گئے۔ لیکن حضرت ابو ذرؓ رسول اللہؐ کے پاس ہی رہ گئے اور اصحاب صفہ میں شامل ہو کر آخر دم تک وہیں رہے۔

یہ آنحضرتؐ کے خادم بھی تھے اور ساتھی بھی۔ ایسا بھی ہوتا کہ حضورؐ سفر میں کبھی کبھی ان کو سواری پر اپنے پیچھے بٹھا لیتے۔ حضورؐ کو ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ خاص اسرار کی تعلیم ان کو دی تھی اور صحابہؓ کی جماعت میں یہ صاحب سِرّ النبی" کے لقب سے مشہور تھے، ان کے قلب میں دنیا اور متاعِ دنیا کی کوئی محبت نہ تھی۔ خود حضورؐ سے روایت کی گئی ہے کہ:-

" جو حضرت عیسیٰؑ کے زہد کو دیکھنا چاہے وہ ابو ذرؓ کو دیکھ لے"۔ اور یہ استغنا اور بے نیازی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے ان کے اندر پیدا کی تھی۔ کیونکہ حضورؐ دھن دولت بڑھنے کی خرابیاں بار بار ان کو سمجھاتے رہتے تھے۔ ایک بار آپ کا گذر کوہِ اُحد پر ہوا۔ ابو ذرؓ ساتھ تھے۔ فرمایا "ابو ذرؓ! مجھے اس پہاڑ کے بھی برابر سونا مل جائے تو میں پسند کروں گا کہ اس میں سے کچھ بھی میرے پاس رہ جائے۔ سب اللہ کے بندوں میں ادھر ادھر تقسیم کر دوں گا" پھر فرمایا کہ " وہی لوگ مفلوک ہیں جو مالدار ہیں، بجز ان کے جنہوں نے اپنے مالوں کو محتاجوں میں تقسیم کر دیا"۔ دوسری روایت ہے کہ " جو لوگ سونے اور چاندی کو بند کر کے رکھتے ہیں، وہ ان کے حق میں دہکتی ہوئی آگ ہیں"۔

ایک دن مسجد نبوی میں ایک شخص آیا جس کے بدن پر قیمتی لباس تھا۔ ایک دوسرا مسکین بھی وہاں تھا جس کے کپڑے پھٹے پرانے تھے۔ آنحضرتؐ نے ابو ذرؓ سے کہا کہ " دیکھو قیامت کے دن اس فقیر کی نیکیوں کا وزن اس دولت مند کی نیکیوں کے وزن سے بہت زیادہ ہوگا"۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت ابو ذرؓ ہمیشہ مسکینوں کے ساتھ رہتے، اُن سے ہمدردی کرتے اور فرماتے کہ میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہی حکم دیا ہے کہ میں محتاجوں کو عزیز رکھوں اور ان کے ساتھ مل کر رہوں سلئے اپنے غلام کے ساتھ بھی مساوات رکھتے تھے جو خود کھاتے وہی اس کو کھلاتے اور جو خود پہنتے وہی اس کو پہناتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عہد لیا تھا کہ کبھی کسی سے کوئی سوال نہ کرنا، اس لئے اگر ان کا کوڑا بھی ہاتھ سے گر جاتا تو خود گھوڑے سے اتر کر اس کو اٹھاتے اور یہ جائز نہ رکھتے کہ کسی سے اس کے اٹھانے کا سوال

کریں۔

صحابہؓ کی جماعت میں ان کی راست بازی اور حق گوئی مسلم تھی۔ سچی بات کہنے میں ہمیشہ بے باک تھے۔ ذرا سی بھی کوئی بات خلاف دیکھتے تو بڑے سے بڑے صحابی کو بھی ٹوک دیتے۔ سب لوگ ان سے ڈرتے اور ان کا ادب کرتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی یہ مدینہ ہی میں رہے۔ جب حضرت عثمان رضؓ خلیفہ ہوئے تو ان کے زمانے میں دمشق چلے گئے اور وہاں رہنے لگے۔ اس وقت امیر معاویہ رضؓ پورے ملک شام کے والی ہو گئے تھے اور شاہانہ شان و شوکت سے رہتے تھے ان کے علاوہ امراء اور رؤسا بھی امیرانہ زندگی گزارتے تھے۔ اور غریبوں اور محتاجوں کی طرف سے بے التفاتی برتی جاتی تھی۔ حضرت ابوذر رضؓ اس کو کیسے برداشت کر سکتے۔ انہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور لوگوں میں اعلان کیا کہ درہم و دینار کو سینت سینت کر رکھنے والے اور اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے والے جہنمی ہیں۔ یہ تلقین مسجدوں، بازاروں، عام گذرگاہوں اور مجمعوں میں کرنے لگے۔ یہاں تک کہ فقراء امراء کے خلاف کھڑے ہو گئے اور ایک عام شورش برپا ہو گئی۔ اور معاملہ اس قدر بڑھ گیا کہ امیر معاویہ رضؓ کو اس میں دخل دینا پڑا۔ انہوں نے حضرت ابوذر رضؓ کو بلا کر سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ کب ماننے والے تھے۔ فرمایا کہ قرآن میں ہے کہ جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں، ان کو سخت عذاب ملے گا۔ امیر معاویہؓ نے کہا کہ یہ آیت اہل کتاب یعنی یہودی اور عیسائی پیشوایانِ دین سے متعلق ہے۔ پوری آیت یہ ہے۔

"اے ایمان والو! اکثر یہودی اور عیسائی پیشوایانِ دین (عالم و زاہد بن کر) لوگوں کے مال کو ناروا طریقہ سے خُرد بُرد کرتے اور اللہ کی سیدھی راہ سے روکتے ہیں اور جو لوگ چاندی اور سونا جمع کر کے رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔ جس دن کہ جہنم کی آگ میں وہ (درہم و دینار) تپائے جائیں گے اور اُن سے اُن کی پیشانی، پہلو اور پیٹھ داغی جائے گی (اور کہا جائیگا کہ) یہ وہی ہے، جس کو تم نے اپنے لئے سینت کر رکھا تھا۔ سو اب اپنے خزانے کا مزہ چکھو۔" (سورۂ توبہ رکوع ۵) ($\frac{9}{34-35}$)

حضرت ابوذر رضؓ کا فرمانا تھا کہ جرم بہر صورت جرم ہے، خواہ اس کا مرتکب کوئی ہو۔ اگر روپیہ جوڑ جوڑ کر رکھنا یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے گناہ ہے تو مسلمانوں کے لئے کیوں گناہ نہیں۔ امیر معاویہ رضؓ اس کا جواب

نہ دے سکے۔

آخر ابوذرؓ برابر اپنی تبلیغ میں مصروف رہے یہاں تک کہ غریب طبقے کے لوگ امراء کو لوٹنے لگے۔ امیر معاویہؓ نے ممتاز صحابہ حضرت عبادہ بن صامت، ابوالدرداء اور عمرو بن العاص کو ان کے پاس سمجھانے کے لئے بھیجا۔ لیکن یہ لوگ حضرت ابوذرؓ کے سامنے کیا کہہ سکتے تھے۔ کیونکہ ان حضرات نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درویشانہ زندگی، متاعِ دنیا سے بے نیازی اور زہد و قناعت کی کیفیت دیکھی تھی۔

حضرت ابوذرؓ نے عبادہ بن صامت سے جو اس جماعت کے رئیس اور بزرگ صحابی تھے، فرمایا کہ اس وفد میں تمہاری شرکت سے مجھ کو بہت رنج ہوا۔ آخر یہ لوگ ان کی حق گوئی اور جلال سے مرعوب ہو کر واپس آ گئے۔ اب امیر معاویہؓ نے ممانعت کر دی کہ ابوذرؓ کے پاس نہ کوئی جائے، نہ بیٹھے۔ اس اعلان کے بعد جو لوگ حضرت ابوذرؓ کے پاس جاتے وہ خود ان کو منع فرماتے کہ میرے پاس سے چلے جاؤ۔ اور امیر کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرو۔ اس پر بھی اگر کوئی جماعت نہ اٹھتی تو اس کو وہی باتیں اپنی سناتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ۔

"اگر ابوذرؓ کی گردن پر تلوار بھی رکھ دی جائے اور سچی بات کہنے سے روکنے کی کوشش کی جائے تو بھی وہ باز رہنے والا نہیں ہے۔ میرے دوست صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت فرمائی ہے کہ میں سچی بات کہوں اور اس کی تبلیغ کروں، چاہے وہ کتنی ہی تلخ ہو۔ حکام کی اطاعت ہمارے اوپر فرض کی گئی ہے مگر تین باتوں میں ممانعت کا ان کو حق نہیں ہے۔ بھلائی سکھانے۔ برائی سے روکنے اور سنتؐ کی اشاعت میں۔"

آخر میں دولت مندوں کی پریشانی بہت بڑھ گئی اور امیر معاویہؓ کے پاس ان کے اس قدر درخواستیں گزریں کہ انہوں نے مجبور ہو کر حضرت عثمانؓ کو واقعات کی اطلاع دی اور لکھا کہ ابوذرؓ کی وجہ سے یہاں فتنہ پیدا ہو رہا ہے اس لئے آپ ان کو اپنے پاس بلا لیجئے۔ حضرت عثمانؓ نے ایک خاص قاصد کے ہاتھ ابوذرؓ کے پاس حکم بھیجا کہ فوراً مدینے چلے آؤ۔ حکم پاتے ہی اطاعت کے خیال سے مدینہ روانہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ بیوی اور بیٹی کو بھی ساتھ نہیں لیا۔ بعد میں امیر معاویہؓ نے ان دونوں کو آرام کے ساتھ بھیج دیا۔

جب مدینہ میں داخل ہوئے، اس وقت مخلوق ان کو دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑی۔ اب یہاں

ان کے پاس بھیڑ لگی رہتی تھی۔ جن میں زر اندوزوں اور سرمایہ داروں کے خلاف تبلیغ کرتے تھے۔ چنانچہ مدینہ میں بھی وہی کیفیت پیدا ہو گئی جو دمشق میں تھی اور فقراء اُمراء کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ لوگوں نے آکر حضرت عثمان رضؓ سے کہا کہ جس فساد سے بچنے کے لئے ان کو ملک شام سے آپ نے یہاں بلوایا ہے۔ وہی فساد اب یہاں برپا ہو رہا ہے۔ حضرت عثمان رضؓ نے ابوذر رضؓ کو بلایا۔ کعب احبارؓ نے ان سے بحث شروع کی کہ جب مال کی زکوٰۃ دے دی گئی تو اس کے جمع کرنے اور رکھنے میں کیا قباحت ہے۔

کعب احبار پہلے یہودی تھے۔ حضرت عمر رضؓ کے عہد میں اسلام لائے تھے۔ کتب سماوی کے عالم تھے اور قرآن کا بھی اچھا علم حاصل کیا تھا لیکن صحابی نہ تھے۔ حضرت ابو ذر رضؓ کو جو سابقین اولین میں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص تربیت یافتہ تھے ان کا اعتراض ناگوار معلوم ہوا۔ غصہ سے ڈنڈا لے کر اٹھے۔ کعب نے خوف سے بھاگ کر حضرت عثمان رضؓ کے پس پشت پناہ لی۔ مگر ڈنڈا ان کی پیٹھ پر پڑ گیا اور بحث ختم ہو گئی۔ حضرت عثمان رضؓ ادب کے مارے کچھ نہیں بولے۔ صرف یہ کہا "ہمارا فرض ہی یہ ہے کہ ہم بیت المال کا حق دولت مندوں سے وصول کر لیں۔ زہد اور ترک دنیا پر کسی کو مجبور نہیں کر سکتے"۔ لیکن حضرت ابوذر رضؓ کا خیال تھا کہ جب قرآن میں تصریح کے ساتھ حکم ہے کہ "(اے نبیؐ) لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کیا خرچ کریں۔ کہہ دے کہ جو کچھ بچ رہے" (سورۂ بقر رکوع ۲۷) (۲۱۹)

یعنی ہر مسلمان کے لئے لازم ہے کہ جو کچھ اس کے جائز اور ضروری اخراجات سے بچ رہے اس کو فی سبیل اللہ خرچ کر دے تو کسی کو پس انداز کر کے جمع رکھنے کا حق از روئے قرآن حاصل نہیں ہے۔ اور لوگ مجبور کئے جا سکتے ہیں، کیونکہ خلیفہ کا فریضہ ہے کہ ان کو قرآن کے مطابق چلائے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ سبائی فتنہ ملک کے صوبوں میں پھیلا ہوا تھا۔ بعض لوگوں نے حضرت عثمان رضؓ سے آکر کہا کہ ابوذر رضؓ عبداللہ بن سبا کے ورغلائے ہوئے ہیں مگر وہ حضرت ابوذر رضؓ کی طبیعت اور ان کے رتبہ سے اچھی طرح واقف تھے جانتے تھے کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں خلوص اور حقیقت پر مبنی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ "آج امر حق میں ملامت گروں کی طعن و تشنیع سے نہ ڈرنے والے صرف ابوذر رضؓ رہ گئے ہیں۔"

جب خلفشار بہت بڑھ گیا اس وقت حضرت عثمان نے ابوذرؓ سے کہا کہ مناسب یہ ہے کہ آپ مقام ربذہ میں (مکہ سے مدینہ کے راستے میں ایک طرف واقع ہے) جا کر رہیں۔ یہ سن کر وہ ربذہ میں چلے گئے۔ وہاں جا کر ایک خیمہ ڈال دیا اور اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ رہنے لگے۔ حضرت عثمانؓ نے جاتے وقت ان سے کہا کہ تمہارے گزارے کے لئے میں کچھ مویشی ساتھ کر دوں۔ انہوں نے قبول نہیں کیا۔ خود اپنے سالانہ وظیفوں میں سے جو کچھ ان کو ملا کرتا تھا کچھ اونٹ اور بکریاں خرید لیں۔ انہیں سے معیشت کا سامان حاصل کرتے تھے۔

سبائیوں نے یہاں آکر ان کو حضرت عثمانؓ کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی مگر انہوں نے سختی کے ساتھ ان کو ڈانٹا اور فرمایا کہ جو اپنے مقرر کئے ہوئے امام کی مخالفت کرے، اس کی توبہ بھی قبول نہیں ہوتی۔ میں حضرت عثمانؓ کی اطاعت کو نیکی اور ثواب اور ان کے حکم کی خلاف ورزی کو جرم اور گناہ سمجھتا ہوں۔

ذی الحجہ ۳۲ھ میں انہوں نے ربذہ ہی میں وفات پائی۔ حجاج کی ایک جماعت نے جو ادھر سے گذر رہی تھی، کفن دفن کا سامان کیا۔ اس جماعت میں حضرت عبداللہ بن مسعود بھی تھے۔ انہوں نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور مکہ میں پہنچ کر حضرت عثمانؓ کو جو حج کے لئے آئے تھے مطلع کیا، وہ واپسی میں ربذہ ہوتے ہوئے ابوذرؓ کی بیوی اور بیٹی کو اپنے ساتھ مدینہ لائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت اویس قرنیؒ

(نوشتہ ۱۹۳۴ء)

ملک یمن کے قبیلۂ مراد سے تھے جو مذحج کی ایک شاخ ہے۔ سلسلۂ نصب یہ ہے، اویس بن عامر بن جزء بن مالک بن عمرو بن سعد بن عصوان بن قرن بن رومان بن مراد

بیان کیا گیا ہے کہ عہدِ رسالتؐ میں موجود تھے۔ اپنی والدہ ماجدہ کی خدمت کی وجہ سے جو نابینا تھیں دربار نبوی میں حاضر نہ ہو سکے۔ اس وجہ سے صحابیت کے رتبہ سے محروم رہے۔ لیکن باتفاق علماء و صوفیائے کرام ان کا درجہ زہد و تقویٰ کے لحاظ سے تابعین میں سب سے بڑھ کر ہے۔ علقمہ کا بیان ہے کہ تابعین میں آٹھ اشخاص ہیں جن پر زہد منتہیٰ ہو گیا۔ عامر بن عبد القیس، اویس قرنیؒ، ہرم بن حیّان، ربیع بن ہشم، ابو مسلم خولانی حسن بصری، امام مسروق رحمہم اللہ[۲]

متعدد روایاتِ مرفوعہ بھی اس مضمون کی ہیں۔ ابن سعدؒ[۳] نے لکھا ہے کہ جنگِ صفین میں ایک شامی نے نکل کر پکارا کہ کیا تم (کوفہ والوں میں) اویس قرنیؒ ہے؟ لوگوں نے کہا کہ "ہاں" اس نے کہا کہ میں نے

---

[۱] ان کے حالات ابن سعد، حافظ ابو نعیم اصفہانی، حافظ ابن مندہ، امام یافعی اور امام ذہبی وغیرہ نے لکھے ہیں ادھر فارسی اور اردو کے اور اصفیا و اخیار و ابرار کے تذکروں میں بھی وہی باتیں کسی قدر تغیّر اور غیر معتبر اضافوں کے ساتھ درج کی گئی ہیں۔ اس لئے ان سے میں نے تعرض نہیں کیا اور صرف قدما کی روایات کو لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مضمون میں بہت سے دلچسپ قصے جو متأخرین نے لکھے ہیں نہیں آسکے۔

[۲] لیکن یہ تو صرف سات ہوئے۔ غالباً آٹھویں امام ابن سیرین ہوں گے مگر ذہبی کے نزدیک اس روایت کا سیاق ہی باطل ہے۔ (میزان الاعتدال)

[۳] طبقات جلد ۶ صفحہ ۱۱۲

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ اویس قرنیؒ تابعین میں سب سے بہتر ہیں، یہ کہہ کر گھوڑے کو میز لگائی اور آگر کو فیوں میں شامل ہو گیا۔

دوسری روایت سلام بن مسکین کے حوالہ سے اسی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اُمت میں میرا خلیل اویس قرنی ہے[1]

تیسری روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہے کہ جب انہوں نے اویسؒ سے فرمایا کہ "میرے لئے مغفرت مانگو" جواب دیا کہ "میں کیسے آپ کے لئے استغفار کروں، آپ تو صحابۂ رسولؐ میں سے ہیں" حضرت عمرؓ نے کہا کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ تابعین میں سب سے بہتر ایک شخص ہے جس کا نام ہے اویسؒ"۔

حافظ ابو نعیمؒ نے حلیۃ الاولیاء[2] میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اصحاب خاص کے حلقہ میں تھا۔ آپ نے فرمایا کہ کل تمہارے ساتھ ایک جنتی شخص نماز پڑھے گا" مجھے امید ہوئی کہ شاید وہ میں ہوں، سویرے مسجد میں گیا اور آنحضرتؐ کے پیچھے نماز پڑھی جب سب لوگ چلے گئے تو ایک سیاہ چہرہ مرد پیوند لگا ہوا تہہ بند باندھے ہوئے آیا۔ آنحضرتؐ سے مصافحہ کیا اور فرمایا یارسول اللہؐ میرے لئے دعا فرمائیے، حضورؐ نے اس کے لئے شہادت کی دعا کی۔ اس کے جسم سے مشک اذفر کی مہک آرہی تھی۔ میں نے پوچھا کہ "یہی وہ شخص ہے؟" فرمایا کہ "ہاں یہ غلام ہے اور فلاں خاندان کی ملکیت میں ہے۔" میں نے کہا "آپ اس کو خرید کر آزاد فرما دیتے" جواب دیا کہ "مجھے اس سے کیا جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جنت کے بادشاہوں میں سے بنا لیا ہے۔ اے ابو ہریرہؓ! جنت میں بھی ملوک اور سادات ہیں اور یہ حبشی جنت کے انہیں ملوک اور سادات میں سے ہے[3]۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے اُن پاک نفس، مخفی فرمانبرداروں کو پسند کرتا ہے، جن کے بال پریشان، چہرے خاک آلود اور شکم بجز کسب حلال کے بھوکے اور لاغر رہتے ہیں۔ امیروں کے یہاں جب وہ باریابی

---

[1] اس کے ساتھ صحیح بخاری کی یہ حدیث بھی یاد رہے "لوکنت متخذاً خلیلاً لاتخذت ابابکر خلیلاً"

[2] جزو اوّل قلمی صفحہ ۲۵۷

[3] حضرت فاطمہؓ اور ان کے دونوں بیٹے روایات کے مطابق سادات جنت میں سے ہیں۔

چاہتے ہیں تو نہیں ملتی، نازنینوں سے نکاح کا پیغام دیتے ہیں تو قبول نہیں کیا جاتا، غائب رہتے ہیں تو تلاش نہیں کئے جاتے، حاضر رہتے ہیں تو کوئی بات نہیں پوچھتا۔ نہ بیماری میں کوئی عیادت کو آتا ہے نہ مرنے کے بعد ان کے جنازہ میں شرکت کرتا ہے۔"

لوگوں نے پوچھا کہ "ایسا کوئی شخص ہم کو کیسے ملے؟" فرمایا کہ "ایسا شخص اویس قرنیؒ ہے۔" لوگ بولے کہ اویس قرنیؒ کون؟ کہا کہ "وہ بھورے بالوں والا، سرگیں چشم ہے۔ راست قد، بر کشادہ، رنگ مائل بسرخی، ٹھوڑی سینے سے لگی ہوئی۔ نظر نیچی۔ دایاں ہاتھ بائیں پر رکھے ہوئے قرآن کی تلاوت کرتا ہے، اور اپنے نفس پر روتا ہے، دو سے تیسرا لباس نہیں۔ ایک گلیمی تہ بند، ایک گلیمی رداء۔ زمین میں گمنام ہے مگر آسمان میں مشہور، اگر وہ اللہ پر قسم دلائے تو اللہ اس کو ضرور پوری کر دے۔ ہاں یاد رکھو، اس کے مونڈھے کے نیچے ایک ہتھیلی بھر کی سفیدی ہے۔ قیامت کے دن جب نیک بندوں سے کہا جائیگا کہ جنت میں جاؤ، اویسؒ کو حکم ہوگا ٹھہر جاؤ اور سفارش کرو، اس کی شفاعت سے ربیعہ اور مضر جتنے لوگوں کو اللہ بخش دے گا[1] اے عمرؓ اے علیؓ! جب تم اس سے ملنا تو درخواست کرنا کہ تمہارے لئے وہ مغفرت کی دعا کرے۔"

یہ دونوں حضرات اس کے بعد بیس سال تک اویسؒ کی تلاش میں رہے۔ یہاں تک کہ خلیفۂ ثانیؓ نے اپنی زندگی کے آخری سال میں حج کے موقع پر خود یمنی قبائل میں جا کر آواز لگائی کہ تم میں قبیلۂ مراد کا اویسؒ نامی کوئی آدمی ہے"؟ یہ سن کر ایک بڈھا شیخ لمبی ڈاڑھی والا اٹھا اور کہا کہ "ہم اویس کو تو نہیں جانتے البتہ میرا ایک بھتیجا اس نام کا ہے لیکن وہ گمنام اور بے مایہ ہے، یہ رتبہ نہیں رکھتا کہ امیرالمومنین کے پاس اس کا ذکر ہو، وہ ہمارے اونٹ چرانے کو لے گیا ہے" حضرت عمرؓ نے پوچھا کہاں ملے گا؟" بولا کہ میدان عرفات میں جہاں پیلو کا جنگل ہے"۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ دونوں اونٹ پر سوار ہوئے اور تیزی کے ساتھ وہاں پہنچے، دیکھا کہ وہ شخص ایک درخت کے سایہ میں نماز پڑھ رہا ہے اور اونٹ ارد گرد چر

[1] ربیعہ اور مضر دو نامی عدنانی قبائل ہیں، جن کی تعداد بڑی ہے اور جن کی شاخیں حجاز سے نجد تک پھیلی ہوئی ہیں۔ فارسی تذکرہ میں ہے کہ ربیعہ اور مضر کی بھیڑوں کے روئیں کے برابر اس اُمت کے اشخاص کو بخش دے گا، کاش یہ ہی صحیح ہو کہ اس سے تقریباً ساری اُمت کی بخشش ہو جائے گی اس لئے کہ ان قبائل کے پاس کثرت سے بھیڑیں تھیں۔

رہے ہیں [1]

ان لوگوں نے جاتے ہی سلام کیا۔ اویس رضؓ نے نماز کو ختم کیا اور جواب دیا "وعلیکم السلام" ان لوگوں نے پوچھا "تم کون ہو"؟ کہا "اونٹوں کا چرواہا، اور ساں کے مالکوں کا نوکر" بولے کہ "ہم نام پوچھتے ہیں" کہا کہ "عبد اللہ" فرمایا کہ "آسمان اور زمین کی کل چیزیں "عبد اللہ ہیں" ہم کو تمہارا وہ نام درکار ہے جو تمہاری ماں نے رکھا۔" کہا کہ "اس سے کیا مقصد ہے؟" فرمایا کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے اویس قرنی رحؒ کے اوصاف بیان کئے تھے جن میں سے بھورے بال اور سرمگیں آنکھیں تو ہم دیکھ رہے ہیں، اب تمہارے بائیں مونڈھے کے نیچے کوئی چمکتی ہوئی سفیدی ہو تو ہم کو دکھلا دو [2]، اگر ہوگی تو تم وہی شخص ہو۔ اویسؓ نے مونڈھا کھول کر اٹھایا، سفیدی نظر آئی۔ ان دونوں حضرات نے لپک کر اس کو چوم لیا اور کہا کہ "بیشک تم ہی اویس قرنی ہو۔ ہمارے لئے مغفرت مانگو، اللہ تمہاری مغفرت کرے گا۔"

اویس رضؓ نے کہا کہ "میں استغفار میں کسی کو مخصوص نہیں کرتا نہ اپنے کو نہ اولادِ آدم میں سے کسی اور کو، بلکہ جمیع مومنین و مومنات و مسلمین و مسلمات کے لئے خواہ بر میں ہوں یا بحر میں مغفرت طلب کرتا ہوں۔ پھر کہا، اللہ تعالیٰ نے میرا حال تو آپ دونوں پر ظاہر کر دیا۔ اب آپ اپنی بھی تعریف فرمائیے۔" حضرت علی رضؓ نے کہا کہ "یہ امیر المومنین عمر رضؓ ہیں اور میں علی بن ابن طالبؓ" یہ سن کر اویس رضؓ سر و قد کھڑے ہو گئے، سلام کیا اور کہا کہ "اے امیر المومنین، اللہ تعالیٰ آپ کو اس امت کی طرف سے، اور اے علی رضؓ! آپ کو اپنی ذات کی طرف سے جزائے خیر عطا کرے۔" حضرت عمر رضؓ نے فرمایا کہ "تم اسی جگہ رہو، میں مکہ میں جاتا ہوں اور تمہارے خرچ کے لئے کچھ عطیہ اور پہننے کے لئے کپڑا لاتا ہوں، دیکھو! اسی جگہ ملنا۔ اویسؓ نے جواب دیا کہ "میں ملنے کا وعدہ نہیں کرتا، اور آج کے بعد پھر آپ کی اور میری ملاقات بھی نہ ہوگی، مجھے عطیہ کی کیا ضرورت ہے اور میں کپڑے لے کر کیا کروں گا، میرے جسم پر کملی تہہ بند اور کملی رداء ہے، میرے پاؤں میں تسمہ دار جوتیاں ہیں جو چرائی کی مزدوری میں چار درہم بھی ملتے ہیں، یہ کافی ہیں، اے امیر المومنین! میرے اور نیز آپ کے آگے

---

[1] تذکرۃ الاولیاء میں ہے کہ اس کے اونٹوں کو فرشتہ چرا رہا ہے۔

[2] صحیح مسلم اور اسد الغابہ میں تصریح ہے کہ یہ برص کا داغ باقی رہ گیا تھا لیکن اردو تذکروں میں اس کے برخلاف یہ تصریح ہے کہ برص کا داغ نہیں تھا۔

ایسی پرخطر گھاٹی ہے جس کو وہی پار کر سکتا ہے جو لاغر میان، سبک بار اور چست گام ہو، اس لئے بوجھ ہلکا رکھئے اللہ آپ پر رحم کرے۔"

حضرت عمرؓ نے جب یہ بات سُنی تو اپنا دُرّہ زمین پر دے مارا اور چلا کر روئے کہ "کاش، عمر کی ماں عمر کو نہ جنتی، کاش وہ بانجھ ہوتی" اور.... اس کے بعد اویسؒ نے کہا کہ "امیرالمومنین آپ روانہ ہوں تو میں اس طرف جاؤں۔" حضرت عمرؓ مکہ کی سمت پلٹے، اویسؓ اونٹوں کو ہانکتے ہوئے ان کے مالکوں کے پاس لے گئے، چرائی سے معافی چاہی اور عبادت میں معروف ہو گئے۔

ابن سعد نے اسیر بن جابر کا یہ بیان لکھا ہے کہ کوفہ میں ایک محدث کے پاس ہم حدیث سننے کے لئے جمع ہوتے تھے۔ جب فراغت ہو جاتی تو سب لوگ چلے جاتے، صرف چند آدمی رہ جاتے تھے جن میں ایک شخص تھا جو ایسی باتیں کرتا تھا کہ دوسروں کے منہ سے میں نے نہیں سنیں۔ میرے دل میں اس کی محبت پیدا ہو گئی۔ ایک بار کئی روز تک میں نے اس کو حلقہ میں نہ دیکھا، اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ "فلاں شخص اس اس صفت کا جو ہماری جماعت میں شریک تھا وہ کہاں ہے؟" ایک نے کہا کہ "میں جانتا ہوں اس کا نام اویسؒ ہے"۔ میں نے کہا کہ "تم اس کی منزل سے بھی واقف ہو؟" کہا "ہاں" میں اس کے ساتھ گیا، حجرہ کا دروازہ کھٹکھٹایا، وہ اندر سے نکلے، میں نے کہا کہ "برادر آپ کیوں نہیں حلقہ میں آئے؟" بولے کہ "میرے پاس کپڑے نہیں ہیں" میں نے دیکھا کہ ان کے ساتھی ان پر آوازے کستے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ میں نے ان کو اپنی چادر دی اور کہا اس کو پہن لو۔ جواب دیا کہ "میرے ساتھی جب اس کو میرے بدن پر دیکھیں گے تو ہنسی اڑائیں گے اور ستائیں گے۔" میں نے اصرار کر کے وہ چادر ان کو دے دی، جب وہ نکلے تو اُن کے رفیق ہنسے اور کہا کہ "آج یہ چادر تم کہاں سے لائے ہو؟" انہوں نے آکر اس کو اتار دیا اور کہا کہ "تم نے دیکھ نہ لیا" میں نے جا کر ان لوگوں کو سختی کے ساتھ ڈانٹا اور کہا کہ "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ انسان کبھی برہنہ رہتا ہے، کبھی کپڑے پہنتا ہے۔

اتفاق ایسا ہوا کہ اسی درمیان میں کوفہ سے ایک وفد حضرت عمرؓ کی خدمت میں گیا۔ جس میں ایک شخص ان لوگوں میں سے بھی شامل تھا جو اویسؒ سے تمسخر کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے دریافت فرمایا کہ "تم میں سے کوئی قرن کا باشندہ ہے؟" وہ شخص جا کر سامنے کھڑا ہوا۔ انہوں نے کہا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ایک شخص تمہارے پاس یمن سے آئے گا، وہاں اس کی ماں کے سوا اور کوئی

اس کا نہ ہوگا اس کا نام ہے اویسؒ - اس کے بدن میں سفید داغ تھے، اللہ سے اس نے دعا کی کہ ان کو دور کردے، چنانچہ وہ جاتے رہے، صرف ایک درہم کے برابر باقی رہ گیا ہے. سو تم میں سے جو کوئی اُس سے ملے اپنی مغفرت کی دعا کرائے۔

حضرت عمرؓ نے کہا کہ "جب وہ شخص آیا میں نے اس سے پوچھا کہ "کہاں گھر ہے"؟ بولا "یمن" پوچھا "نام کیا ہے"؟ کہا "اویس" دریافت کیا کہ "وطن میں کس کو چھوڑا"؟ جواب دیا "صرف اپنی ماں کو" پوچھا کہ "کیا تمہارے جسم پر سفید داغ تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری دعا سے دور کردیا" بولا کہ "ہاں" میں نے کہا کہ "میرے لئے مغفرت کی دعا کرو" اس نے پہلے کہا کہ "مجھ جیسا شخص آپ جیسے بزرگ اور امیرالمومنین کے لئے مغفرت کا طالب ہو؟" پھر میرے لئے مغفرت کی دعا کی، میں نے کہا کہ "تم میرے بھائی ہو، میرا ساتھ نہ چھوڑنا لیکن وہ غائب ہوگیا، اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ تمہارے ساتھ کوفہ میں ہے" یہ سن کر وہ شخص جو اویسؒ کی ہنسی اڑاتا تھا امیرالمومنین سے کہنے لگا کہ "ہم میں تو ایسا آدمی نہیں ہے" انہوں نے فرمایا ضرور ہے" اس نے جواب دیا کہ "ہاں ایک آدمی اس نام کا ہے لیکن اس سے ہم مذاق کرتے رہتے ہیں" امیرالمومنین نے فرمایا کہ "اس سے ملنا، مگر مجھے امید نہیں کہ تم اس کو پاؤ گے"

جب وہ شخص کوفہ میں واپس آیا، اپنے گھر میں جانے سے پہلے اویسؒ کے پاس حاضر ہوا۔ انہوں نے کہا کہ "یہ تو تمہارا دستور نہ تھا" بولا کہ "میں نے امیرالمومنین سے تمہاری نسبت ایسی ایسی باتیں سُنیں۔ اب تم میرے لئے مغفرت کی دعا کرو" اویسؒ نے کہا کہ "بشرطیکہ تم میرے ساتھ تمسخر چھوڑ دو اور جو کچھ حضرت عمرؓ سے سُن کر آئے ہو اس کا کسی سے تذکرہ نہ کرو"۔ پھر اس کے واسطے استغفار کیا۔

اسیر بن جابرؒ کہتے ہیں کہ اس کے بعد کوفہ میں شہرت ہوگئی۔ میں ان کے پاس گیا اور کہا کہ "یہ کیسی عجیب وغریب باتیں تمہاری نسبت مشہور ہو رہی ہیں" بولے کہ "میری طرف سے تو کوئی بات پھیلائی نہیں گئی ہے۔ ہر شخص کو اس کے عمل کا بدلہ ملے گا" دوسرے سال اشراف کوفہ میں سے ایک شخص حج کے موقع پر حضرت عمرؓ سے ملا۔ انہوں نے اس سے اویسؓ کی بابت پوچھا کہا کہ "میں نے ان کو اس حال میں چھوڑا تھا کہ ان کے پاس کچھ نہ تھا اور وہ بالکل بے مایہ تھے۔" حضرت عمرؓ نے وہی باتیں جو اس سے پہلے لکھی گئی ہیں بیان فرمائیں اور اس شخص کو ترغیب دلائی کہ ان سے مغفرت کی دعا کرائے، جب وہ واپس آیا تو اویسؒ سے مغفرت کی دعا کا طالب ہوا۔ انہوں نے کہا کہ "تم ایک متبرک سفر سے واپس آئے ہو،

حق تمہارا ہے کہ دعا کرو" پھر اس سے پوچھا کہ "کیا تم عمرؓ سے ملے تھے؟" اس نے کہا "ہاں" اس پر حضرت عمرؓ کے لئے بھی مغفرت کی دعا کی اور اس کے واسطے بھی۔ لوگوں میں اس کا چرچا ہونے لگا، اس وجہ سے وہ کوفہ سے چلے گئے۔

ایک بار قبیلہ مراد کا ایک شخص ان کے پاس آیا، پوچھا کہ "اویسؒ کا کیا حال ہے؟" بولے کہ "اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو جو صبح ہوتی ہے تو شام کی امید نہیں رکھتا اور شام ہوتی ہے تو صبح کی۔ موت کی یاد مومن کے دل میں کوئی خوشی نہیں چھوڑتی اور حقوق اللہ کی معرفت سے کوئی درہم و دینار اس کے پاس نہیں رہتا اور اس کے احکام پر قائم رہنے سے کوئی دوست بھی باقی نہیں رہ جاتا، کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے لوگ ہم کو اپنا دشمن سمجھنے لگتے ہیں، اور نافرمان بندے ان کی مدد پر کھڑے ہو جاتے ہیں اسی کی بدولت بڑی بڑی تہمتیں انہوں نے مجھ پر لگائیں۔ لیکن پھر بھی میں امرالٰہی کی بجاآوری سے باز رہنے والا آدمی نہیں ہوں۔"

ابن زید کہتے ہیں کہ اویسؒ کی عبادت بھی غیر معمولی تھی۔ کبھی کہتے کہ یہ سجدہ کی رات ہے اور تمام شب سجدہ میں گذار دیتے اور کبھی کہتے رکوع کی رات ہے اور تمام رات رکوع میں رہتے۔ ہر شام کو جو کچھ کھانا یا کپڑا ان کے گھر میں بچتا صدقہ کر دیتے۔ پھر کہتے کہ اے اللہ اگر کوئی بھوکا مرے یا ننگا رہے، مجھ پر اس کا مواخذہ نہیں۔

مغیرہ کہتے ہیں کہ اویس قرنیؒ اپنے کپڑوں کو خیرات کر دیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنے حجرہ میں برہنہ بیٹھے رہتے تھے اور کوئی کپڑا ان کے پاس نہیں بچتا تھا جس کو پہن کر جمعہ میں شریک ہو سکیں۔

حلیۃ الاولیاء میں یہ مرفوع روایت بھی درج ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میری اُمت میں ایسے لوگ ہیں جو عریانی کی وجہ سے مسجد میں نہیں آسکتے، بوجہ اس کے کہ وہ فقراء کے سوال پر اپنے کپڑے بخش دیتے ہیں۔ ان میں سے اویسؓ قرنی اور فرات بن حیان ہیں۔

ہرم بن حبان بیان کرتے ہیں کہ "جب میں کوفہ میں پہنچا تو میرا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اویسؓ سے ملوں۔ تلاش کرتے ہوئے فرات کے کنارے گیا، دیکھا کہ اپنے کپڑے دھو رہے ہیں۔ میں نے علامات سے پہچان لیا۔ چہرہ گندم گوں، گھنی ڈاڑھی، رعب دار صورت، سلام کیا اور ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے مصافحہ سے انکار

کیا۔ مجھے ان کا حالِ زار دیکھ کر رونا آگیا۔ پوچھا کہ "اے اویسؒ تمہارا کیا حال ہے؟" کہا کہ "اے ہرم تم کو میرا نام کس نے بتایا؟" میں نے کہا "اللہ نے اور آپ نے مجھے کیسے پہچان لیا۔ کیونکہ اس سے پہلے کبھی شناسائی نہ تھی۔" بولے "میری روح نے تمہاری روح کو پہچان لیا، اور میری جان تمہاری جان سے ہمکلام ہوئی۔ جسطرح روح میں بھی جان ہے اور مومنین روحِ الٰہی کے وسیلہ سے باہم شناسائی رکھتے ہیں گو ان کے درمیان بُعدِ مکان اور دوریٔ منزل حائل ہو۔"

پھر میں نے کہا کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث روایت کرو، تاکہ میں اس کو یاد رکھوں" فرمایا کہ "مجھے دیدار نصیب نہیں ہوا، ہاں ان لوگوں سے ملا جو آپ کی صحبت میں بیٹھے تھے اور ان کے توسط سے وہ حدیثیں بھی سُنیں جو تم لوگ سنتے ہو۔ لیکن میں محدث نہیں اور نہ قاضی و مفتی بننا چاہتا ہوں مجھے میرے نفس کا شغل ہی بہت ہے۔"

میں نے کہا "تو پھر کتاب اللہ کی کوئی آیت ہی سنائیے اور کچھ وصیت فرمائیے"۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرات کے کنارے چلے اور کہا کہ "میرے رب کا قول ہے اور اسی کا قول حق ہے۔ میرے رب کی حدیث ہے اور اسی کی حدیث سچی ہے۔ میرے رب کا کلام ہے اور اسی کا کلام بہتر ہے" اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ان یوم الفصل میقاتھم اجمعین" یہ پڑھ کر اس طرح روئے کہ مجھ کو گمان ہوا کہ ان کو غشی آگئی، پھر انہوں نے اس کے آگے کی آیت پڑھی اور میری طرف دیکھا اور کہا کہ "اے ہرم! تیرا باپ مر گیا اور تو بھی عنقریب مرے گا، پھر جنت میں جائیگا یا دوزخ میں، آدمؑ بھی مر گئے، حواؑ بھی مر گئیں، ابراہیم خلیل الرحمٰن بھی، موسیٰؑ بھی اور محمدؐ بھی۔ سب پر اللہ کی سلامتی ہو، ابوبکر صدیقؓ خلیفۃ المسلمین بھی مر گئے۔ اور میرے بھائی، میرے دوست اور یار حضرت عمرؓ بھی۔ ہائے عمر! ہائے عمر! ہائے عمر!

ہرم کہتے ہیں کہ یہ حضرت عمرؓ کی خلافت کا آخری زمانہ تھا۔ میں نے کہا کہ "وہ تو نہیں مرے ہیں بلکہ زندہ ہیں۔" کہا کہ "نہیں مر گئے۔ اللہ نے ان کی موت کی خبر مجھ کو دے دی۔" پھر انہوں نے دعا کی اس کے بعد فرمانے لگے "اے ہرم! میں تم کو کتاب اللہ کی وصیت کرتا ہوں اور موت کو یاد دلاتا ہوں، اسے کبھی نہ بھولنا۔ جب واپس جانا تو اپنی قوم کو بھی سکھانا اور اپنی جان پر زحمت اٹھانے میں دریغ نہ کرنا۔ جماعت کا ساتھ ہرگز نہ چھوڑنا ورنہ دین ہاتھ سے جاتا رہے گا اور تمہیں خبر بھی نہ ہوگی، اور جب مر گئے تو قیامت کے دن دوزخ میں جانا ہوگا" پھر منہ اوپر کو اٹھایا اور کہا کہ "اے اللہ! اس کا خیال یہ ہے کہ یہ میرے ساتھ خالص

تیرے لئے محبت رکھتا ہے اور اسی وجہ سے ملنے آیا ہے۔ اس کو جنت میں داخل کرنا کہ وہاں بھی میری زیارت کو آئے، اس کو تھوڑی دنیا پر رضا مند رکھنا اور عافیت دنیا اور نعمتوں کا شکر گزار بنانا۔ اے ہرم اللہ حافظ، آج کے بعد پھر میں تم کو نہ دیکھوں کہ تم میری جستجو میں ہو۔ نہ میری بابت کسی سے سوال کرنا، میں تم کو یاد رکھوں گا اور انشاء اللہ تمہارے حق میں دعا کرتا ہوں گا" یہ کہہ کر وہ میرا ساتھ چھوڑ کر ایک طرف نکل گئے اس وقت سے پھر نہ میں نے ان کو دیکھا نہ ان کی خبر سُنی۔[1]

حافظ ابو نعیم، عبداللہ بن سلمہ کی روایت لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں ہم آذربیجان کی جنگ میں گئے تھے، اویسؒ بھی ساتھ تھے، واپسی میں بیمار ہوئے ہم نے ان کو سواری پر اُٹھالیا۔ آخر وہ گذر گئے۔ جہاں ان کی نعش اتاری وہاں دیکھا کہ ایک قبر کھُدی ہوئی ہے اور حنوط موجود ہے۔ نہلا کر نماز جنازہ پڑھی اور دفن کر دیا۔ جب آگے بڑھے تو خیال کیا کہ ان کی قبر پر کوئی نشان بنا دیں، پلٹ کر آئے تو نہ وہاں قبر تھی نہ اس کا کوئی اثر۔[1] اسی کے بعد وہ ایک دوسری روایت لکھتے ہیں کہ اویسؓ جنگ صفین میں موجود تھے۔

امام ذہبیؒ بھی فضیل بن عیاضؒ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے جبکہ وہ مقام منا میں منبر پر تھے، اہل یمن کو پکارا، وہ لوگ جاگ کر سامنے کھڑے ہوئے، پوچھا کہ "کیا تم میں کوئی شخص اویسؓ نامی ہے؟" ایک نے جواب دیا کہ ایک دیوانہ شخص اس نام کا ہے جو صحرا اور بیابان میں پڑا پھرتا ہے۔ کہا کہ "میں اسی کو پوچھتا ہوں جب تم واپس جانا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اور میری طرف سے سلام پہنچا دینا" جب ان لوگوں نے جا کر اویسؓ کو سلام پہنچایا تو انہوں نے کہا کہ "امیر المومنین نے میری تشہیر کر دی" اس کے بعد غائب ہو گئے۔ حضرت

---

[1] میزان الاعتدال میں امام ذہبیؒ نے بھی ایک روایت لکھی ہے کہ اویسؒ نے غزوۂ آذربیجان میں انتقال فرمایا اور ان کے ہمراہی ان کی قبر کھودنے کے لئے لوٹنے پڑتے تھے۔ اولاً تو اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے قبر کھودی تھی نہ کہ غیبی گورکنوں نے۔ ثانیاً اگر امام ذہبیؒ اور حافظ ابو نعیم کی روایتیں تسلیم کی جائیں کہ حضرت اویسؒ نے جنگ آذربیجان میں جو ۲۲ھ میں حضرت عمرؓ کے عہد میں ہوئی تھی انتقال فرمایا تو جنگ صفین میں جو ۳۷ھ میں ہوئی وہ کیسے شریک ہو سکتے تھے۔

علیؓ کے عہد میں ظاہر ہوئے اور جنگ صفین میں ان کے ساتھ شرکت کی اور اسی میں شہید ہوئے۔ دیکھا گیا تو جسم پر چالیس سے زیادہ زخم تھے۔ [۱]

ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ اویس ثقہ ہیں گو اُن سے کوئی حدیث مروی نہیں۔

امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں اویسؒ کو باصطلاح محدثین "فی اسنادہ نظر" کہہ کر مجروح کیا ہے اس پر امام ذہبیؒ میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں کہ اویسؒ نے تو کوئی روایت ہی نہیں کی ہے جو ان کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کی بحث اٹھائی جائے، اگر امام بخاریؒ نے ان کو ضعفاء میں نہ لکھا ہوتا تو میں قطعاً ان کا ذکر ہی نہ کرتا کیونکہ وہ اولیاء صادقین سے ہیں [۲]

بعض لوگ ابراہیم بن ادھمؒ کے وجود کی طرح اویسؒ کے وجود کے بھی منکر ہیں کیونکہ ان کی قوم مراد سے جب اویسؒ کی بابت سوال کیا گیا تو انھوں نے اپنے قبیلہ میں کسی ایسے شخص کے وجود سے انکار کیا۔ امام ابواسحٰقؒ اور عمرو بن مرہؒ سے بھی جب دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ ہم اویسؒ کو نہیں جانتے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بھی ان کے وجود کے منکر تھے اور فرماتے تھے کہ ایسا کوئی شخص نہیں گزرا ہے۔

امام ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ اویسؒ کی اس قدر شہرت ہے کہ اُن کے وجود میں شک کی گنجائش نہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ علم عدم علم پر مرجح ہے۔ ممکن ہے کہ ان منکرین کو ان کی بابت علم نہ پہنچا ہو۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام روایات جو اویسؒ کے متعلق مذکور ہوئیں باہم متضاد اور بوجہ ضعف یا مجہولیت رواۃ کے غیر موثق ہیں اور درایتاً مجہولیت اور اختلاق کے آثار ان پر اس قدر ہویدا ہیں کہ کسی بیان یا بحث کی حاجت نہیں۔ صرف اسیر بن جابر والی روایت اصولاً قوی ہے کیونکہ تین طرق سے صحیح مسلم میں مروی ہے لیکن آئمۂ حدیث میں ان کا نام ہی محل بحث ہے کہ اسیر ہے یا یسیر اور ابن جابر ہے یا

---

[۱] صحابہ کرام میں سے حضرت عمار بن یاسرؓ جن کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی "تقتلہ الفئۃ الباغیۃ" حدیث میں وارد ہے، جنگ صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے اب بروایت زید بن علیؓ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ تابعین کے سرتاج اور ولی کامل حضرت اویسؒ بھی شریک تھے۔ جن کی وجہ سے بعض حق پسند شامی کوفیوں میں آکر شامل ہو گئے تھے۔

[۲] میزان الاعتدال میں انھیں لوگوں کا تذکرہ ہے جن پر کسی نہ کسی حیثیت سے جرح وارد ہوئی ہے۔

ابن عمرو۔ پھر امام ابن حزم ؒ نے تصریح کی ہے کہ وہ قوی راوی نہیں ہیں۔ ایسی حالت میں امام مالک ؒ کا انکار کچھ معنی رکھتا ہے، خاص کر اس وقت جبکہ خود اویس ؓ کی قوم بھی انکاری ہے۔

صوفیوں میں ایک فرقہ اویسیہ تھا جو حضرت اویس ؓ کی طرح نبوت سے بلاواسطہ فیض حاصل کرنے کا مدعی تھا۔ اکثر اس میں صاحبِ حال ہوتے تھے جو وجد میں رقص کرتے تھے مگر تھوڑی ہی مدت میں یہ طائفہ ختم ہو گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صباح

(از رسالہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ جون سنہ ۱۹۳۶ء)

دسویں صدی ہجری کے اوائل میں مصری تختِ حکومت پر چرکسی ممالیک تھے جن کی سلطنت کے حدود سواحلِ نیل سے شام کے جبالِ طورس تک پھیلے ہوئے تھے۔ سنہ ۹۰۶ھ مطابق سنہ ۱۵۰۲ء میں ملک اشرف قانصوہ غوری سریرِ سلطنت پر آیا۔ جس کی شجاعت اور بہادری کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے امراءِ فوج تمامتر ممالیک تھے۔ بجز بادیۂ شام کے ایک عربی نوجوان کے جس نے سلطان مذکور کے پاس اطاعت کا عہد کیا تھا اس لئے قصر کے محافظ دستہ کا سردار مقرر کردیا گیا تھا اس کا نام ہانی تھا۔

سلطانی حرم میں ایک پندرہ سالہ عربی دوشیزہ آئی جس کی پیشانی سے نور اور آنکھوں سے جادو ٹپکتا تھا۔ اس کا نام صباح تھا۔ شام کا امیر خیر بک نے بغاوت کے جرم میں اس کے قبیلہ پر چڑھائی کی تھی۔ اسیروں میں یہ بھی ملی جس کو سلطان کے لئے موزوں سمجھ کر قصرِ شاہی میں بھیجدیا۔ یہ صحرا اور بیابان کی ہرنی اس محلسرا کو اپنے لئے قفس سے کم نہ سمجھتی تھی اور نوگرفتار پرند کی طرح تڑپتی تھی کہ کب کوئی راستہ پائے اور اڑ جائے۔

اس نے قصر میں کچھ اپنے ہمدرد پیدا کیے جن میں سے ہانی بھی تھا۔ عربی غیرت اور حمیت کی وجہ سے وہ اس کی رہائی کی کوشش میں لگ گیا مگر سخت احتیاط رکھی کہ سلطان کو کسی طرح اس کی خبر نہ ہوسکے۔

آخر کار یہ اپنی مخفی تدبیروں سے چند مہینوں میں اس کو قصر سے نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ صباح ایک بدکے ہوئے وحشی شکار کی طرح صحرائے سینا، جبالِ لبنان اور بادیۂ حمص وحماۃ سے گھوڑے کی پشت پر اڑتی ہوئی شام میں اپنے قبیلہ میں آگئی۔

ہانی نے اس کو خلاصی تو دلوادی مگر اس کے چلے جانے کے بعد اس کو محسوس ہوا کہ دل کا سکون یک لخت کھوگیا۔ دراصل اس کو صباح کے ساتھ محبت ہوگئی تھی جو گھڑی دو گھڑی کی پیداوار نہ تھی۔ بلکہ

مہینوں کی تھی۔ جس کی جڑیں اس کے دل کی رگوں میں پیوست ہو چکی تھیں۔ تقاضائے عشق اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ اس کی جستجو میں نکلے۔

ملک قانصوہ کی عمر اس وقت ۸۰ سال کی ہو چکی تھی۔ پیری نے جسم میں تازگی اور چہرہ پر رونق نہیں چھوڑی تھی مگر باوجود اس کے صباح کے دیدار سے محرومی اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ وہ بے تاب ہو گیا۔ اس نے غصہ میں قصر کے چار دربانوں اور خادموں کو جن کے اوپر اس کے بھگانے کا شبہ ہو سکتا تھا اپنے سامنے قتل کرایا لیکن اس سے صرف انتقام کے جذبہ کو تسلی ہوئی۔ عشق کی آگ نہ بجھ سکی۔

اس کے دل میں کبھی بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آسکا کہ وفادار ہانی بھی اس میں شریک ہو سکتا ہے۔ اس لئے اسکو بلایا اور کہا کہ تم بھی شام کے رہنے والے ہو، جاؤ اور جہاں سے مل سکے اس کو ڈھونڈ کر لاؤ، ہانی تو خود یہی چاہتا تھا۔ روانہ ہو گیا۔

۹۲۳ھ مطابق ۱۵۱۶ء یہی وہ سنہ ہے جس میں نیزوں کے قلم اور خون کی روشنائی سے تاریخ کے وہ صفحات لکھے گئے جنہوں نے ماضی اور مستقبل میں ایک حد فاصل قائم کر دی۔ یعنی اسی سال سلطان سلیم اول نے خود ترکی فوجوں کو لیکر شام اور مصر پر حملہ کیا اور وہ وقت آگیا کہ مصری سلطنت عثمانی مقبوضات میں شامل ہو جائے دونوں طرف سے ایک مہیب اور فیصلہ کن جنگ کی تیاری تھی۔

اس وقت ہانی بدو کہاں تھا؟ حسن کے گلزار میں عشق کے راگ الاپ رہا تھا۔ اس نے اپنی محبوبہ کو تلاش کر لیا تھا وہ اس کے حبالہ نکاح میں آچکی تھی اور دونوں کے قبیلوں میں اس رشتہ کی وجہ سے باہمی امداد اور محالفت کا عہد ہو چکا تھا۔

جب شام کے گوشہ گوشہ میں نفیر عام کی صدائیں بلند ہوئیں تو قبائل بادیہ کے سامنے دو صورتیں تھیں ادھر شامل ہوں یا ادھر۔ عربی نخوت مملوکوں کی حکومت سے بیزار تھی۔ علاوہ بریں ترکی قوت کا پلہ بھاری نظر آتا تھا۔ ہانی اور صباح کے قبیلے ایک جگہ جمع ہوئے اور شیوخ مشاورت کے لئے بیٹھے۔ جن کے بیچ میں صباح بھی تھی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ عثمانیوں کا ساتھ دینا چاہیئے۔

ہانی سلطان مصر کا وفادار غلام تھا اس کے لئے یہ موقع سخت آزمائش کا تھا شیوخ قبیلہ سے درخواست کی کہ ابھی اس کو ملتوی رکھئے اور مجھے اجازت دیجئے کہ میں سلطان کے حوصلوں اور اس کی فوجی قوتوں کا حال خود اپنی آنکھوں سے دیکھ آؤں۔ اس کے بعد جو کچھ مناسب ہو گا کیا جائے گا۔ اس کی

یہ بات سنی گئی اور وہ ایک مہینہ کی مہلت لے کر روانہ ہو گیا۔

ایک مہینہ گزر گیا، دوسرا مہینہ بھی گزر گیا، خبریں برابر پہنچ رہی تھیں کہ سلطان مصر سے اپنی فوجیں لے کر چل پڑا ہے مگر ہانی نہیں آیا۔ وہ غریب تو وہاں پھنس گیا تھا۔ پہنچنے کے ساتھ ہی سلطان نے جب اس کو دیکھا تو گلے سے لگایا اور ایک فوج کی قیادت دے کر اپنے ساتھ لے لیا۔ مدت العمر کا ملازم وفاداری کا حلف اٹھائے ہوئے انکار کی تاب نہ لا سکا۔

یہاں شیوخ و روٗسا ء قبائل نے انتظار کی حد ختم ہو جانے کے بعد پھر مجلس مشاورت منعقد کی، صباح درمیان میں اپنے بالوں کو کھول کر کھڑی ہو گئی اور پکار کر کہنے لگی کہ ہانی اب تک نہیں آسکا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس بوڑھی مکار لومڑی مملوک سلطان نے تمہارے شیر کے ساتھ دغا کی۔ اب خون کو خون ہی سے دھونا لازم ہے چنانچہ دونوں قبیلے صباح کی قیادت میں عثمانی فوج میں جا کر شامل ہو گئے اور ترکوں کے دوش بدوش جنگ میں مشغول ہو گئے۔

۲۴۔ اگست ۱۵۱۶ء کو مصری فوجوں نے خوب جم کر مقابلہ کیا۔ قانصوہ اگرچہ اسّی سال کا بڈھا تھا مگر اس نے ایسی بے نظیر شجاعت دکھلائی کہ تاریخ اس کو ہمیشہ یاد رکھے گی۔ اس کے بے پناہ حملوں سے عثمانیوں کے دل چھوٹ گئے لیکن خیانت کا کیا علاج۔ اس کے بڑے امیروں خیربک اور غزالی نے غداری کی اور ترکی سلطان سے مل گئے۔ جس کی وجہ سے اس کی قوت کمزور ہو گئی۔ وہ لڑتے ہوئے میدان جنگ میں گھوڑے سے گرا اور اس کی لاش کا پتہ نہ مل سکا۔ مصری شکست کھا گئے اور شام و مصر کے ملکوں کے ساتھ ان کی ساری فوجیں بھی عثمانیہ ہو گئیں۔ ہانی کے قبیلہ والوں نے مصری فوج میں ہانی کو لڑتے ہوئے دیکھا تھا اس کو ڈھونڈ کر گرفتار کیا اور مشکیں باندھ کر لائے۔

دونوں قبیلے ایک مجلس میں جمع ہیں، وسط میں صباح کھڑی ہوئی ہے۔ وہ حسن کہ جو نظر جاتی تھی سجدے میں گر پڑتی تھی، پیشانی سے عمیق فکر مگر متانت اور سنجیدگی کے نیچے دبی ہوئی نظر آتی تھی کیونکہ آج کی مجلس میں ایک مجرم کا معاملہ پیش ہونے والا ہے۔ وہ مجرم جو اس کے دل کا مالک اور اس کی خوشیوں کا مرکز رہ چکا ہے۔

مجرم بندھا ہوا لایا جاتا ہے۔ صباح کو دیکھتے ہی اس کی نظریں نیچی ہو جاتی ہیں۔ وہ اس کو مخاطب کر کے بلند آواز سے کہتی ہے کہ کل تم نے میرے لئے سلطان سے غداری کی تھی اور آج اس کے لئے مجھ سے بلکہ

سارے قبیلہ سے غداری کی۔ بتاؤ کیا جواب ہے؟ یہ شیورخ اس کو سننے کے بعد تمہارے متعلق فیصلہ دیں گے" بیکار تھے ہانی کے عذرات، بالکل فضول، خائن کی نجات قتل سے ناممکن۔ یہی ہوا اور اس کے سوا کیا ہوتا۔

ہانی کی محبت کی بنیاد خیانت پر تھی اور خیانت ہی کے جرم میں وہ مارا بھی گیا۔ پہلی خیانت جس کا علم خود سلطان کو بھی نہ ہوا دوسری خیانت جس کا دراصل وہ مرتکب ہی نہ تھا۔

صباح کے دل پر جو کچھ بھی گزری ہو مگر وہ آخر دم تک ان قبائل کی قیادت کرتی رہی۔ اس کی شہامت اور بسالت دور دور تک مشہور ہو گئی، وہ ہر جنگ میں آگے رہتی تھی۔ اس کا نام ایسا مقبول ہوا کہ ہر عربی عورت جو لڑائی میں اپنے قبیلہ کی قیادت کرتی ہے آج تک اسی کے نام سے "صباح" کا لقب پاتی ہے جیسے ہر سخی حاتم کا۔

حلیمہ نجدیہ

(از رسالہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ مئی ۱۹۳۶ء)

"آج سے ۱۰ سال پہلے جب نجدیوں نے شریف حسین کے تسلط سے ارض حرم کو پاک کیا تھا، ہندوستان میں ان کی تاریخ کی مانگ ہوئی تھی۔ اس وقت میں نے تاریخ نجد لکھ کر شائع کی تھی جو اُردو زبان میں وہابی تحریک کی پہلی اور صحیح تاریخ ہے۔ ہر چند کہ میں ابتداء سے ان کے حالات کا مطالعہ کرتا چلا آتا تھا مگر اس کتاب کے لکھنے کے بعد سے ان کی تاریخ میرا دلچسپ موضوع ہے۔ اس درمیان میں مصر اور شام سے ان کے متعلق متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں جن سے میرے علم میں اضافہ ہوا ہے۔ اُمید ہے کہ اس تاریخ کے طبع ثانی میں اس کو شامل کر سکوں گا۔ ان جدید معلومات میں سے ایک دلکش واقعہ سپرد قلم کرتا ہوں۔

تمہید کے طور پر پہلے یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ نجدیوں کو جس نے مغلوب کیا تھا وہ محمد علی پاشا خدیو مصر اور اس کا فرزند ابراہیم پاشا تھا جو اپنے وقت کا بے نظیر سپہ سالار تھا۔ ان باپ بیٹوں نے ترکی سلطان محمود ثانی کے حکم سے نجدیوں کو تباہ کیا تھا۔ قدرت کا انتقام دیکھئے کہ اس کے بعد انہیں دونوں نے خود سلطان مذکور سے جنگ شروع کی۔ ابراہیم پاشا سلسلہ وار ترکوں کو شکست دیتا ہوا چلا گیا۔ یہاں تک کہ قونیہ میں پہنچ کر ان کی ساری طاقت توڑ دی جس سے آستانہ میں خطرہ پیدا ہو گیا کہ ترکی سلطنت صفحۂ وجود سے مٹ جائے گی۔ مجبوراً سلطان محمود ثانی نے مصر اور شام پر محمد علی کی سلطنت بالاستقلال نسلاً بعد نسل تسلیم کی۔ اب ابراہیم پاشا شام کے انتظام کے لئے اپنی ستر ہزار فوج لئے ہوئے انطاکیہ میں آگیا اور اس کے صوبوں میں اپنے مخلص اور وفادار اُمراء میں سے چن چن کر نائب مقرر کئے۔ شریف پاشا کو "حکمدار عربستان" کا لقب دے کر فلسطین بھیجا۔ سلیمان پاشا فرنسوی کو صیدا، اسماعیل بک کو حلب اور احمد منیکلی پاشا کو ادرنہ وغیرہ وغیرہ اور امیر بشیر شہابی کبیر کو جو اس کا خاص حلیف تھا اس کی ریاست لبنان پر برقرار رکھا۔

ابراہیم پاشا کی انتظامی قابلیت مسلم اور عدل و داد کی عام شہرت تھی۔ لوگوں نے امن و اطمینان کا سانس لیا اور آرام کے ساتھ رہنے لگے۔ پاشا ایک بار دورہ کے لئے اٹھا کہ رعایا کی حالت اپنی آنکھوں

ایک تذکرہ نویس نے تو یہاں تک جرأت کی ہے کہ خسرو اور مولانا جامی کے بعض اشعار جو نظامی سے لڑ گئے ہیں یا ہم مضمون ہیں اس کی وجہ سے لکھا ہے کہ

"خانۂ شعر و شاعری نظامی گنجوی تاراج کردہ مولوی جامی و امیر خسرو دہلویست"[1]

اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں کی مثنویوں میں کوئی عنوان ایسا نہیں جس میں نظامی کا ایک آدھ شعر یا مصرعہ نہ آگیا ہو، مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ نظامی کا کلام ان کی مزاولت میں کثرت سے رہتا تھا اور اس کی ترکیبیں اور جملے ان کی زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ علاوہ بریں ناسخین نے بھی ان بزرگوں کے کلام کو جابجا خلط ملط کر دیا ہے۔

ان سب رایوں کے پڑھنے کے بعد یہ صاف واضح ہو جاتا ہے کہ مخزن الاسرار کا میدان نہایت سنگلاخ اور دشوار گذار تھا۔ اور سوائے امیر خسرو اور مولانا جامی کے کوئی بھی نظامی کا تتبع نہیں کر سکا۔

امیر ہاشمی کرمانی نے اس بات کو اپنی مثنوی مظہر الآثار کے دیباچہ میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے ہم اس جگہ مختصراً اس کو درج کرتے ہیں۔

نقش کنم بر ورق روزگار   وصف ہنرمندی مردان کار
ہم نفسان دم روح الامیں   نکتہ سرایان سخن آفریں
خاصہ حکیمی کہ بسحر حلال   بست زبان ہمہ اہل کمال
شیخ نظامی در دریائے جود   گوہر شہوار محیط وجود
چہرہ کشائے صور معنوی   مخترع خال و خط مثنوی
نکتہ سرائے کہ بحسن کلام   ملک سخن یافت ز نظمش نظام

---

[1] کسی حاسد نے مولانا جامی کو جب وہ حج کو جا رہے تھے ان اشعار میں مخاطب کیا ہے۔

اے باد صبا بگو بجامی   کاے دزد سخنوران نامی
بردی اشعار کہنہ و نو   از سعدی و انوری و خسرو
اکنون کہ سر حجاز داری   واہنگ حجاز ساز داری
دیوان ظہیر فاریابی   در کعبہ بدزد اگر بیابی

سے دیکھے ، ہر جگہ اس کا استقبال جوش ، خوشی اور مسرت کے ساتھ کیا گیا ۔ حلب میں پہنچ کر وہاں کے شاہی قلعہ میں قیام کیا ۔ ایک دن عربی سواروں کا ایک مختصر دستہ قلعہ کے دروازہ پر پہنچا ۔ ایک نوجوان گھوڑے سے اُتر کر دربان کے پاس آیا اور کہا کہ پاشا کو اطلاع دو کہ غانیہ کا بیٹا سرحان آپ سے ملنے کے لئے آیا ہے ۔

پاشا یہ نام سنتے ہی مسکراتے ہوئے اُٹھا اور کہا کہ ہاں ہاں آنے دو مع رفقاء کے ۔ اور استقبال کے لئے تا لب فرش آیا ۔ سرحان نے سلام کیا ، مصافحہ کرتے ہوئے دستور کے مطابق اس کا ہاتھ چوم لیا اور کہا کہ قونیہ کی جنگ کے زخموں سے اچھا ہونے کے بعد اپنے قبیلے کے جوانوں کے ساتھ کتاہیہ کے عہدنامہ پر مبارکباد دینے کے لئے خدمت میں آیا ہوں ۔ پاشا نے اہلاً و سہلاً کہتے ہوئے سینہ پر ہاتھ رکھا ، گردن جھکائی اور کہا کہ تمہارے شجاعانہ کارناموں کا ممنون ہوں ۔ ان کے شکریہ سے میرا سینہ اور دل لبریز ہے ، تم اور تمہارا قبیلہ صحرا کے شیر ، بیابان کے ببر ۔ یہ کہتے ہوئے دونوں ہاتھ بڑھائے اور ہر ایک کے ساتھ بغل گیر ہوا ۔

یہ سرحان کون تھا ؟ اور غانیہ کون تھی ؟ پاشا کو قلعہ میں ان نوجوانوں سے باتیں کرنے دیجئے ۔ اور آیئے ہم اور آپ ان معرکوں کی سیر کریں جو اس سے چند سال پہلے مصریوں اور نجدیوں میں ہوئے ۔ وہاں سے ہم ان کو پہچان سکیں گے ۔

۱۸۱۲ء سے جب سے مصری حملہ نجد پر شروع ہوا ، ۱۸۱۶ء یعنی چار سال تک حجاز اور نجد کے میدان خونی معرکوں کے مرقع تھے ۔ فوجوں پر فوجیں اور قبیلوں پر قبیلے ، جوان ، بڈھے ، مرد ، عورت ، بچے اور بچیاں ساتھ ساتھ چمکتی ہوئی تلواریں اور نیزے ، شعلے مارتی ہوئی بندوقیں اور توپیں ، گھوڑوں کی صہیل اور جنگ آوروں کے نعرے ۔

مصری حملے جو پہلے محمد علی پاشا کے بڑے فرزند طوسون پاشا کی ماتحتی میں ہوئے ، اکثر ناکامیاب رہے کیونکہ وہابیوں کا امیر سعود نہایت شجاع ، مدبر اور باا ثر تھا ۔ لیکن ادھر سعود کا انتقال ہو گیا اور اس کا ناتجربہ کار بیٹا عبداللہ تخت پر آیا ، ادھر طوسون کی پیہم ناکامیوں سے مجبور ہو کر خود محمد علی پاشا نے مصر سے آکر فوجی قیادت اپنے ہاتھ میں لی ، اس وجہ سے لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا اور وہابی سلسلہ وار شکست کھانے لگے ۔ ۱۸۱۴ء میں محمد علی پاشا کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کو وہ زندگی بھر نہیں بھولا اور اکثر محفلوں اور دعوتوں میں اس کا ذکر کیا کرتا تھا ، وہ کیا تھا ؟

عرب کے بعض بادیہ نشین قبائل میں ہمیشہ سے یہ دستور چلا آتا ہے اور آج بھی ہے کہ وہ اپنے قبیلہ کی

حسین ترین بیٹی کو اپنا افتخار سمجھتے ہیں اور حسن کے عشق میں نہیں بلکہ احترام میں دنیا کی کل قوموں سے آگے ہیں۔
جب کوئی لڑائی پیش آتی ہے تو ایک توانا اونٹ کو قیمتی ساز وسامان سے سجا کر اس پر اس حسینہ کو زیوروں اور کپڑوں سے آراستہ کرکے سوار کراتے ہیں اور قبیلہ کے آگے آگے رکھتے ہیں۔ وہ اپنی تقریروں اور حماسی شعروں سے ان کے جنگ و حمیت کے جذبوں کو ابھارتی ہے اور سارا قبیلہ اس کو اپنی عزت اور حرمت کا زندہ سرمایہ قرار دیکر اونٹ کے ارگرد میدانِ جنگ میں جمع ہو جاتا ہے اور بے جگری کے ساتھ اس کی حفاظت اور حمایت میں لڑتا ہے۔ اس کے چاروں طرف لاشیں اس طرح گرتی ہیں جیسے خزاں میں درختوں سے پتے۔

جبالِ شمر کے ایک قبیلہ معاویہ میں اسی طرح کی ایک عورت حلیمہ تھی۔ وہ خود اپنے قبیلہ کی قیادت کرتی تھی اور مصری فوجوں کو کئی بار زک دے چکی تھی۔ اس کا نام دُور دُور مشہور ہو گیا تھا۔ محمد علی پاشا کے آنے کے بعد مصریوں سے جب مقابلہ ہوا تو قبیلہ مذکور شکست کھا گیا اور حلیمہ گرفتار ہو گئی۔ جس وقت سامنے حاضر کی گئی، پاشا نے کہا کہ میں تیری شجاعت کا حال سُن چکا ہوں اور تیرے کارناموں کا میرے دل پر بڑا اثر ہے، جس کی وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ تجھ کو آزاد کر دوں مگر شرط یہ ہے کہ پھر ہمارا مقابلہ نہ کرے۔

حلیمہ نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ یہاں سے واپس جا کر میرے پاس اس کے سوا اور کیا کام ہو گا کہ اپنے لوگوں کو جمع کرکے پھر جہاد کروں۔

پاشا نے کہا کہ پھر تو مجبوراً نظر بند رکھنا ہو گا۔ جس مقام پر قیدی رکھے جاتے تھے وہاں اس کو بھیج دیا اور حکم دیا کہ احترام اور آرام کے ساتھ رکھی جائے۔

اس کے چند روز کے بعد ہی تربہ کا دوسرا معرکہ پیش آیا۔ جس میں مصری اور نجدی دونوں فریق آخری فیصلہ کے لئے اپنی پوری قوت سے آئے تھے۔ خطرناک مقابلہ تھا۔ عین لڑائی میں پاشا کے ایک ضابط نے اس کو اطلاع دی کہ فلاں سمت سے بدوؤں کی ایک تازہ دم جماعت آ رہی ہے۔ پاشا نے فوراً ایک دستہ کا رُخ اُدھر پھیرا، قسمت نے نجدیوں کا ساتھ نہیں دیا اور وہ شکست کھا گئے۔ پاشا میدان میں مقتولوں اور زخمیوں کا معائنہ کر رہا تھا کہ یکایک اس نے چند زخمی عورتیں دیکھیں اور اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ ان میں سے ایک حلیمہ ہے۔

ہیں!! تو یہاں کہاں حلیمہ؟ کیا میں نے تجھ کو اسیروں کے ساتھ نہیں رکھا تھا؟ اس نے اپنی مجروح گردن

اٹھائی اور نرم آواز میں کہا کہ ہاں مگر میں اپنی تدبیروں سے مکمل آئی۔ الحمدللہ کہ شہادت میرے نصیب میں تھی۔ پھر اس نے دوسری عورت سے کہا کہ غانیہ میرا وقت آچکا۔ تجھے اللہ کی حفاظت میں سپرد کرتی ہوں۔ وہ جنگ وجہاد کی توفیق دے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پاشا نے نہایت احترام کے ساتھ اس کو دفن کرایا اور غانیہ کے علاج کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ میذول کی جب اچھی ہو گئی تو اس کو رخصت کر دیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثنوی اسرارِ خودی

(نوشتہ ۱۹۱۹ء)

ڈاکٹر اقبال کی مثنوی اسرارِ خودی جب سے شائع ہوئی ہے۔ اس وقت سے اس پر مخالفین کے اعتراضات کا سلسلہ جاری ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس مثنوی میں تصوف کی بحث میں حکیم افلاطون یونانی اور خواجہ حافظ شیرازی کو بز و گوسفند لکھا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

راہبِ اوّل فلاطونِ حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم
گوسفندے در لباسِ آدم است — حکمِ او برجانِ صوفی محکم است
بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود — جانِ او وارفتۂ معدوم بود
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت — خالقِ اعیانِ نامشہود گشت
کارِ او تحلیلِ اجزائے حیات — قطعِ شاخِ سرو رعنائے حیات

خواجہ حافظ کے متعلق لکھا ہے۔

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار — جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار
نیست غیر از بادہ در بازارِ او — از دو جام آشفتہ شد دستارِ او
چوں جرس صد نالۂ رسوا کشید — عیش ہم در منزلِ جاناں ندید
آں فقیہِ ملتِ میخوارگاں — آں امامِ ملتِ بے چارگاں
گوسفند است و نوا آموخت است — فتنہ و ناز و ادا آموخت است
دلربائی ہائے او زہر است و بس — چشمِ او غارت گرِ شہر است و بس
از بزِ یوناں زمیں زیرک تر است — پردۂ عودش حجابِ اکبر است
بگذر از جامش کہ در مینائے خویش — چوں مریدانِ حسن دارد حشیش
محفلِ او درخورِ ابرار نیست — ساغرِ او قابلِ احرار نیست

بے نیاز از محفلِ حافظ گذر الحذر از گوسفنداں الحذر

مخالفین کو افلاطون کی نسبت کم لیکن خواجہ حافظ کی بابت زیادہ ملال ہے کیونکہ وہ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مقدس بزرگ بھی تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے حمیت کے جوش میں وہ بھی ڈاکٹر صاحب کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہیں۔

میں ایک عرصہ سے اس بحث کو دیکھ رہا تھا لیکن اس وجہ سے خاموش تھا کہ یہ اصولی بحث نہ تھی۔ چند روز ہوئے میرے پاس مثنوی "رازِ خودی" ایک دوست کے ذریعہ سے پہنچی جو خان بہادر پیرزادہ مظفر احمد صاحب متخلص بہ فضلی پنشنرڈپٹی کلکٹر محکمۂ انہار پنجاب نے "اسرارِ خودی" کے جواب میں لکھ کر شائع کی ہے۔ بعض دوستوں نے اصرار کیا کہ میں کچھ ضرور ان مثنویوں پر لکھوں اس لئے مجبوراً مہرِ سکوت کو توڑنا پڑا۔ لیکن میرے اس لکھنے کا منشاء صرف یہ ہے کہ اس بحث کو اصل مرکز پر لاؤں تاکہ آئندہ موافقین یا مخالفین جو کچھ لکھیں وہ قوم کے لئے مفید ہو، ذاتیات سے کوئی فائدہ مترتب نہیں ہوتا۔

احترامِ سلف ڈاکٹر صاحب نے اس مثنوی میں خواجہ حافظ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اگر وہ نہ لکھتے[1] تو بہتر تھا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے ایک تو خود ان کی ذات پر حملے ہونے لگے اس لئے کہ قدیمی اصول ہے۔

بزرگش نخوانند اہلِ خرد کہ نامِ بزرگاں بزشتی برد

دوسرے نفسِ مسئلہ جو مفید تھا ان ناگوار بحثوں کے حجاب میں آگیا۔ چنانچہ پیرزادہ صاحب جنہوں نے اس دھوم دھام سے اس مثنوی کا جواب لکھا ہے وہ بھی اصلی بحث کو نظر انداز کر گئے۔ اور صرف افلاطون اور حافظ کی مدح سرائی اور ڈاکٹر صاحب پر مثلیں چست کرنے میں مشغول رہے۔

---

[1] میں خوش ہوں کہ اس مثنوی کے دوسرے ایڈیشن میں ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ خواجہ صاحب کے متعلق لکھا تھا اس کو حذف کر دیا اور اس کے بجائے نئے اشعار لکھ دیئے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس کا مفید اور دلچسپ دیباچہ بھی نکال ڈالا گیا جس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

بزِ گوسفند کے جواب میں کہیں شغال اور کہیں خر بنایا ہے اور دشمنِ اسلام اور رہزنِ اسلام وغیرہ خطابات بخشے ہیں لکھتے ہیں۔

خود زما حیلے بسے وحشت سگال حیلہ زن در نیلِ دستاں چوں شغال
فلسفی فطرت زدیں برگشتگاں در بیابانِ جنوں سرگشتگاں
عقل و دین و معاد را دشمن ہمہ در لباسِ شحنگاں رہزن ہمہ
از دمِ گفتار دستاں داستاں فلسفہ در دل تصوف برزباں
دشمنِ جاں آمدند اسلام را رہزنِ جاں آمدند اسلام را
دلئے براین پختگانِ عقلِ خام اولیا را میش و بز کردند نام
از دمِ مکر شغا لاں الحذر الحذر از بد سگالاں الحذر

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

از خودی پیغارہ رہزن اسلاف را کردہ پامال جنونِ انصاف را
بندۂ دنیا بہ دنیا دیں فروش سربسر ملت فروش آئیں فروش

پیرزادہ صاحب کے ان اقوال کو جب صوفیانہ حلم اور حسنِ ظن کی میزان میں ہم تولتے ہیں تو ان کی سبکی نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔

خواجہ حافظ کے کلام کے متعلق اس قسم کی رائیں پہلے سے بھی لوگوں کی چلی آتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کچھ اس کے اوّل مجرم نہیں ہیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ بادشاہ عالمگیر نے عام منادی کرا دی تھی کہ دیوانِ حافظ کوئی نہ پڑھے کیونکہ لوگ اس کے ظاہری معنی سمجھ کر گمراہ ہوتے ہیں۔ نیز مولانا حالی مرحوم نے حیاتِ سعدی میں لکھا ہے۔

"خواجہ حافظ کی غزل مجالس اور محافل میں سب سے زیادہ گائی جاتی ہے اور اس کے معانی سے اکثر لوگ واقف ہیں، وہ ہمیشہ سامعین کو چند باتوں کی ترغیب دیتی ہے۔ عشقِ حقیقی کے ساتھ عشقِ مجازی اور صورت پرستی و کام جوئی کو بھی وہ دین و دنیا کی نعمتوں سے افضل بتاتی ہے۔ مال و دولت، علم و ہنر، نماز روزہ، حج و زکوٰۃ، زہد و تقویٰ، غرضکہ کسی شے کو نظربازی اور شاہد پرستی کے برابر نہیں ٹھہراتی، وہ عقل و تدبر، مآل اندیشی، تمکین و وقار

ننگ و ناموس، جاہ و منصب وغیرہ کی ہمیشہ مذمت کرتی ہے اور آزادگی، رسوائی، بدنامی وغیرہ کو جو عشق کی بدولت حاصل ہو، تمام حالتوں سے بہتر ظاہر کرتی ہے۔ دولتِ دنیا پہ لات مارنا عقل و تدبر سے کام نہ لینا، توکل و قناعت کے نشہ میں اپنی ہستی مٹا دینا اور جوہرِ انسانیت کو خاک میں ملا دینا، دنیا و مافیہا کے زوال و فنا کا ہر وقت تصور باندھے رکھنا۔ علم و حکمت کو لغو و پوچ اور حجابِ اکبر جاننا۔ حقائقِ اشیا میں کبھی غور و فکر نہ کرنا کفایت شعاری اور انتظام کا ہمیشہ دشمن رہنا، جو کچھ ہاتھ لگے۔ اس کو فوراً کھو دینا اور اسی طرح کی بہت سی باتیں اس سے مستفاد ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جو ہمیشہ بے فکروں اور نوجوانوں کو بالطبع مرغوب ہوتے ہیں اور کلام کا سادہ اور عام فہم ہونا اور شاعر کی فصاحت و بلاغت اور مطرب و رقاصہ کی خوش آوازی اور حسن و جمال اور مزامیر کی نَے اُن کو لے اڑتی ہے اور اُن کی تاثیر کو دس بیس گنا کر دیتی ہے اور جب باوجود ان سب باتوں کے سامعین کو یہ اعتقاد بھی ہو کہ اس کلام کے قائل اکابر صوفیا اور مشائخ کرام ہیں، جن کی تمام عمر حقائق اور معارف کے بیان کرنے میں گذری ہے اور جن کا شعر شریعت کا رہنما اور عالمِ لاہوت کی آواز ہے تو یہ مضامین اور زیادہ دل نشین ہو جاتے ہیں۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"خواجہ حافظ کی غزل کی ممارست اور مزاولت سے بے شک ابرار و احرار کے دلوں میں دنیا کی بے ثباتی اور توکل و استغنا و قناعت کا پختہ خیال پیدا ہوتا ہے اور اوباش و الواط کو بے فکری، ناعاقبت اندیشی، عشق بازی، بدنامی و رسوائی کی ترغیب ہوتی ہے اور قوم کی موجودہ حالت کے لحاظ سے پہلی تاثیر بھی ویسی ہی خانہ برانداز اور خانماں سوز ہے۔ جیسی دوسری۔"

ہم نے خود اپنی تصنیف "حیاتِ حافظ" میں ان رایوں کو نقل کیا ہے اور ان کا جواب بھی دیا ہے، لیکن ہمارے جواب کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ "حسن کا معیار یہی ہے کہ وہ کمال درجہ کا دلکش ہو۔ عشاق کی رسوائی سے حسن بُرا نہیں قرار پا سکتا۔" باقی حافظ کی غزل کے ان اثرات سے جو مولانا حالی نے لکھے ہیں کون انکار کر

سکتا ہے! ایسے شک یہاں تک ہم پیرزادہ صاحب کے ساتھ ہیں کہ

الادب پیغارہ بر مستاں مزن شیشۂ خود بر سرِ سنداں مزن
درگذر از بادہ خوار اے محتسب مست را معذور دار اے محتسب

لسان الغیب مولانا حکیم فیروزالدین صاحب طغرائی نے ڈاکٹر صاحب کے جواب میں جو رسالہ لسان الغیب کے نام سے شائع کیا ہے اس میں جو پہلو جواب کا اختیار کیا ہے وہ "سوال از آسمان و جواب از ریسمان" کا مصداق ہے۔ شعراء اور تذکرہ نگاروں نے کلام حافظ کی جو مدح کی ہے وہ شاعری اور صوفیانہ رموز کے لحاظ سے کی ہے اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے کلام کی ان خوبیوں کو ڈاکٹر صاحب بہ نسبت حکیم صاحب موصوف کے زیادہ سمجھتے ہیں۔ بحث جو کچھ ہے وہ ان اثرات کے متعلق ہے جو خواجہ کے کلام سے جذبات پر پڑتے ہیں۔ اس لئے ان محامد و مدائح کا نقل کر دینا جو ڈاکٹر صاحب کے بھی پیش نظر ہیں جواب کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔

علاوہ بریں حکیم صاحب موصوف نے شعرالعجم سے بہت کچھ استدلال فرمایا ہے کہ علامہ شبلی نے کلام حافظ کو چناں و چنیں لکھا ہے۔ مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ اسی شعرالعجم میں عمر خیام کے تذکرہ میں ہے کہ

"افسوس ہے کہ خیام خواجہ حافظ کی طرح صوفی نہ تھا۔ ورنہ اس کی شراب بھی شراب معرفت بن جاتی۔"

اسرار خودی میں خواجہ حافظ کے جن اشعار کی طرف تلمیح ہے ان کے جو لطیف معانی حکیم صاحب نے بیان کئے اور جو جو صوفیانہ نکات ان سے نکالے ہیں وہ ہر شاعر کے ہر شعر سے نکالے جا سکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ کچھ عرصہ ہوا میں نے کسی مضمون نگار کا مضمون پڑھا تھا جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ خواجہ آتش لکھنوی کا کلام تصوف اور معرفت سے لبریز ہے۔۔۔۔، اور اس کے شواہد بھی لکھے تھے۔ نیز بمبئی کے کسی اخبار میں ایک گبر کا یہ دعویٰ بھی دیکھنے میں آیا تھا کہ خواجہ حافظ آتش پرست تھے۔ مدعی نے خود حافظ کی غزلوں سے اس پر استدلال کیا تھا۔ منجملہ ان کے ایک غزل جو مجھے یاد رہ گئی ہے، یہ ہے:

کنونکہ در چمن آمد گل از عدم بوجود بنفشہ در قدم او نہاد سر بسجود

اس غزل کے مندرجہ ذیل شعر کو اس نے اپنے اس عجیب و غریب دعویٰ کے ثبوت میں پیش کیا تھا۔

بلبلِ تازہ کن آئین دین زردشتی کنولکہ لالہ برافروخت آتش نمرود

حافظ و عرفی

ہم کو سب سے زیادہ جو بات مثنوی اسرارِ خودی میں حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے :-

حافظِ جادو بیاں شیرازی است عرفی آتش زباں شیرازی است

ایں سوئے ملکِ خودی مرکب جہاند واں کنارِ آب رکنا باد ماند

ایں قتیلِ ہمتِ مردانہٗ آں ز رمز زندگی بیگانہٗ

بادہ زن با عرفی ہنگامہ خیز زندہٗ ، از صحبتِ حافظ گریز

اس لئے کہ اگر شاعری ہی کے دائرہ میں رہنا ہے تو حافظ کو چھوڑ کر عرفی کو مقتدا بنا لینا بعینہٖ اس مثل کا مصداق ہے۔ "فرمن المطر ووقع تحت المیزاب"

حقیقت یہ ہے کہ ہماری شاعری خیر دجّال ہے خیر عیسیٰ نہیں ہے۔ اس کے چند مخصوص عنوانات ہیں جن کو واقعیت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ انہیں کو شعراء الفاظ کے نئے نئے لباس میں پیش کرتے ہیں۔ یہ نہ زندگی کے لئے کسی عملی شاہراہ کی طرف ہدایت کرتی ہے نہ سوائے ادبی لطافت کے کوئی خاص مقصد پیشِ نظر رکھتی ہے۔ قرآن شریف نے جس شاعری کو مذموم قرار دیا ہے اس کا بہترین یا بدترین نمونہ یہی ہے۔ الاماشاء اللہ۔ مولانا حالی نے بہت صحیح فرمایا ہے۔

وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر

فلک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر

ہوا علم و دیں جس سے برباد سارا وہ علموں میں علمِ ادب ہے ہمارا

عقیدتمندی نے خواجہ حافظ کے کلام پر پھر بھی تقدس کا ایک غلاف چڑھا دیا ہے، عرفی کا کلام تو اس سے بھی عاری ہے۔ رہیں ادبی خوبیاں تو اُن کے لحاظ سے خود عرفی اسی شمع کا پروانہ ہے۔ کہتا ہے۔

بگردِ مرقدِ حافظ کہ کعبۂ سخن است در آمدیم بعزمِ طواف در پرواز

بیشک نخوت اور خودستائی کہیں کہیں اس کے کلام میں پائی جاتی ہے لیکن وہ خود ڈاکٹر صاحب کی مصطلحہ خودی کے متضاد ہے۔

بحث خودی

پیرزادہ صاحب نے خودی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے خواجہ حافظ کے جوشِ حمایت میں ڈاکٹر صاحب کے مفہومِ مقصود کو سہواً یا قصداً نظر انداز کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تو صاف لکھ دیا ہے کہ "خودی کو بمعنی غرور میں نے استعمال نہیں کیا ہے بلکہ اس کا مقصود محض احساسِ نفس یا تعیینِ ذات ہے۔" باوجود اس تصریح کے اس لفظ کے جو معنی انہوں نے خود ڈاکٹر صاحب کے اشعار سے نکالنے کی کوشش کی ہے، اس میں صریحی طور پر انصاف سے تجاوز کر گئے ہیں۔ اس لئے کہ جب کوئی لفظ کسی اصطلاحی معنی میں رکھ لیا گیا تو اس کے معنی لے کر اعتراض کا پہلو نکالنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ اس شعر پر

شعلہ ہائے او صد ابراہیمؑ سوخت تا چراغِ یک محمدؐ بر فروخت

جو اعتراض پیرزادہ صاحب نے کیا ہے کہ اس کا انبیاء کی عظمت و شان پر اچھا اثر نہیں پڑتا ہم بھی اس سے متفق ہیں، لیکن ہمارا جہاں تک خیال ہے ڈاکٹر صاحب نے یہ مضمون اس کلام سے اخذ کیا ہوگا جو کسی بزرگ صوفی کا ہے ؎

صد ہزاراں سبزہ پوش از غم بسوخت تا کہ آدمؑ را چراغے بر فروخت
صد ہزاراں جسم خالی شد ز روح تا دریں حضرت در دگر گشت نوحؑ
صد ہزاراں پشہ در لشکر فتاد تا ابراہیمؑ از میاں سر بر نہاد
صد ہزاراں خلق سر ببریدہ گشت تا کلیم اللہ صاحب دیدہ گشت
صد ہزاراں خلق در زنار شد تا کہ عیسیٰؑ محرمِ اسرار شد
صد ہزاراں خلق در تاراج رفت تا محمدؐ یک شبے معراج رفت

خودی کا عرفی مفہوم مراد لے کر پیرزادہ صاحب نے جو اعتراضات کئے ہیں ان تیروں کا نشانہ ڈاکٹر صاحب نہیں ہیں، کیونکہ انہوں نے اس کا مفہوم دوسرا قرار دیا ہے۔ ایسی صورت میں یہ بحث بالکل لفظی ہے۔

اصلیت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی حکیمانہ طبیعت نے جب مسلمانوں کے تنزل کے اسباب و علل

دریافت کرنے کی طرف توجہ کی، تو یہ سراغ پایا کہ اُمّتِ اسلامیہ سے قوتِ عمل فنا ہو گئی اور جو عملی ولولہ اور جوش سلف میں تھا وہ خلف میں نہیں رہا اور چونکہ ترقی کا مدار عمل پر ہے اس لئے پھر اسی قوتِ عمل کو زندہ کر کے ہم ترقی کر سکتے ہیں اس قوتِ عمل کے احیاء کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم کو اپنی ہستی کا بھی احساس ہو۔ اسی نظریہ کی تعلیم کے لئے انہوں نے یہ مثنوی لکھی ہے۔ خودی کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است — ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد — آشکارا عالمِ پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او — غیرِ او پیداست از اثباتِ او
می شود از بہرِ اغراضِ عمل — عامل و معمول و اسباب و علل
زندگی محکم ز ایقاظِ خودی است — کاہد از خوابِ خودی نیروے زیست

اس مفہوم کو مثنوی رموزِ بیخودی میں اور بھی صاف کر دیا ہے ؎

تو خودی از بے خودی نشناختی — خویش را اندر گماں انداختی
جوہرِ نوریست اندر خاکِ تو — یک شعاعش جلوۂ ادراکِ تو
واحد است و بر نمی تابد دوئی — من ز تابِ او منم تو توئی
خویش دار و خویش باز و خویش ساز — نالہا می پرورد اندر نیاز
خوگرِ پیکارِ پیہم دیدمش — ہم خودی ہم زندگی نامیدمش

پیرزادہ صاحب فرماتے ہیں۔

ہر چہ گفتی از خودی حاشا غلط — سر بسر از لفظ تا معنی غلط
در حیاتِ کس خودی را دخل نیست — خلقِ عالم را بس این تمثیل نیست
در حریمِ حق خودی را نیست بار — در حرم مردودِ دیواں را چہ کار
از خودی بگذر کہ کار این ست و بس — خامۂ مسلم را اشعار این ست و بس

دراصل پیرزادہ صاحب خودی کے لفظ ہی سے بیزار ہیں کہتے ہیں ؎

اے خودی را مرکبِ خود ساختی — دبۂ در پائے پیل انداختی
اے خیالِ خامت اسرارِ خودی — پختہ کارِ رازِ پندارِ خودی

زہر را تریاق می گوئے بگوئے بر ہلاکِ خویش می پوئی ہوئے
مدعیارستانِ بازارِ صفا سکۂ قالِ تو باشد نا روا

ہم کو حیرت ہے کہ "عیارستان بازارِ صفا" میں پیرزادہ صاحب منصور حلاج کی "انا الحق" کے تو نہایت سرگرم حامی ہیں اور ڈاکٹر اقبال کی "انا، انا" سے اس قدر بیزار!!
منصور کی حمایت میں فرماتے ہیں ؎

زاہداں منصور خوں کردہ اند بیکس و معذور را خوں کردہ اند
مردِ حق گورا بدار آویختند بے گنہ راخوں بنا حق ریختند
ہلہ اے زہادِ آشفتہ دروں ہلہ اے استیزہ کارانِ جنوں
خونِ منصور از شما خواہم گرفت خفتہ خوں را خوں بہا خواہم گرفت

ڈاکٹر صاحب نے حکیم افلاطون کی جو مذمت مسئلہ اعیان کی وجہ سے کی ہے اس کے جواب میں پیرزادہ صاحب نے شیخ شہاب الدینؒ کی کتاب تلویح سے ایک کشفی فضیلت نقل فرما کر اس کی مدح سرائی فرمائی ہے۔ فلسفۂ استدلال جاننے والوں کے لئے یہ جواب ایک لطیفہ ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ مذکور نے ارسطو کو کشف میں دیکھا کہ وہ افلاطون کی مدح میں سرگرم ہے۔ پوچھا کہ اس کے درجے کا کوئی اور حکیم نہیں؟ ارسطو نے کہا نہیں، پھر مسلمان بزرگوں اور صوفیوں کے نام لئے۔ ارسطو نے سوائے بایزیدؒ کے اور کسی کو افلاطون کا ہم مرتبہ نہ بتایا۔ چنانچہ پیرزادہ صاحب اسی بنیاد پر اس کی بابت کہتے ہیں ع

جبرئیلے در لباسِ آدم است

ہم کو اُمید تھی کہ پیرزادہ صاحب حافظ کی مدافعت زیادہ جوش کے ساتھ کریں گے لیکن یہاں مضمون بہت ہی مختصر نکلا کہتے ہیں ؎

اے کہ حافظ را شماتت میکنی بندِ میکش را ملامت میکنی
اے بعلمِ خویش۔ محمودِ عمل تو چہ دانی سرِ مستانِ ازل

بحثِ تصوف

اصل مرکزِ بحث یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہ کہتے ہیں کہ مذہبِ اسلام ایک حقیقی پیغامِ عمل ہے

باوجود پیروِ اسلام ہونے کے موجودہ مسلمانوں میں جو جمود ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان پر بیرونی عنصر مذہبی رنگ میں آکر غالب ہوگیا ہے اور وہ تصوف ہے۔ اسی تصوف کے مسئلہ فنا اور نفس کشی[1] نے مسلمانوں کی قوتِ عمل کو باطل کر دیا ہے۔ کیونکہ تصوف کا اثر تمام ادبیاتِ اسلامیہ میں ساری ہوگیا ہے اور ہر قوم کے ادبیات کا ایک تدریجی اثر اس قوم کے جذبات اور قوائے نفسانیہ پر ہوتا ہے۔ اسی لئے رفتہ رفتہ اس کے اثر سے ہماری قوتِ عمل جاتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں مسئلہ نفی خودی کو بنی نوعِ انسان کی مغلوب قوموں نے ایجاد کیا ہے کہ اس تعلیم سے مخفی طور پر غالب قوموں کو کمزور بنائیں۔

یونان میں فلسفۂ اشراق اور ایران میں تصوف پھیلا، اس وجہ سے ضمناً افلاطون اور حافظ کا بھی تذکرہ آیا۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال جیسا کہ پیرزادہ صاحب نے اپنی مثنوی کے دیباچے میں خود انہیں کے الفاظ میں نقل کیا ہے، یہ ہے۔

(۱) تصوف رہبانیت سے پیدا ہوا ہے۔
(۲) اسلام تصوف کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔
(۳) تصوف نے قرمطی تحریک سے فائدہ اٹھایا ہے۔
(۴) تصوف قیودِ شرعی کو فنا کر دینے کی کوشش کرتا ہے۔

اور اس کی بنیاد محض عقیدت پر نہیں ہے بلکہ انہوں نے خود تحقیقات کی ہے۔

(۱) میرے آباؤ اجداد کا مشرب تصوف تھا اور خود میرا میلان بھی تصوف کی طرف تھا۔
(۲) فلسفۂ یورپ کے پڑھنے سے اسلامی تصوف کی صداقت میرے دل میں مضبوط ہوگئی تھی کیونکہ فلسفۂ یورپ بحیثیت مجموعی متجر بہ تصوف ہے۔
(۳) قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخِ اسلام کو پڑھنے سے مجھے معلوم ہوا کہ میں غلطی پر تھا۔ تصوف اور فلسفۂ یورپ بھی غلط ثابت ہوا، اس واسطے میں نے تصوف کو ترک کر دیا۔

اس کے مقابلہ میں پیرزادہ صاحب فرماتے ہیں کہ "میرا نسبی و نسبتی تعلق ایک صوفیانہ خاندان سے ہے۔ میرے آباؤ اجداد نے نسلاً بعد نسلاً حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے وقت سے جو میرے جدِّ اعلیٰ ہیں اس وقت تک تصوف کے دامانِ تربیت میں پرورش پائی ہے، میرا عقیدہ یہ ہے کہ

---

[1] تصوف نفس کشی سکھلاتا ہے لیکن اسلام کی یہ تعلیم نہیں ہے وہ صرف اصلاحِ نفس کا خواہاں ہے۔

"اسلام عین تصوف ہے اور تصوف عین اسلام ہے"

مسئلہ عینیت

تصوف کا مسئلہ "عینیت" افلاطون کے مسئلہ "اعیان" سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے۔ "ہمہ اوست" کے عقیدہ نے ایک ایسی ہمہ گیر عینیت کی بنیاد ڈالی کہ ہر ہر ذرہ عین آفتاب ہوگیا اور خالق اور مخلوق متحد ہو گئے۔ چند اقوال بطور مثال کے لکھتا ہوں۔

"انا الحق"

"سبحانی ما اعظم شانی"

"سبحان الذی خلق الاشیاء وہو عینہا"

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ　　خود بر سر بازار خریدار برآمد

خود انا الحق زد از لب منصور　　خود برآمد ز شوق بر سر دار

گفت انا[1] احمد بلا میم　　از زبان محمد مختار

ندیم و مطرب و ساقی ہمہ اوست　　خیال آب و گل در رہ بہانہ

یہاں تک کہ بعض یکہ تازان میدان تفرد کلمۂ توحید کو بھی شرک خیال کرتے ہیں۔

اے پسر لا الہ الا اللہ　　خود ز شرک خفی است آئینہ دار

ہست شرک جلی رسول اللہ　　خویشتن را ازیں دو شرک برار

ایک اور سرمست کا ترانہ سنیئے۔

---

[1] خود ڈاکٹر اقبال کو بھی یہ میم پسند نہیں آیا ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

کہیں تہذیب کی پوجا کہیں تعلیم کی ہے　　دم دنیا میں یہی احمد بے میم کی ہے

معلوم نہیں کہ قرآن شریف کے مطالعہ کے بعد جس طرح تصوف کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا خیال بدلا ہے اسی طرح اس عقیدہ میں بھی کوئی تبدیلی ہوئی یا ابھی تک "معذور صہبائے محبت" ہیں اور فلک عرب کے سونے والے کو کچھ اور ہی سمجھتے ہیں۔

من ہم زمینم ہم سما، من بالو، ہم جملہ جا — من مصطفیٰ را ہم خدا، من الحمد یہ ام

فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کے امتیازی حدود بھی مٹ گئے۔

چونکہ بے رنگی اسیرِ رنگ شد — موسیٰ با موسیٰ در جنگ شد

تجرید کا یہ نعرۂ مستانہ بھی سن لیجئے جس میں قافیہ کی پابندی بھی ترک کر دی گئی ہے۔

سر برہنہ نیستم دارم کلاہ چار ترک — ترکِ دنیا ترکِ عقبیٰ ترکِ مولا ترکِ ترک

ان "شطحیات" کا ایک انبار ہے۔ ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جن کو نقل کرتے ہوئے مجھ نا آشنائے سرِ وحدت کا قلم لرزتا ہے، اور یہ ان حضرات کے اقوال ہیں جن کا ایک ایک لفظ "عیارستانِ بازارِ صفا" میں بیش بہا جوہر سمجھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کا عین تصوف اور تصوف کا عین اسلام ہونا کیا حیرت انگیز ہے۔

علم و عقیدت کی جنگ

تمام مصلحوں اور پیشواؤں کو سب سے پہلی خطرناک منزل جو پیش آتی ہے وہ یہی علم و عقیدت کی جنگ ہے۔ مصلح دیدۂ تحقیق سے دیکھ کر ڈراتا ہے کہ اے قوم جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے اسے پھینک دے کیونکہ یہ زہریلا سانپ ہے، مگر رسم پرست قوم کہتی ہے کہ نہیں یہ تازیانہ ہے ؎

بوقتِ صبح شود ہمچو روز معلومت — کہ باکہ باختہ عشق در شبِ دیجور

اس جنگ کے ہزارہا تماشے دنیا دیکھ چکی ہے، لیکن ابھی تک بدستور اس کا سلسلہ جاری ہے ایک شخص علمی تحقیقات سے مفید اور صحیح خیالات قوم کے سامنے پیش کرتا ہے، قوم اس کو جاہل دشمن اسلام اور کافر بناتی ہے۔ امام غزالی، ابن رشد، اور امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کسی کی کتابیں جلائی جاتی ہیں، کوئی جلاوطن کیا جاتا ہے، کسی کو قید خانے میں جانا پڑتا ہے عقیدہ وہی صحیح ہے جس کی بنیاد علم یقینی پر ہو، محض رسمی عقیدہ "عیارستانِ بازارِ تحقیق" میں کوئی قیمت نہیں رکھتا۔

تصوف اور اسلام

سرچشمۂ اسلام یعنی قرآن و حدیث تصوف کے لفظ تک سے نا آشنا ہیں۔ یہ لفظ دوسری

صدی ہجری میں عربی زبان میں داخل ہوا۔ مستشرقینِ یورپ ودیگر محققین جن میں سے کوئی کہتا ہے کہ تصوف فلسفۂ اشراق سے لیا گیا ہے، کوئی اس کا ماخذ کلیساؤں کی رہبانیت کو قرار دیتا ہے۔ اُن کی تحقیقات لکھنے کا نہ یہ موقع ہے نہ اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش ہے۔ تاریخ اسلام بھی ہمارے سامنے ہے اس سے جہاں تک معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ ابتدا ابتدا میں جو اہلِ زہد تارک الدنیا اور گوشہ گیر ہو کر عبادت اور ریاضت میں مصروف رہتے تھے۔ اُن کو لوگ صوفی کے نام سے پکارنے لگے یعنی جیسا کہ پیرزادہ صاحب نے فرمایا ہے۔

پیشِ طاقِ صوفیاں احساں بود   اتباعِ سنت و قرآں بود

اس زمانہ میں تصوف اخلاص کا نام تھا، جس کو حدیث شریف میں "احسان" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، یہی وہ تصوف ہے جس کی مدح غزالیؒ وغیرہ ائمۂ اسلام نے لکھی ہے۔

لیکن جب تاتاریوں کے حملے شروع ہوئے اور چنگیز اور ہلاکو نے ایک قیامتِ صغریٰ برپا کر دی تو ان کی ہولناک خونریزیوں سے اُمت کے فاتحانہ جذبات مٹ گئے، دنیا کی طرف سے ان کے دل سرد ہو گئے، طبیعتوں کا جوش اور ولولہ جاتا رہا، حوصلے پست اور ہمتیں سست ہو گئیں، زوال و فنا کے نقشے آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ میلانِ خاطر زہد اور ترکِ دنیا کی طرف بڑھ گیا اور سرمایۂ توکل و قناعت کو لے کر گوشۂ عافیت میں بیٹھنا پسند آیا۔ عالمِ فانی کے جاہ و جلال کی وقعت نگاہوں میں نہ رہی، بوریائے فقر سریرِ سلطنت سے زیادہ عزیز سمجھا گیا۔ کلاہِ نمدی کو تاجِ زر پر ترجیح دی اور پکار اٹھے

گوشۂ عافیت و کنجِ قناعت گنجیست   کہ بشمشیر میسر نہ شود سلطاں را

بفراغِ دل زمانے نظرے بہ ماہ روئے   بہ ازاں کہ چترِ شاہی ہمہ عمر ہائے وہوئے

مئے دوسالہ و معشوقِ چاردہ سالہ   ہمیں بس است مرا صحبتِ صغیر و کبیر

شکوہِ تاجِ سلطانی کہ بیمِ جاں درو درجست   کلاہِ دلکش است اما بترکِ سر نمی ارزد

ذوقِ عمل طبائع سے یہاں تک مسلوب ہو گیا کہ "شیوۂ قلندری" کے مقابلہ میں "رہ و رسمِ پارسائی دور و دراز" نظر آنے لگی، عالمِ ذوق میں حلقۂ یاراں میں "خلوت در انجمن" ہونے لگی۔ اور سجادہ ہی پر "سفر در وطن" کی کڑی منزلیں طے کی جانے لگیں، شریعت اور حقیقت دو جداگانہ راستے قرار پائے اور ان میں پوست اور مغز کی تفریق کی گئی، علماء و فقہا محجوب و بے بصر سمجھے گئے، یہ اثرات اگر صرف ایک ہی جماعت تک

محدود ہوتے تو نقصان نہ ہوتا، لیکن شاعری کے ساز پر یہ ترانہ کچھ اس انداز سے چھیڑا گیا کہ تمام ملک اس صدا سے گونج اٹھا اور ادبیات اسلامیہ میں ایک قسم کے جمود اور رہبانیت کا اثر ساری ہو گیا۔

زوالِ شوکتِ اسلام

شوکتِ اسلام کے زوال کے اسباب یوں تو پہلی ہی صدی ہجری سے شروع ہو گئے تھے، مثلاً سیاست کی خرابی، یعنی وہ جمہوریت جو اسلام لے کر آیا تھا جس نے ہر مسلمان کو آزاد اور خود مختار بنا دیا تھا ہاتھوں سے جاتی رہی، اور اس کے بجائے استبدادی حکومت قائم ہو گئی، جس نے تمام اُمت کو غلام بنا دیا۔ مسلمان بے گناہ قتل کر دیئے جاتے تھے۔ ائمہ وعلماء جو اپنے زمانے کے روشن چراغ تھے، بیشتر زیرِ عتاب زیرِ خنجر یا زیرِ طوق وزنجیر رکھے جاتے تھے، اور حق گو زبانیں اس قدر خاموش کر دی گئی تھیں کہ ان مظالم کے خلاف ایک لفظ نہیں نکال سکتی تھیں۔ اس طرح پر "مسلم" حریتِ عمل سے محروم کر دیا گیا۔ پھر علمی تقلید جس سے حریتِ فکر بھی جاتی رہی۔ یہ شکنجہ ایسا سخت تھا کہ ایک زمانہ میں یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی کہ اہلِ علم اس خوف سے کہ کہیں کوئی دشمن ان کے اوپر تہمت لگا کر قتل نہ کرا دے، اپنی صحتِ عقیدہ کی سند قاضی سے لے کر ہر وقت اپنے پاس رکھتے تھے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اسلام میں اس بیرونی عنصر کے شمول سے جو جمود پیدا ہوا اس نے بھی بہت کچھ ان اسبابِ زوال کو تقویت دی، اور خاص کر ہندوستان میں تو اسلام کی حالت اور بھی خراب ہوئی۔ یہاں تک کہ ایک غیر مسلم شخص یعنی تمدنیت کا مشہور مبصر ڈاکٹر لیبان اپنی کتاب تمدنِ ہند میں یہاں کے مسلمانوں کی نسبت یہ لکھنے پر مجبور ہوا کہ

> "وہ اسلام جو اس وقت ہند میں رائج ہے اس کی حالت بھی بالکل ویسی ہی ہو گئی ہے جیسے ہند کے اور مذاہب کی۔ اس میں مساوات بھی قائم نہیں جس کی وجہ سے اوائل میں اس کو اس قدر کامیابی ہوئی تھی۔"

پھر ایک جگہ لکھتا ہے۔

> "ہندوستان کے اسلام کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں معلوم ہو جائیگا کہ اس مذہب کی یہاں آکر کیسی مٹی خراب ہوئی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے رموزِ بےخودی میں موجودہ مسلمانوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں کچھ بھی شاعرانہ

مبالغہ نہ سمجھنا چاہیئے۔

مسلم از سرِ نبی بیگانہ شد — باز ایں بیت الحرم بتخانہ شد
از منات و لات و عزیٰ و ہبل — ہر یکے دارد بتے اندر بغل
شیخ ما از برہمن کافر تراست — زانکہ اورا سومنات اندر سراست
رختِ ہستی از عرب برچیدہ — در خمستانِ عجم خوابیدہ
شل ز برفابِ عجم اعضائے او — سرد تر از اشکِ او صہبائے او
ہمچو کافر از اجل ترسندۂ — سینہ اش فارغ ز قلبِ زندۂ

قرآن شریف میں نصِ قطعی موجود ہے۔ "ولن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا" (۴/۱۴۱)
پھر آخر کیا وجہ ہے کہ ہم اس سے محروم ہو گئے؟ میرے خیال میں اس کا جواب صرف یہی ہے جو قرآن شریف
دیتا ہے۔ "ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا" (۲۵/۳۰) ڈاکٹر صاحب نے بہت صحیح فرمایا ہے۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن
صوفیِ پشمینہ پوشِ حال مست — از شرابِ نغمۂ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش — درنہ می سازد بقرآں محفلش

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیامِ مشرق

(نوشتہ ۱۹۲۳ء)

ڈاکٹر اقبالؒ کا یہ تازہ دیوان میں نے پڑھا۔ مجھے اس سے جو حظ اور لطف حاصل ہوا وہ بیان سے باہر ہے لیکن بعض احباب کا اصرار ہے کہ میں اس کو تحریر میں لاؤں۔ اس لئے سرسری طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں اس کو نہ تنقید سمجھنا چاہیے نہ تقریظ۔

یہ دیوان جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے دیوان کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ جرمن زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے چونکہ میں گوئٹے سے آشنا نہیں ہوں اس لئے مقابلے کی جلوہ آرائی کا لطف نہیں اٹھا سکا۔ لیکن مشرقی شاعری کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ اس نے مغرب کو مخاطب کیا اور ایشیا کے سینے کی برقی حرارت یورپ کے برفستان میں پہنچانے کی کوشش کی۔

دیباچہ

شروع میں ایک چھوٹا سا دیباچہ ہے۔ جس میں گوئٹے کی شاعری میں جو مشرقی رنگ ہے اس کا ذکر کیا ہے۔ اسی ذیل میں جرمن ادبیات پر عجمی شاعری کا جو اثر پڑا ہے اس کی نہایت مختصر تاریخ لکھی ہے۔ یہ مضمون مفید اور پُر از معلومات ہے۔ اگر جداگانہ بسط کے ساتھ لکھا جاتے تو نہایت کارآمد ہو۔ چونکہ دیوان فارسی میں ہے۔ اس لئے اگر دیباچہ بھی بجائے اردو کے فارسی میں ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔

زبان

ڈاکٹر صاحب نے جب فارسی زبان میں شعر گوئی اختیار کی تو شروع شروع میں ان کی بعض مثنویوں کی زبان پر لوگوں نے اعتراضات کئے لیکن اب انہوں نے اپنے ذہن وقاد اور طبع نقاد سے زبان میں

ایسی لطافت اور شستگی پیدا کر لی ہے کہ صائب اور نظیری کے رنگ میں آ گئے۔ اس تمام مجموعے میں زبان کی صفائی اور پختگی اور کلام کی بے ساختگی اور برجستگی پر مشکل سے کہیں انگلی رکھی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان میں رہ کر فارسی زبان کو جو اظہار خیالات کا ذریعہ بنایا ہے حقیقت میں انہوں نے کوہ کنی کی زحمت گوارا کر کے ایشیائی اقوام مسلمہ کے لئے جو بالعموم فارسی سمجھتی ہیں اپنی فائدہ رساں تعلیمات کی ایک جوئے شیر نکالی ہے ورنہ آج یہ نہ کہہ سکتے ؎

نوائے من بہ عجم آتشِ کہن افروخت عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است

لیکن مجھے یقین ہے کہ جب اٹالین اور انگریزی وغیرہ مغربی زبانوں میں کلامِ اقبال کے ترجمے ہو رہے ہیں تو اہلِ مصر جو اس معاملے میں یورپ کے کسی ملک کے پیچھے نہیں ہیں اور جنہوں نے ٹیگور تک کا ترجمہ عربی میں کر لیا ہے، اس اپنی بضاعتِ طیبہ کو عربی میں منتقل کئے بغیر نہیں رہیں گے۔

شاعری

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ شاعری وہی اچھی ہوتی ہے جو زمانہ جاہلیت میں ہوتی ہے۔ لیکن میرے نزدیک ؏

دکانِ عاشقی را بسیار مایہ باید

بیشک جاہلی شاعری کی زبان میں سادگی اور طرز ادا میں بے ساختگی ہوتی ہے لیکن شعر کی خوبی انہیں چیزوں پر محدود نہیں ہے بلکہ ان کے سوا اس میں معنوی خوبیاں بھی ہوتی ہیں جو زیادہ قدر کے قابل ہیں اور یہ بلا علم کے پیدا نہیں ہو سکتیں۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں ؎

با فہم و عقل و دانش داد سخن تواں داد چوں جمع شد معانی گوئے بیاں تواں زد

ذوقِ صحیح جذباتِ عالیہ کی ان لطیف تحریکات پر وجد کرتا ہے جن سے دل کے تار بجتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر اقبال کی شاعری اہلِ فہم کی دماغی راحت اور روحانی لذت کے لئے ایک میوۂ پُرمایہ ہو گئی کیونکہ وہ علومِ دینی و دنیوی اور مشرقی و مغربی کے مجمع البحرین ہیں۔ ذوقِ صحیح دل درد مند اور طاقت لسانی رکھتے ہیں۔ ان کی چشمِ بصیرت انسانی خیالات کی انتہائی بلندیوں پر پہنچی ہوتی ہے اور ان کے دیدۂ تخیل کے سامنے سے زمین سے آسمان تک کے پردے اٹھے ہوئے ہیں۔ وہ عرش کے پایوں

میں جھومتے ہیں۔ مرغانِ اولی اجنحہ کے ساتھ اڑتے ہیں۔ ساکنانِ حرم قدس سے ملتے ہیں۔ بزمِ انجم وکواکب کے رموز سنتے ہیں، شبنم اور آفتاب کے باہمی راز، گل و بلبل کے رازونیاز اور شمع و پروانہ کے سوز و ساز سے آشنا ہیں۔ پہاڑوں کی چٹانوں میں برق کی موجیں، سمندروں کی موجوں میں زندگی کی لہریں، قطرۂ اشک میں سوزشِ دل کا تب وتاب اور دانۂ گوہر میں حیاتِ معنوی کی آب دیکھتے ہیں۔

غرض عالمستانِ معنی ہے جس کے چپے چپے اور گوشے گوشے سے جواہر پارے چنتے ہیں۔ اور جذباتِ ملیّہ و دینیہ کا پیکرستان تیار کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ اس قدر تیز ہے کہ ایک ہی چیز پر نہیں رکتی بلکہ نتائج سے اسباب اور اسباب سے متعلقات پر بلندی سے پستی تک اور خشکی سے تری تک ایک ساتھ دوڑ جاتی ہے۔

تہدیہ

کتاب کو کسی کے نام سے معنون کر دینا ایک عام رسم ہو گئی ہے حالانکہ اس کا موقع صرف وہ ہے جب کہ کتاب کے مقصد کو اس سے مدد مل سکے۔ ورنہ اہلِ نظر اس کو کتاب کی خواری اور مصنف کی سبکساری کی دلیل سمجھتے ہیں۔

اس سے پیشتر ڈاکٹر صاحب کی ایک مثنوی کا تہدیہ میری نظر سے گزرا تھا جس کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی کہ اللہ اکبر۔ اسرارِ خودی کی تعلیم اور اس پر یہ بے خودی ــــ

چہ روئے خویش در آئینہ میتوانی دید　　　　چرا نظر بر جمال کسے دگر داری

شکر ہے کہ اس دیوان کے بارے میں مجھے یہ شکایت نہیں ہے کیونکہ اس میں انہوں نے کسی شخص کو نہیں بلکہ درحقیقت ایک قوت کو خطاب کیا ہے جو ان تعلیمات کی جو اس کتاب میں دی گئی ہیں۔ صحیح مخاطب ہے۔ یعنی امیر امان اللہ خاں فرمانروائے افغانستان۔

خطاب کا مضمون اور انداز نہایت دلکش اور بلیغ ہے، عالمِ اسلامی کی موجودہ حالت کا صحیح نقشہ صرف چند سطروں میں کھینچ دیا ہے۔

دیدۂ اے خسرو کیواں جناب　　　　آفتاب ما توارت بالحجاب
ابطحی در دشتِ خویش از راہ رفت　　　　از دمِ او سوزِ الا اللہ رفت

مصریاں افتادہ در گرداب نیل
سست رگ تورانیاں ژندہ پیل

آلِ عثماں در شکنج روزگار
مشرق و مغرب ز خونش لالہ زار

عشق را آئین سلمانی نماند
خاکِ ایراں ماند و ایرانی نماند

سوز و سازِ زندگی رفت از گلش
آں کہن آتش فسرد اندر دلش

مسلمِ ہندی شکم را بندہ
خود فروشے، دل ز دیں برکندہ

در مسلماں شانِ محبوبی نماند
خالدؓ و فاروقؓ و ایوبیؒ نماند

درخواست یہ ہے :۔

اے ترا فطرت ضمیرِ پاک داد
از غمِ دیں سینۂ صد چاک داد

جانِ تو بر محنتِ پیہم صبور
کوش در تہذیبِ افغانِ غیور

تا ز صدیقانِ ایں امت شوی
بہرِ دیں سرمایۂ قوت شوی

لالۂ طور

دیوان کا پہلا جزو ہے اس میں ۱۵۵ قطعات ہیں جو ایک ہی وزن پر ہیں۔ یہ فلسفۂ زندگی کے اسرار اور معدنِ حکمت کے گوہر ہائے آبدار ہیں، دو چار درج کرتا ہوں۔

دل من روشن از سوز درون است
جہاں بیں چشم من از اشک خون است

ز رمزِ زندگی بیگانہ تر باد
کسے کو عشق را گوید جنون است

دمادم نقش ہائے تازہ ریزد
بیک صورت قرارِ زندگی نیست

اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است
بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

مگو کارِ جہاں نا استوار است
ہر آں ما ابدا پردہ دار است

بگیر امروز را محکم کہ فردا
ہنوز اندر ضمیرِ روزگار است

رمیدی از خداونداں افرنگ
ولے بر گردِ گنبد سجدہ پاشی

بہ لالائی چناں عادت گرفتی
ز سنگِ راہ مولائے تراشی

بملازمان سلطان خبرے دہم ز رازے کہ جہاں تواں گرفتن بہ نوائے دلگدازے
بمتاع خود چہ نازی کہ بہ شہر دردمنداں دل غزنوی نیرزد بہ تبسم ایازے
ہمہ ناز بے نیازی، ہمہ ساز بے نوائی دل شاہ لرزہ گیرد ز گدائے بے نیازے
ز مقام من چہ پرسی بہ طلسم دل اسیرم نہ نشیب من نشیبے نہ فراز من فرازے
رہ عاشقی رہا کن کہ بہ او تواں رسیدن بہ دل نیازمندے بہ نگاہ پاکبازے
بہ سر تو ناتمامم، ز تغافل تو خامم من و جان نیم سوزے تو و چشم نیم بازے
رشد بر تخت گل ز جبین سجدہ ریزم کہ نیاز من نگنجد بہ دو رکعت نمازے

ز ستیز آشنایاں چہ نیاز و ناز خیزد
دلکے بہانہ سوزے، نگہے بہانہ سازے

ز خاک خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست تجلی دگرے در خور تقاضا نیست
اگرچہ عقل فسوں پیشہ لشکرے انگیخت تو دل گرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست
تو رہ شناس نہ ای و ز مقام بے خبری چہ نغمہ ایست کہ در بربط سلیمی نیست
نظر بخویش چناں بستہ ام کہ جلوۂ دوست جہاں گرفت و مرا فرصت تماشا نیست
بیا کہ غلغلہ در شہر دلبراں فگنیم جنون زندہ دلاں ہرزہ گرد صحرا نیست
ز قید و صید نہنگاں حکایتے آور مگو کہ زورق ما روشناس دریا نیست
مرید ہمت آں رہروم کہ پا نگذاشت بہ جادۂ کہ درو کوہ و دشت و دریا نیست
شریک حلقۂ رنداں بادہ پیما باش حذر ز بیعت پیرے کہ مرد غوغا نیست

برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی ست
حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

ایک غزل میں ایک شعر کیا بلند حوصلگی کا کہا ہے۔

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

مولانا روم نے بھی فرمایا ہے۔

زیر کنگرۂ کبریاش مردانند فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

گردید موج نکہت و از شاخ گل دمید — یا ایں چنیں بعالم فردا ودے نہاد
وا کرد چشم و غنچہ شد و خندہ زد دمے — گل گشت و برگ برگ شد و بر زمیں فتاد

زاں نازنیں کہ بند ز پایش کشادہ اند
آہے است یادگار کہ تو نام دادہ اند

شاہین و ماہی کی گفتگو کس قدر ترانہ انگیز لہجہ میں لکھی ہے۔

ماہی بچۂ شوخ بشاہیں بچہ گفت — ایں سلسلۂ موج کہ بینی ہمہ دریاست
با سیل گراں سنگ زمیں گیر و سبک خیز — با گوہر تابندہ و با لولوئ لالاست
بیروں نتواں رفت ز سیل ہمہ گیرش — بالائے سر ماست تہ پاست ہمہ جاست
ہر لحظہ جواں است و رواں است و دواں است — از گردش ایام نہ افزوں شد و نے کاست
ماہی بچہ را سوز سخن چہرہ برافروخت — شاہیں بچہ خندید و ز ساحل بہ ہوا خاست
زد بانگ کہ شاہینم و کارم بزمیں چیست — صحراست کہ دریاست تہ بال و پر ماست

مے باقی

یہ مسلسل مجموعہ بھی کم و بیش چالیس صفحوں کا ہے۔ اس میں غزلیں جن کی زبان کی سلاست ترنم ریز اور معنوی لطافت وجد انگیز ہے دو ایک نمونتاً درج کرتا ہوں۔

می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر — رست از یک بند تا افتادہ در بندے دگر
بر سر بام آ و نقاب از چہرہ بے باکانہ کش — نیست در کوئے تو چوں من آرزومندے دگر
بسکہ غیرت می برم از دیدۂ بینائے خویش — از نگہ بافم برخسار تو روبندے دگر
یک نگہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک — بہر پیمان محبت نیست سوگندے دگر
عشق را نازم کہ از بے تابیٔ روز فراق — جان ما را بست با درد تو پیوندے دگر
تا شوی بے باک تر در نالہ اے مرغ بہار — آتشے گیر از حریم سینہ ام چندے دگر

رہ مدہ در کعبہ اے پیر حرم اقبال را
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

افکار

دیوان کا دوسرا جز کم و بیش ۱۰۰ صفحے ہے۔ اس میں مختلف عنوانات پر نظمیں ہیں۔ ہلال عید کے متعلق کہتے ہیں۔

نتواں ز چشم شوق رمید اے ہلال عید   از صد نگہ براہ تو دامے نہادہ اند
بر خود نظر کشا ز تہی دامنی مرنج   در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

تسخیر فطرت کے عنوان سے ابلیس و آدم کا جو قصہ لکھا ہے اس کا پرواز نہایت شاندار ہے۔ سجدہ سے انکار کے وقت ابلیس کا متکبرانہ لہجہ اس کی تعلی کی کیسی عجیب تصویر ہے۔

نوریٔ ناداں نیم سجدہ بآدم برم !   او بہ نہاد است خاک، من بہ نژاد آذرم!
می تپد از سوز من، خون رگ کائنات   من بہ دو صرصرم، من بہ غو تندرم
من ز تنک مایگاں گدیہ نکردم سجود   قاہر بے دوزخم، داور بے محشرم

آدم ایک نافرمان لڑکے کی طرح جو باپ کے گھر سے نکلتے ہی آزادی کا سانس لیتا ہے جنت سے خارج ہوکر خوشی کا راگ گاتا ہے۔ یہ راگ نہایت دلفریب ہے خاصکر یہ شعر ـــ

بگداز ہائے پنہاں، بہ نیاز ہائے پیدا   نظرے ادا شناسے بحریم ناز کردن

لیکن صبح قیامت کو جناب باری میں اس کا یہ جواب :۔

تا شود از آہِ گرم ایں بتِ سنگیں گداز   بستنِ زنّارِ او بود مرا ناگزیر
عقل بدام آورد فطرتِ چالاک را
اہرمن شعلہ زاد سجدہ کند خاک را

مبہم ہے۔ اس کے سمجھنے سے میں قاصر رہا۔ کیوں کہ ابلیس کی تعبیر فطرتِ چالاک کے ساتھ کس طرح قرآن سے مطابقت نہیں کھاتی۔

بوئے گل کی حقیقت پر شاعرانہ تخیل کی لطافت قابل دید ہے۔

حورے بکنج گلشن جنت تپید و گفت   مارا کسے ازاں سوئے گردوں خبر نداد
ناید بفہم من سحر و شام و روز و شب   عقلم ربود اینکہ بگویند مُرد و زاد

لیکن شاعرانہ خیالات کا تضاد احسنِ تقویم اور اسفل سافلین کا کیسا صحیح منظر پیش کرتا ہے کہ کہاں آدمِ خاکی کا یہ جوش و خروش اور کہاں وہ نگاہ میں اس قدر حقیر کہ اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ :-

نقشِ دگر طراز دہ آدمِ پختہ تر بیار   لعبتِ خاک ساختن می نہ سزد خدائے را

نقشِ فرنگ

یہ حصہ جو ۴۰ صفحے سے کچھ کم ہے۔ اس میں اہلِ مغرب کے خیالات اور ان کے متعلق رائیں ہیں۔ ان مضامین سے ایشیائی شاعری اب تک قطعاً روشناس نہ تھی۔ آغاز اس پیام سے ہوتا ہے۔

از من اے بادِ صبا گوئے بہ دانائے فرنگ   عقل تا بال گشود است گرفتار تر است
برق را این بہ جگر می زند، آں رام کند   عشق از عقلِ فسوں پیشہ جگردار تر است
چشم جز رنگِ گل و لالہ نہ بیند، ورنہ   آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است
عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری   عجب آنست کہ بیمارِ تو بیمار تر است
علم و حکمت اگرش خوئے سگی باز دہد   آدمی زادۂ دانا، ز دداں خوار تر است
خواجہ را قیمتِ عیش است اگر مزدِ غلام   بندہ آزاد تر و خواجہ گرفتار تر است

رفتگانِ عالمِ بالا کی صحبت بھی نہایت دلچسپ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مغربی حکما نے وہاں جاکر سیاسی مذاکرے شروع کر دیئے ہیں۔ روس کا مشہور حکیم ٹالسٹائی کہتا ہے۔

بارکشِ اہرمن لشکریِ شہریار   از پئے نانِ جویں تیغِ ستم برکشید
زشت بہ چشمش نکوست مغز نداند ز پوست   مردکِ بیگانہ دوست، سینۂ خویشاں درید!
دلدۂ بیہوشی است تاج، کلیسا، وطن   جانِ خداداد را خواجہ بہائے خرید!

مزدک ایران کے اباحیہ مذہب کا پیشوا اپنی تعلیم کو کامیاب دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

دانۂ ایراں ز کشتِ زار و قیصر بردمید   مرگِ نو می رقصد اندر قصرِ سلطان و امیر
مدتے در آتشِ نمرود می سوزد خلیل   تا تہی گردد حرم از خداوندانِ پیر
دورِ پرویزی گذشت اے کشتۂ پرویز خیز!   نعمتِ گم گشتۂ خود را ز خسرو باز گیر

"کشتۂ پرویز" ناکام گرسنہ مزدور، طرب گاہ رقیب کوہ کن بھی اس مجلس میں شامل ہے۔ وہ کہتا ہے:

نگارِ من کہ بسے سادہ و کم آمیز است | ستیزہ کیش و ستم کوش و فتنہ انگیز است
برونِ او ہمہ بزم و درونِ او ہمہ رزم | زبانِ او ز مسیح و دلش ز چنگیز است
اگرچہ تیشۂ من کوہ را ز پا آورد | ہنوز گردشِ گردوں بکامِ پرویز است

ایک نظم میخانۂ فرنگ کی یاد میں ہے۔ اس میں کہتے ہیں۔

چشمِ مست مے فروشش بادہ را پروردگار | بادہ خوارانِ نگاہِ ساقیش پیغمبر است

یہی وہ جرم ہے جس پر ملا شیدا اصفہانی، شاہجہانی علماء کے فتوٰی کی بنیاد پر دہلی سے نکالا گیا تھا۔ اس نے کہا تھا:۔

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفّا جوہرے | حسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

مولانا نظامی گنجوی کا یہ قطعہ بہت مشہور ہے اور اکثر ایرانی استادوں نے اس کے جوابات لکھے ہیں۔

دوش رفتم بخرابات و مرا راہ نبود | می زدم نالہ و فریاد کس از من نشنود
یا نبد ہیچ کس از بادہ فروشاں بیدار | یا کہ من ہیچ کسم ہیچ کسم در نکشود
پاسے بگذشت ز شب بیشتر یا کمتر | رندے از غرفہ برون کرد سر و رخ بنمود
گفت خیر است دریں وقت کرا میخواہی | بے محل آمدنت بر در ما بہر چہ بود
گفتمش در بکشا گفت برو ہرزہ مگوئے | کاندریں وقت کسے بہر کسے در نکشود
ایں خرابات مغانست درو رندانند | مومن و برہمن و گبر و نصارا و یہود

گر تو خواہی کہ دم از صحبتِ ایشاں بزنی
خاکِ پائے ہمہ شو تاکہ بیابی مقصود

ڈاکٹر صاحب، خرابات فرنگ کے عنوان سے اسی نہج پر ایک قطعہ لکھتے ہیں۔

دوش رفتم بہ تماشائے خراباتِ فرنگ | شوخ گفتاریٔ رندے دلم از دست ربود
گفت ایں نیست کلیسا کہ بیابی در وے | صحبتِ دخترکِ زہرہ وشے و نائے و سرود

این خرابات فرنگست و ز تاثیر میش — آنچہ مذموم شمارند، نماید محمود
نیک و بد را بترازوئے دگر سنجیدیم — چشمہ داشت ترازوئے نصاریٰ و یہود
خوب زشت است اگر پنجۂ گیرات شکست — زشت خوبست اگر تاب و توانِ تو فزود
تو اگر در نگری جز بہ ریاضیت حیات — ہر کہ اندر گرو صدق و صفا بود نبود
دعویٰ صدق و صفا پردۂ ناموس ریاست — پیر ما گفت مس از سیم بباید اندود
فاش گفتم بتو اسرار نہانخانۂ زیست — بیکے باز مگو تا کہ بیابی مقصود

دول مغربیہ نے جو جمعیت اقوام قائم کی ہے وہ شاعر کو اس شکل میں نظر آتی ہے۔

برفتد تا روش رزم دریں بزم کہن — دردمندانِ جہاں طرح نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند — بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

دردمندانِ جہاں کا لفظ خاص توجہ کے قابل ہے۔
مولانا وحشی کا یہ قطعہ "براور تقسیم نا برابر" مشہور ہے۔

زیبا ترا انچہ ماندہ ز بابا از آن تو — بدائے برادر از من و اعلیٰ از آن تو
این طاس خالی از من و آں کوزہ کہ بود — پا بینۂ پُر ز شہد مصفا از آن تو
یا بوئے رلیساں گسل و ریخ کن ز من — مہمیز کلہ تیز مطلا از آن تو
این دیگ لب شکستۂ صابون پزی ز من — واں چمچۂ حریسہ و حلوا از آن تو
این استر خوش لگدزن از آن من — واں گربۂ مصاحب بابا از آن تو
از صحن خانہ تا بلب بام از آن من
وز بام تا بہ سقف ثریا از آن تو

اسی لطیف طرز پر ڈاکٹر صاحب نے قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور لکھا ہے۔

غوغائے کارخانۂ آہنگری ز من — گلبانگِ ارغنونِ کلیسا از آن تو
نخلے کہ شہ خراج بروی نہد ز من — باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ از آن تو
تلخابہ کہ درد سر آرد از آن من — صہبائے پاک آدم و حوا از آن تو
مرغابی و تدرو و کبوتر از آن من — ظلِ ہما و شہپرِ عنقا از آن تو

این خاک وانچہ در شکم او از آن من
وز خاک تا بہ عرش برین ملک آن تو

پیغام

عجمی شاعری نے بقول لعل حسن و عشق کے گہوارہ اور سلاطین و امراء کی مداح کے آغوش میں پرورش پائی۔ کچھ زمانہ کے بعد صوفیانہ خیالات کے بزرگوں نے اس پر تصوف کا رنگ چڑھایا۔ خاص کر مولانا نے روم نے اس صور کو اس بلند آہنگی سے پھونکا کہ شاعری نے حریم دین میں بار پالیا۔ یہاں تک کہ آج بھی مسجدوں کے منبروں پر سے ان کی آواز بالکشف سنائی دیتی ہے۔

اب زمانے نے دوسری کروٹ بدلی اور امت اسلامیہ غیروں کے پنجۂ تسلط میں پڑ کر مصائب و آلام میں مبتلا ہو گئی۔ اس وجہ سے شاعری نے بھی نیا رنگ اختیار کیا اور اس کے ساز پر قومی اور وطنی راگ گائے جانے لگے۔ مصر، ایران، ہندوستان نیز افغانستان ہر جگہ شاعری سے یہ کام لیا جانے لگا۔

ہم ان تمام نغموں کو سنتے ہیں، لیکن ان سب میں ڈاکٹر صاحب کی لے ایک جداگانہ انداز رکھتی ہے جو دو باتوں میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز نظر آتی ہے۔

(۱) ان قومی شعراء کی نگاہیں اپنی قومی اور ملکی حدود سے باہر کم پہنچتی ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر کل امت اسلامیہ ہے۔ یعنی ان کا خطاب صرف جذبۂ اسلامی سے ہے نہ کہ ایرانی یا تورانی سے۔ اس لئے اوروں کے کلام کو ہم صرف "قومیات" یا "وطنیات" کہہ سکتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کی نظمیں "ملیات" کے لقب کی مستحق ہیں۔

(۲) دوسرے شعراء جذبات عام کو لے کر نظم کا لباس پہناتے ہیں، بخلاف اس کے ڈاکٹر صاحب کی طبع خداداد حیات ملیہ کے اسرار خود اخذ کر کے ان کو شاعری کے قالب میں ڈھالتی ہے۔

کسی کا قول ہے۔

اگرچہ شاعران نغز گفتار ۔۔۔ زیک جامند در بزم سخن مست
ولے با بادہ بعضے حریفاں ۔۔۔ خمار چشم ساقی نیز پیوست
مبیں یکساں کہ در اشعار این قوم ۔۔۔ ورائے شاعری چیزے دگر ہست

"چیزے دگر" وہی رموزِ لطیفہ ہیں جن کو پیغامی شاعر کے سوا کوئی دوسرا نہیں پاسکتا۔ ڈاکٹر صاحب اُمّتِ اسلامیہ کے لئے ایک پیغام رکھتے ہیں ان کا یہ دعویٰ ہے۔

بخامۂ کہ خطِ زندگی رقم زدہ است　　نوشتہ اند پیامے بہ برگِ رنگینم

وہ اپنا پیغام بھی صاف ظاہر کرتے ہیں۔

ز شاخِ آرزو برخوردہ ام من　　بہ رازِ زندگی پے بردہ ام من
بترس از باغباں اے ناوک انداز　　کہ پیغامِ بہار آوردہ ام من

ان کے پیغامی شاعر ہونے کے متعلق غالباً آئندہ آنے والے ہم سے بہتر لکھ سکیں گے۔

عجمی شاعری جس نے تصوّف کی خدمت گزاری کی اس میں اور ڈاکٹر صاحب کی شاعری میں بھی بڑا فرق ہے۔ وہ فنا اور نفس کشی کی تلقین کرتے ہیں اور یہ خودی اور زندگی کی۔ وہ تند مزاجوں کو برف بناتی تھی اور یہ افسردہ دلوں کو برق۔

تعلیمات

ڈاکٹر صاحب حسن و عشق کے شاعر نہیں ہیں بلکہ ان کے دل کو اللہ تعالیٰ نے حیاتِ ملّیہ کے اسرار سے بھر دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

تا مرا رمزِ حیات آموختند　　آتشے در سینہ ام افروختند
یک نوائے سینہ تاب آوردہ ام　　عشق را عہدِ شباب آوردہ ام
آشنائے من زمن بیگانہ رفت　　از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہِ خسروی اورا دہم　　تختِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم
او حدیثِ دلبری خواہد زمن　　رنگ و آبِ شاعری خواہد زمن
کم نظر بیتابیٔ جانم ندید　　آشکارم دید و پنہانم ندید
فطرتِ من عشق را در بر گرفت　　صحبتِ خاشاک و آتش در گرفت
حق رموزِ ملک و دیں بر من کشود　　نقشِ غیر از پردۂ چشمم ربود

ان کی ساری شاعری انہیں رموز کی تعلیمات سے لبریز ہے، یہاں تک کہ قطعات اور غزلیات

بھی۔ اس جگہ اجمالاً چند عنوانات لکھتا ہوں۔

خودی

یہ ڈاکٹر صاحب کا خاص مضمون ہے۔ جس پر ان کی مستقل مثنوی موجود ہے۔ خودی سے مراد خود پسندی نہیں بلکہ خود شناسی ہے۔ یہ مجموعہ بھی اس تعلیم سے خالی نہیں۔ فرماتے ہیں۔

چہ پرسی از کجایم چیستم من   بخود پیچیدہ ام تا زیستم من
دریں دریا چو موجِ بے قرارم   اگر بر خود نہ پیچم نیستم من

شبنم

گفتند فرود آے ز اوجِ مہ و پرویز   بر خود زن و با بحرِ پُر آشوب بیامیز
با موج در آویز
نقش دگر انگیز
تابندہ گہر خیز

من عیش ہم آغوشیِ دریا نخریدم   آں بادہ کہ از خویش رباید نچشیدم
از خود نرمیدم
ز آفاق بریدم
بر لالہ چکیدم

زندگی

اس عالم کائنات کا ذرہ ذرہ سرگرم پیکار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ یہی پیکار اصل زندگی ہے۔ اخلاقیات کے نامور معلم شیخ سعدی نے کہا تھا کہ۔

اگر خواہی سلامت بر کنار است

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا   نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز   حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

غالباً مولانا بیدل نے کسی غزل میں کہا ہے "بشکند رنگم حبابے چوں بدریا بشکند" اس پر کہتے ہیں۔

از نزاکتہائے طبع موشگافِ او مپرس   کو دم بادے زجاج شاعرِ ما بشکند
کے تو اند گفت شرح کارزارِ زندگی   می پرد درنگش، حبابے چوں بدریا بشکند

وہ اس عالم ہی کو پسند نہیں کرتے جس میں یزداں کے مقابلے میں اہرمن نہ ہو۔

مزی اندر جہانِ کور ذوقی   کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

عمل

ڈاکٹر صاحب کا سارا کلام درحقیقت درسِ عمل ہے۔ ستاروں کی زبان سے فرماتے ہیں۔

خنک انساں کہ جانش بے قرار است   سوارِ راہ دارِ روزگار است
قبائے زندگی بر قامتِ راست   کہ او نو آفرین و تازہ کار است

ہاتف کے جواب میں کہا ہے۔

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم   ہیچ نہ معلوم شد، آہ کہ من چیستم
موج زخود رفتۂ تیز خرامید و گفت   ہستم اگر میروم، گر نروم نیستم

اسلام

ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا اصلی سرچشمہ قرآن عظیم ہے۔ اسی کی رموز کو لے کر وہ اس ساز پر نغمہ سرائی کرتے ہیں۔ وہ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ دینِ اسلام ہر قسم کی انسانی اصلاح و فلاح پر حاوی اور دینی و دنیوی ترقیات کا کفیل ہے۔ ایک غزل میں کہتے ہیں۔

تو رہ شناس نئی وز مقام بے خبری   چہ نغمہ ایست کہ در بربطِ سلیمیٰ نیست

ایک دوسری غزل میں کہا ہے۔

بر کشش آن نغمہ کہ سرمایۂ آبِ گِل است — اے ز خود رفتہ تہی شو ز نوائے دگراں

مغربی تہذیب جو بدبختی سے مسلمانوں کی نگاہوں کو خیرہ کئے ہوئے ہے، ان کے نزدیک نہایت نااستوار بنیاد پر قائم ہے اور وہ ایک ملمع کاری ہے جس کی تہہ میں انسانیت اور ہمدردی کا نام و نشان نہیں ہے۔ فرماتے ہیں :۔

فرنگ گرچہ سخن با ستارہ می گوید — حذر کہ شیوۂ او رنگ جوزنی دارد

مدہوش اگر نہی یک آبگینہ با دنیست — رہ ایں میخانہ را یک لغزش مستانہ نیست

مسلمانوں پر تہہ ہائے دیرینہ سے عجمی ادبیات نے اثر ڈال کر ان میں جو افسردگی پیدا کر رکھی ہے اس سے بھی سخت بیزار ہیں اور پھر ان کو اصل عربی اسلامی رنگ میں لانا چاہتے ہیں کہتے ہیں :۔

دگر بدشت عرب خیمہ زن کہ بزم عجم — مے گذشتہ و جامے شکستنی دارد

اخوۃِ اسلامی

مسلمانوں نے جہالت کی وجہ سے جو نسلی امتیازات پیدا کر کے باہمی تفرقے ڈال رکھے ہیں ان کو وہ حرام سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ قرآن نے کل مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا ہے اور یہی اخوت اسلامی ملت کی اصلی طاقت ہے۔ فرماتے ہیں :۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم — چمن زادیم و از یک شاخساریم

تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است — کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

محنت

دنیا میں ہر شخص فطرتاً اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اس کی محنت کا کل ثمرہ اس کو ملے، لیکن دولِ مغربیہ کی سرمایہ پرستی کی وجہ سے عالم کی اقتصادی حالت اس قدر پیچ در پیچ ہو گئی ہے کہ مزدور اپنا پورا حق نہیں پا سکتا بلکہ سرمایہ دار بھی اس میں شریک ہو جاتا ہے۔ یورپین ممالک میں سرمایہ اور محنت کی جنگ نہایت اہمیت پکڑ گئی ہے اور کچھ تعجب نہیں کہ روس کی طرح دیگر مغربی سلطنتیں بھی اس کی رَو میں بہہ جائیں۔

ڈاکٹر صاحب سرمایہ داری کے خلاف جہادِ عظیم میں مصروف ہیں۔ موسیو لینن صدر جمہوریہ روس کی زبان سے کہتے ہیں۔

بے گذشت کہ آدم دریں سرائے کہن مثالِ دانہ تہِ سنگ آسیا بود است
فریب زاری و افسونِ قیصری خورد است اسیرِ حلقۂ دامِ کلیسا بود است
غلام گرسنہ دیدی کہ بردرید آخر قمیصِ خواجہ کہ رنگین زخونِ ما بود است

کارل مارکس کی زبان سے جو رفتگانِ عالمِ بالا میں سے ہے، یہ آواز سنائی دیتی ہے۔

راز دانِ جزو و کُل از خویش نامحرم شدہ است آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شدہ است

ٹالسٹائی کہتا ہے۔

عقل دور و آفرید فلسفۂ خود پرست درسِ رضا میدہد بندۂ مزدور را ؟

یہ درد ان کے دل میں اس قدر ہے کہ کشمیر جنت نظیر کے دل فریب مناظر میں بھی اس کو نہیں بھولتے۔

کشمیری کہ پابندگی خو گرفتہ بتے می تراشد ز سنگِ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے خودی ناشناسے ز خود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او نصیبِ تنش جامۂ تارتارے
نہ در دیدۂ او فروغِ نگاہے نہ در سینۂ او دلِ بیقرارے

تبلیغ اسلام

اسلام کی تبلیغ اہم ترین فریضۂ اُمت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس زمانے میں جو بعض ہندوستانی مغربی ممالک میں تبلیغ کے لئے جاتے ہیں یہ کہاں تک بجا ہے، جبکہ خود ہندوستان اور اس کے ہمسایہ ممالک میں لاکھوں کروڑوں مسلمان جاہل اور گمراہ پڑے ہوئے ہیں۔ غیروں کو مسلمان بنانے کی بہ نسبت ان کی تعلیم اور ہدایت مقدم ہے۔ اسی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب فرنگستان کے دنیا پرستوں میں تبلیغ کی اس وقت ضرورت نہیں سمجھتے اور ایسے مبلغوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

زمانہ باز بر افروخت آتشِ نمرود کہ آشکار شود جوہرِ مسلمانی

بیا کہ پردہ ز داغِ جگر بر اندازیم | کہ آفتاب جہانگیر شد ز عریانی
ہزار نکتہ ندی پیشِ دلبرانِ فرنگ | گدا حق صنماں را بعلم بر بانی
خبر ز شہرِ سلیمیٰ بدہ حجازی را | شرارِ شوقِ فشاں در ضمیر تورانی
بہ عراق و خراساں زن اے مقام شناس | بہ بزمِ اعجمیاں تازہ کن غزل خوانی
بسے گذشت کہ در انتظارِ زخمہ زلیست | چہ نغمہا کہ نہ خوں شد بہ سازِ افغانی
حدیثِ عشق باہلِ ہوس چہ میگوئی | بچشمِ مور مکش سرمۂ سلیمانی

جمہوریت

ڈاکٹر صاحب کا سارا کلام دیکھنے سے یہ صاف نمایاں ہوتا ہے کہ ان کا آپ کُل حریت اور مساوات اور خمیر جمہوریت کا ہے لیکن ان کا یہ قول ہے۔

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو | کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

نہایت تعجب انگیز ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ "پختہ کار" صاحب بھی "خر تا" شخص نکلے تو پھر کیا ہوگا۔ کیونکہ یہ کون کہہ سکتا تھا کہ ملائکہ کا جو استاد ہے وہی راندۂ درگاہ اور ملعونِ بارگاہ ہوگا۔ وہ غریب خود اس سے بے خبر تھا۔ چنانچہ کہتا ہے۔

برلوح ثبت بود کہ ملعون شود یکے | بردم گماں بہر کس و بر خود گماں نبود

اس میں کچھ شک نہیں کہ رائے صواب ہر معاملہ میں صرف ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ایک شخص سے حاصل کی جائے یا ایک جماعت سے۔ مشورے میں دو فائدے ہیں۔

(۱) نتیجہ خراب ہونے کی صورت میں ملامت کا خوف نہیں رہتا۔ اسی بنیاد پر رسول اکرم کو بھی جن کی رائے کے قطعی درست ہونے میں شبہ نہیں تھا "شاورهم في الامر" کا حکم دیا گیا۔

(۲) بہ نسبت ایک شخص کے جماعت میں اغلباً مذاق صحیح موجود ہوتا ہے اس لئے عام مسلمانوں کے لئے "امرهم شوریٰ بینهم" نازل ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے کی کوئی توجیہ میری سمجھ میں بجز اس کے نہیں آتی کہ میں اس کو ان کی تعلیمات سے نکال کر مطائبات میں شمار کر لوں۔[1]

---

[1] غالباً ڈاکٹر صاحب کا مقصد ڈکٹیٹر شپ ہے لیکن وہ بھی بادشاہت سے کم نقصان رساں نہیں ہے۔

خاتمہ

ڈاکٹر صاحب کا کلام اگرچہ تمام تر آورد ہے۔ لیکن اس میں انتہائی لطافت اور انتہائی ایجاز ہے۔ یعنی فصاحتِ لفظی اور بلاغتِ معنوی دونوں کی پوری پوری رعایت ملحوظ ہے جو مضمون ہے وہ نہایت صاف برجستہ اور نکتہ سنجی اور ندرتِ خیال کا پسندیدہ نمونہ ہے۔ اندازِ بیان اور طرزِ ادا انوکھا اور دلکش ہے۔ ان کی توجہات خیالات کی رفعت اور معانی کی بلندی کی طرف زیادہ رہتی ہے۔ صنائع و بدائع اور تشبیہات و استعارات کے پیچھے وہ نہیں پڑتے لیکن باوجود اس کے لفظوں کی لطافت اور ترکیبوں کی نزاکت کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

ان کا قدم کسی کے جادۂ تقلید سے قطعاً بری ہے۔ ممکن ہے کہ مغزِ سخن انہوں نے مولانائے روم سے اخذ کیا ہو لیکن اپنا راستہ جو بالکل اچھوتا اور نیا ہے خود ہی نکالا ہے۔

ان کا پیام شاعری اس سوگواری کی تلخی سے بھی پاک ہے جو قومی مرثیہ گوئیوں کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ وہ ماضی کے ماتمی نہیں ہیں، بلکہ شاندار مستقبل کے مژدہ گو ہیں۔ ان کی شگفتہ طبیعت ایک بلبل ہے جو خزاں کی نوحہ خوانی نہیں کرتی، بلکہ بہار کی آمد کا نغمہ گاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری سے ملّتِ جدیدہ کی دماغی تعمیر میں بہت بڑا حصہ لے رہے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جاوید نامہ

نوشتہ ۱۹۳۲ء

ان دنوں ڈاکٹر اقبال کی جدید تصنیف جاوید نامہ کے مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ ان کی دیگر تصنیفات کی طرح یہ کتاب بھی دماغی لذت اور روحانی کیف کے لئے ایک لطیف نعمت ہے۔ بلکہ اس میں ایک جدت یہ ہے کہ شاعر نے پیر رومی کے ساتھ افلاک کی سیر کی ہے۔ مختلف سیاروں میں ارواح اور ملائکہ سے ملاقات ہوئی، جن کے ساتھ حقائق اور عہد حاضر کے اہم مسائل پر سوالات اور جوابات ہوئے۔

پہلے فلک قمر پر رسائی ہوتی ہے۔ جہاں ایک ہندوستانی سادھو ایک غار میں نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ گفتگو ہوتی ہے۔ اور وہ نو وصیتیں کرتا ہے۔ خاتمہ پر ایک فرشتہ نمودار ہوتا ہے جو ایک دلکش نغمہ گا کر غائب ہو جاتا ہے۔ پھر وادی طواسین میں پہنچتے ہیں۔ طاسین گوتم میں ایک زن رقاصہ مہاتما موصوف کے ہاتھ پر توبہ کرتی ہے۔ طاسین زرتشت میں آہرمن زرتشت کو آزماتا ہوا دکھائی دیتا ہے طاسین مسیح میں حکیم طالسٹائی کا ایک حقیقت نما خواب ہے۔ اور طاسین محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں حرم کعبہ میں ابوجہل کا نوحہ۔

فلک عطارد پر جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا (ترکی وزیر) کی روحوں سے ملاقات ہوتی ہے اور ان کے ساتھ وقت کے ضروری اسلامی مہمات پر گفتگو چھڑ جاتی ہے۔

فلک زہرہ پر اقوام قدیمہ کے دیوتاؤں کی محفل ملتی ہے جس میں ان کے سنئے نغمے سنائی دیتے ہیں۔ پھر دریائے زہرہ میں فرعون اور کچنر کی روحیں دکھائی دیتی ہیں۔ وہاں سوڈانی درویش (مہدی) نکلتا ہے اور عربی روح کی بیداری کے لئے نغمہ سناتا ہے۔

فلک مریخ میں پہلے ایک رصدگاہ ملتی ہے جس سے مریخی حکیم برآمد ہوتا ہے جو زمین کی بھی سیاحت کر چکا ہے۔ پھر ایک فرنگن جو پیغمبری کی مدعی ہے، عورتوں کے مجمع میں دکھائی دیتی ہے اور ان کو آزادی یعنی شوہروں سے بھی آزادی کا پیغام دیتی ہے۔

فلک مشتری میں ان روحوں سے ملاقات ہوتی ہے جنہوں نے سیر جاودانی اختیار کی اور جنت میں رہنا پسند نہیں کیا۔ مثلاً حلاج (منصور) غالب (اسداللہ خاں) اور قرۃ العین (بابی مبلغہ)۔ ان کے ساتھ خوب خوب شاعرانہ گفتگو ہوتی ہے۔ آخر میں ابلیس نظر آتا ہے اور انسان کی کمزوری اور اپنی آسان فتوحات پر ماتم کرتے ہوئے کسی مردِ حق کی آرزو کرتا ہے۔ جس کے مقابلہ میں شکست ہی کھا کر کچھ تو لذت پائے۔

فلکِ زحل پر وہ ارواحِ رذیلہ ملتی ہیں جن کو قبول کرنے سے دوزخ نے بھی انکار کر دیا ہے۔ ان میں ہندوستانی ملت کے دو مشہور غدار جعفر بنگالی اور صادق دکنی خونیں قلزم کے عذاب میں پڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس کے بعد ماورائے افلاک پر عروج ہوتا ہے اور جرمنی کے مشہور فلسفی نیٹشے سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہاں سے جنت الفردوس کی طرف بڑھتے ہیں جس میں شرف النساء کا قصرہ نظر آتا ہے۔ جو تیغ اور قرآن کی محافظ تھی۔ پھر سید علی ہمدانی اور ملا غنی کشمیری ملتے ہیں۔ اس کے بعد ہندو شاعر برتری ہری اپنا نغمہ سناتا ہے۔ وہاں سے سلاطینِ مشرق یعنی نادر شاہ ابدالی اور سلطان شہید دکنی کی زیارت کو جاتے ہیں اور ان کے ساتھ مکالمے ہوتے ہیں۔ پھر قربِ حضورؐ حاصل ہوتا ہے۔ جہاں تجلیات میں غرق ہو جاتے ہیں اور دعا کرتے ہیں۔ جس پر ندائے جمال آتی ہے اور یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ ان سب کے بعد کتاب کا اصلی مقصود اختصار کے ساتھ نژادِ نو یعنی نئی نسل کو مخاطب کر کے سنا دیتے ہیں۔

یہ سب کچھ اس خوبی خوشِ اسلوبی اور لطف و کیف کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جس کا مزہ صرف اس کے پڑھنے ہی سے مل سکتا ہے۔ سارا کلام مربوط متناسب، موجز مگر مکمل۔ چست اور حشو زوائد سے پاک صاف اور برجستہ پختہ اور بلند ہے۔ ایسے مضامینِ عالیہ کو جہاں اکثر الفاظ معانی سے قاصر ہو جاتے ہیں اس خوبصورتی سے باندھنا اور ایسے سنگلاخ رستہ کو اس سبک گامی کے ساتھ طے کرنا ڈاکٹر صاحب ہی کا کام تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اب ان کی اردو میں بالکل آمد کا لطف پیدا ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی تعلیمات اور ان کے مضامین سے عام طور پر تعلیم یافتہ طبقہ واقف ہے۔ وہی معانی اور وہی تعلیمات نئے اسلوب اور نئے قالب میں اس کتاب میں بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ہر چند کہ ارواحِ قدیمہ اور جدیدہ کی زبانوں سے مختلف عالم میں یہ باتیں کی گئی ہیں۔ لیکن سب کا اسلوب ایک اور انداز ایک

ہے۔ کیونکہ وہ ایک ہی آفتاب کی شعاعیں ہیں۔ یعنی قرآن کریم کی۔ ملاؤں کا قرآن نہیں، بلکہ آسمانی قرآن

ملاؤں کی حقیقت سعید حلیم پاشا کی روح سے سنیئے:

دین حق از کافری رسوا تر است — زانکہ ملا مؤمن کافر گر است
زاں سوئے گردوں دلش بیگانہ‌ئی — نزد او ام الکتاب افسانہ‌ئی
بے نصیب از حکمت دین نبی — آسمانش تیرہ از بے کوکبی
از شکر فیہائے آں قرآں فروش — دیدہ ام روح الامین را در خروش
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد — ملت از قال و اقولش فرد فرد

دین کافر فکر و تدبیر جہاد
دین ملا فی سبیل اللہ فساد

سید جمال الدین افغانی کی روح ملت روسیہ کو پیغام دیتی ہے:

منزل و مقصود قرآں دیگر است — رسم و آئین مسلماں دیگر است
خود طلسم قیصر و کسری شکست — خود سر تخت ملوکیت نشست
تا نہال سلطنت قوت گرفت — دین او نقش از ملوکیت گرفت
تو کہ طرح دیگرے انداختی — دل ز دستور کہن پرداختی
ہمچو ما اسلامیاں اندر جہاں — قیصریت را شکستی استخوان
تا برافروزی چراغے در ضمیر — عبرتے از سرگزشت ما بگیر
پائے خود محکم گذار اندر نبرد — گرد ایں لات و ہبل دیگر مگرد
کہنہ شد افرنگ را آئین و دین — سوئے آں دیر کہن دیگر مبین
کردۂ کار خداونداں تمام — بگذر از لا جانب الا خرام
داستان کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کن از ام الکتاب

چیست قرآں خواجہ را پیغام مرگ
دستگیر بندۂ بے ساز و برگ

اشتراکیت کے قوام میں تین منفی چیزیں شامل ہیں۔ یعنی نہ تاج، نہ سرمایہ، نہ مذہب۔

اگر انسان کے تاریخی ادوار، شکار، گلہ بانی، زراعت اور سلطنت پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہی آخری دور اس کے لئے سب سے سخت ابتلا کا دور ہے جو صد شکر کہ اب ختم ہو رہا ہے۔ تاج کے اود گرد اُمراء، وزراء متعلقین اور افواج کی ایک جماعت ہو جاتی ہے۔ جن کے تحت میں رعایا کے درجہ بدرجہ طبقات بنائے جاتے ہیں اور سارے ملک کی محنت تاج کی خدمت میں لگا دی جاتی ہے۔ اس طاغوت اعظم کے سایہ میں نہ صحیح خیالات فروغ پا سکتے ہیں نہ سچے دین کی تربیت ہو سکتی ہے۔ اسلام نے قیصریت اور کسرویت کی طاغوتیت کبریٰ کو پاش پاش کر ڈالا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں مسلمان خود شخصی حکومت کے تخت پر آ گئے اور جس بُت کو توڑا تھا اسی کو پھر نصب کر لیا۔ جس کا نتیجہ بھی بھگتا۔

ملتِ روسیہ نے بھی اسلام کے دورِ اوّل کا کام کیا اور زیادہ سختی کے ساتھ کیا۔ کیونکہ تاج کے ساتھ تمام تعلقات، نوابی، جاگیرداری، زمینداری اور ہر قسم کی سرمایہ داری کو بھی ختم کر دیا۔ یہی نفی لَا ہے جو اسلام کا اولین قدم اور اس کے کلمہ کا پہلا حرف ہے۔

قرآن وحدتِ نفس انسانی کا مبلّغ ہے جو اخوت سے بھی بالاتر ہے۔ اس لئے خاص انسانیت کے حقوق میں کسی قسم کا امتیاز قرآن کی رُو سے ممکن نہیں ہے۔ روسیوں نے بھی یہی امتیاز مٹایا ہے اور یہی نفی لَا ہے۔

جملہ مذاہب (نہ کہ دین) اشخاص پرستی سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کی تاریخ بنی آدم میں سوائے تفرقہ اندازی، سفک دم اور عداوت پیدا کرنے کے اور کچھ نہیں رہی ہے۔ ان کا مٹانا اسلام کا فریضہ ہے، اور یہی روسیوں نے کیا، یہی نفی لَا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب راستہ کو کہتے ہیں۔ اقوامِ عالم کے بڑے بڑے لوگوں نے جو طریقہ ایک خاص وقت یا ایک خاص ماحول میں اختیار کیا۔ ان کے متبعین نے اسی کو اپنا دائمی مذہب بنا لیا۔ کارل مارکس کے مشہور مقولہ کے مطابق تمام مذاہب بڑے بڑے انسانوں کے خیالات ہی ہیں لیکن دین وہ ہے جس کو خود خالقِ عالم نے انسانی فطرت کی اصلاح اور ترقی کے لئے روزِ ازل سے وضع فرمایا۔ اور انبیاء کرامؑ کے ذریعے اس کو دنیا میں پہنچاتا رہا۔ یہ ہمیشہ سے ایک ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہے گا۔ اور یہی حق ہے یعنی ہر زماں اور ہر مکاں میں اٹل ہے۔ آج دنیا میں اس کا بے شائبہ مکمل اور واحد مجموعہ صرف قرآن ہے اور بس۔

اسی پیغام میں اس کی حقیقت سنئے:

نقش قرآن تا دریں عالم نشست — نقشہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثل حق پنہاں و ہم پیداست ایں — زندہ و پایندہ و گویاست ایں

دوسری جگہ اسی کتاب میں ہے:

چوں مسلماناں اگر داری جگر — در ضمیر خویش و در قرآں نگر
صد جہان تازہ در آیات اوست — عصرہا پیچیدہ در آنات اوست
یک جہانش عہد حاضر را بس است — گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیات خداست — ہر جہاں اندر بر او چوں قباست

چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش

قرآن ہر زمانے کے لئے ہدایت ہے اور ہر مرحلہ میں وہ نیا عالم پیدا کرتا ہے۔ مسلمانوں نے اصولی غلطی یہ کی کہ قرآن کی ان شرحوں اور تعبیروں کو جو مخصوص اوقات اور حالات میں ہوتی رہیں، دائم و قائم سمجھ لیا۔ جس کے باعث قرآن متروک و مہجور ہو گیا۔ حالانکہ آج ان انسانی تفاسیر کا بڑا حصہ قطعاً بیکار بلکہ مردہ ہو چکا ہے اور قرآن اسی طرح زندہ اور سرچشمۂ ہدایت ہے۔ وہ ہر زمانہ میں ایک نئی تفسیر کا طلبگار ہے۔

ایک صاحب نے جو قرآن کا عمیق علم رکھتے ہیں اور کسی زمانہ میں روس کے اعلیٰ سیاسی طبقہ سے روشناس رہے ہیں مجھ سے مکہ معظمہ میں بیان کیا کہ انہوں نے مسٹر لینن اور ان کے رفقائے کار سے کہا کہ تم نے جو شکست و ریخت کی ہے وہ عین اسلام کے مطابق ہے۔ اس نے کہا کہ مسلمان علماء تو ایسا نہیں کہتے۔ انہوں نے کہا کہ کسی کے کہنے یا نہ کہنے کی کیا بات ہے۔ روسی زبان میں قرآن کا ترجمہ موجود ہے۔ میں آیات خود تم کو دکھلا دیتا ہوں۔ جب اس نے دیکھ لیا تو کہا کہ تعجب ہے کہ پھر مسلمان کیوں ہمارے خلاف ہیں۔ انہوں نے کہا کہ لادینی کی وجہ سے۔ جہاں تم نے باطل شکنی کی ہے، اگر حق کا بھی اقرار کر لو تو پھر تم سے بڑھ کر کوئی مسلمان نہیں کیونکہ اسلام کا پیغام صرف یہ ہے کہ

"باہم بھائی بھائی بن جاؤ اور اکیلے اللہ کے بندے بنو۔"

مگر ابھی وہاں نفی کا بحران ہے۔ اثبات تک پہنچنے میں نہ معلوم کتنا زمانہ لگے۔

روس آج سے دو صدی قبل اسلام میں داخل ہو چکا ہوتا، اگر ملاؤں نے رکاوٹ نہ ڈالی ہوتی۔ صورت یہ ہوئی کہ پیٹرِ اعظم جو سلسلہ وار ترکوں سے لڑتا رہا اور جس کا مقابلہ عثمانی سلاطین مصطفیٰ ثانی اور احمد ثالث کے ساتھ رہا اسلام سے بہت اثر پذیر ہوا۔ بارہویں صدی ہجری کے آغاز میں اس نے روس کے بڑے بڑے علماء کو جمع کر کے کہا کہ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ مگر دو چیزیں نہیں چھوڑ سکتا، خنزیر اور شراب۔ علماء نے حمیتِ اسلامی کے جوش میں ایسے اسلام کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ مسلم خواہ کتنا ہی گنہگار ہو غیر مسلم سے بہتر ہے کیونکہ اس کی تلوار اسلام کی گردن پر نہیں چلے گی ورنہ آج دنیا کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔

اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں سوویٹ روس میں اہلِ مذاہب اور مسلمانوں پر مظالم ہوتے ہیں۔ لیکن جو لوگ قرآنی زاویۂ نگاہ رکھتے ہیں وہ دیکھ رہے ہیں کہ عالم میں جو کچھ حرب و ضرب، شورش، انقلاب، تغیر و تبدل ہو رہا ہے وہ سب تکمیلِ دین اور اتمامِ نور کے لئے ہو رہا ہے اور اسلام کے واسطے زمین تیار کی جا رہی ہے کیونکہ انسانیت کو ایک نہ ایک دن ان حقائقِ ثابتہ پر پہنچنا لازمی ہے۔

جو لوگ آئے دن قیامت کی پیشین گوئیاں کرتے، اس کے قریب سے ڈراتے اور عرصۂ حیات تنگ کرتے رہتے ہیں وہ بلا وجہ اپنے نفس اور اُمت کو دھوکے میں ڈالتے ہیں۔ ایسے قرائن اور شواہد موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمِ انسانی عہدِ طفولیت میں ہے اور جس کام کے لئے انسان کی تخلیق ہوئی ہے اس کا عشرِ عشیر بھی ابھی تک وہ نہیں کر چکا ہے۔ ابھی اس کو ہزار ہا انقلابات دیکھنے ہیں۔ تب جا کر کہیں "وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا" کا وقت آئے گا۔ (۳۹/۶۹)

اشتراکیت اگرچہ ایک تاریخی چیز ہے اور زمانہائے گزشتہ میں مختلف شکلوں میں بار بار اس نے سر نکالا ہے لیکن اس زمانہ میں نہایت شدت اور قوت کے ساتھ یہ تحریک دنیا میں پھیلتی جاتی ہے، اس لئے مسلمانوں کو دینی لحاظ سے اس پر غور کرنا لازمی ہے۔

قرآن نظامِ عائلی کا محافظ ہے۔ صلہ رحمی اور قرابت کے حقوق کی ادائیگی کو اس نے انسان کے واجبات اور فرائض میں رکھا ہے، اس لئے اشتراکیت کی انتہائی صورت جس میں یہ نظام بگڑتا ہوا اسلام کے بالکل منافی ہے۔ بیشک جہاں تک قبضۂ زمین کا تعلق ہے وہ اشتراکیت کی موافقت کرتا ہے۔

سورۂ رحمٰن میں تصریح ہے کہ

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵/۱۰)

زمین کو اللہ نے مخلوق کے لئے بنایا ہے۔

اس کا استعمال اسی صورت میں ہونا چاہیئے جس میں مخلوق کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچ سکے۔ بادشاہوں یا زمینداروں کا زمین پر قبضہ نہ صرف اس کے فائدہ کو محدود کر دیتا ہے بلکہ مَا وُضِعَ لَہٗ کے خلاف ہے جو ظلم ہے۔

علماء ترک نے زمینداری کے جواز میں دو دلیلیں پیش کی ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن نے وراثت کا قانون رکھا ہے۔ دوسری یہ کہ زمینداری مسلمانوں میں ہمیشہ سے چلی آئی ہے۔ لیکن دونوں دلیلیں باطل ہیں۔

پہلی اس لئے کہ قانونِ وراثت یہ کب لازم کرتا ہے کہ ہر شخص زمین کی ملکیت چھوڑ کر مرے۔ دوسرے ترکے بھی ہو سکتے ہیں اس لئے اس دلیل کی کوئی منطقی شکل ہی نہیں بن سکتی۔

دوسری دلیل کے دو جواب ہیں ایک الزامی دوسرا تحقیقی۔ الزامی یہ ہے کہ مسلمانوں میں ملوکیت بھی مسلسل چلی آئی ہے پھر اس کو کیوں چھوڑتے ہو۔ اور تحقیقی یہ ہے کہ مسلمانوں کو بھی دوسری قوموں کی طرح تاریخی ادوار سے گزرنا ناگزیر تھا۔ اس لئے ان کے قول و فعل سے کسی شئے کے دینی ہونے کا ثبوت اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ قرآنی سند اس کے ساتھ نہ ہو، جو قوم ملوکیت میں گرفتار ہو گئی۔ وہ زمینداری میں کیوں نہ پھنستی۔ قرآن کی رُو سے قابلِ زراعت اراضی پر انسانوں کو صرف حقِ انتفاع حاصل ہے نہ کہ حقِ ملکیت۔ البتہ مویشیوں پر قرآن شخصی ملکیت کا حق تسلیم کرتا ہے۔

سورۂ یٰسین میں ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۳۶/۷۱﴾

کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے ان کے لئے مویشی بنائے جس کے وہ مالک ہیں۔

یہیں سے اسلام اور اشتراکیت کا افتراق شروع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب اللہ کی بنائی چیزیں اس کی

ملکیت ہو سکتی ہے تو اپنی مصنوعات اور کمائی تو یقیناً اس کی شخصی ملکیت ہوں گی۔

اسلام میں سب سے پہلے اشتراکی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہے جا سکتے ہیں جو اغنیاء کی دولت کو فقراء کا حق سمجھتے تھے۔ لیکن غالباً اس میں منقولہ اور غیر منقولہ کا امتیاز نہ تھا۔ اسی وجہ سے خلیفہ ثالث رضؓ نے ان کے اس خیال کو مفاد عامہ کے خلاف سمجھ کر ان کو ایک بیابانی مقام ربذہ میں بھیج دیا۔ وہیں انہوں نے ۳۲ھ میں وفات پائی۔

مسلمانوں کے بعض مہربان ناصح ان کو یہ نصیحت بھی کرتے رہتے ہیں کہ اسلامی تمدن کی حفاظت کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ تہذیب یا تمدن ملکی یا قومی چیزیں ہیں۔ قرآن جس طرح ہر ملک اور ہر قوم سے بالاتر ہے۔ اسی طرح کسی تہذیب اور کسی تمدن کے ساتھ بھی اس کو کوئی خصوصیت نہیں۔ وہ قلوب اور اعمال کی اصلاح کے لئے آیا ہے اور ہر تہذیب اور تمدن کو اسلامی بنا سکتا ہے۔

فلکِ مشتری پر ڈاکٹر صاحب کی ایک ادا قرآن کے خلاف معلوم ہوئی اس لئے اس کو بھی ظاہر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ وہ جوہرِ مصطفیٰ کی حقیقت جس کو اللہ تعالیٰ معراج کے بیان میں "عبدہٗ" فرماتا ہے، حلاج کی زبان میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔ ؎

عبدہٗ از فہم تو بالاتر است — زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
عبدہٗ صورت گرِ تقدیر ہا — اندرو ویرانہ ہا تعمیر ہا!
عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہٗ ست — ما ہمہ رنگیم او بے رنگ و بوست
کس ز سرِّ عبدہٗ آگاہ نیست — عبدہٗ جز سرِّ الاّ اللہ نیست

یہاں تک کہ صاف صاف کہتے ہیں ؎

لاَ اِلٰہ تیغ و دم او عبدہٗ — فاش تر خواہی بگو "ہو عبدہٗ"

یہ حقیقت میں غلو ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانیت کے حدود میں رکھنے سے ان کا اسوۂ حسنہ انسانوں کے لئے دلکش اور آسان رہتا ہے۔ بخلاف اس کے دائرۂ الوہیت میں داخل کر دینے سے ان کی پیروی نہ صرف دشوار بلکہ غیر ضروری بھی ہو جاتی ہے۔ غالباً اسی نکتہ کی وجہ سے قرآن نے جہاں جہاں اس امر کو بیان کیا ہے، حصر کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔

هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا (۱۷/۹۳)
میں نہیں ہوں مگر ایک انسان پیغام لانے والا

سورۂ کہف ہے ۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ (۱۸/۱۱۰)
کہدے کہ میں تو بس تمہارے ہی جیسا انسان ہوں (مگر) مجھ
پر وحی بھیجی جاتی ہے ۔

یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات، بجز اس کے کہ عالم غیب سے اللہ ان کے اوپر وحی بھیجتا ہے، بشریت ہی کے دائرہ میں محصور ہے اور کوئی شعبہ الوہیت کا اس میں نہیں ہے ۔ مزید تصریحات قرآن کے متعدد آیات میں ہیں ۔

خطاب بہ نژادِ نو، جوانوں کے لئے شمع راہ ہے ۔ دو ہنگامی اور مقامی مدعیانِ نبوت کی بابت جو کچھ فرمایا ہے سننے کے قابل ہے ۔

آخر بود اللہ اور اسانۂ و برگ فتنۂ او حبِّ مال و ترس مرگ
صحبتش با عصر حاضر در گرفت دینِ حق را از دو پیغمبر گرفت
آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد آں ز حج بیگانہ و ایں از جہاد
تا جہاد و حج نماند از واجبات رفت جاں از پیکرِ صوم و صلوٰۃ
روح چوں رفت از صلوٰۃ و از صیام فرد ناہموار ملت بے نظام
سینہ ہا از گرمیٔ قرآں تہی
از چنیں مرداں چہ امید بہی

ہم سنا کرتے تھے کہ فارسی زبان سیکھنے کے بعد صرف چار کتابیں اچھی پڑھنے کو ملتی ہیں ۔ شاہنامہ فردوسی، مثنوی مولانا روم، گلستانِ سعدی اور دیوانِ حافظ ۔ مگر اب جاوید نامہ کو بھی پانچویں کتاب سمجھنی چاہیئے جو کہ معنویت اور نافعیت کے لحاظ سے ان سب پر فوقیت رکھتی ہے ۔ حقیقت میں یہ اس قابل ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانانِ عالم کے نصاب میں شامل کر لی جائے ۔

جی چاہتا تھا کہ اس کتاب کی تعلیمات کو میں آیاتِ الٰہی کی روشنی میں دکھلاتا مگر یہ ایک طویل

شرح ہوجائے گی۔ اسی لئے ایک مختصر سی نظم میں "زندہ رود" کو خطاب کرکے جو ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں اپنا لقب رکھا ہے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

زندہ رود

اے کہ ذاتِ تست ملت را چراغ　　اے کہ شعرِ تست فردوسِ دماغ
اے کہ درسازت نوائے زندگی　　خوش سرودی نغمہ ہائے زندگی
آتشے از سوزِ خود افروختی　　جانِ ما افسردہ گاں را سوختی
طبعِ درّاکت جہاں را وا شگافت　　شاعری درذاتِ تو معراج یافت
درخیالِ خود گزشتی از فلک　　تا شدی انباز با حور و ملک
و انسوئے گردوں جہانیدی سمند　　درگزشتی از ہمہ پست و بلند
نورِ حق را در تلاطم دیدۂ　　خویشتن را اندراں گم دیدۂ
عشق را تازہ براتے آوردۂ　　یعنی پیغامِ حیاتے آوردۂ
شرحِ وادی عالمِ موجود را　　وانمودی منزلِ مقصود را
گفتۂ تو مغز و جانِ شاعری　　برتو می نازد جہانِ شاعری

اے کہ از آبِ حیاتی زندہ رود
پررواں ہائے تو از من درود

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضربِ کلیم

(نوشتہ ۱۹۳۶ء)

بالِ جبریل کے بعد ڈاکٹر اقبالؒ کے تازہ اُردو کلام کا مجموعہ ضربِ کلیم کے نام سے شائع ہوا۔ یہ کس قدر دلکش اور روح پرور ہے صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان اشعار کی تعریف کرنا یا دوسرے شعراء کے کلام کی طرح ان کی داد دینا، یا اپنے خیال کے ساتھ ان کی مطابقت دکھانا، یا بے کیف توضیحات کرکے اُن کی لطافت کو کھونا صرف کوردوقی ہے۔ بلکہ شریعتِ ادب میں گناہ کبیرہ ہے کیونکہ یہ شاعری نہیں ہے بلکہ حیاتِ ملیہ اسلامیہ کے ان اہم مسائل کے متعلق جن میں مفکرین غلطاں و پیچاں ہیں اور جو دفتر کے دفتر سیاہ کرنے سے بھی حل نہیں ہوتے وہ دو دو اور چار چار شعروں میں پختہ اور تلی رائیں مدلل تعلیمات اور بے پردہ حقائق ہیں جو اہلِ بصیرت کی نگاہوں میں موتی کی طرح چمک رہی ہیں۔ ان کی کیفیت بقول مرزا بیدل یہ ہے۔

نزاکت ہاست در تصویرِ مینا خانۂ حیرت — مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را

ان کو تو بس دیکھئے، پڑھئے، سوچئے اور نہاں خانۂ دل کے کسی گوشہ میں محفوظ رکھ لیجئے۔

لیکن چونکہ میرا طریقۂ فکر جداگانہ ہے اس لئے ڈاکٹر صاحب کی بعض باتوں سے کلی طور پر میں متفق نہیں ہو سکا۔ انہیں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مہدی کے عنوان سے وہ فرماتے ہیں۔

مجذوبِ فرنگی نے باندازِ فرنگی — مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو
اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار — نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو

اس میں غالباً روئے سخن میری طرف ہے۔ کیونکہ مہدی کے عقیدے کے اسلامی ہونے سے سب سے پہلے میں نے علی الاعلان انکار کیا ہے۔ اس لئے گذارش کرتا ہوں کہ تخیل سے مراد اگر عقیدہ ہے تو ہمارے پاس اس کا ایک معیار ہے۔ یعنی کلام اللہ۔ اس میں کہیں مہدی بھیجنے کا وعدہ نہیں کیا گیا ہے۔

لہذا اگر ہم یہ عقیدہ رکھا بھی کریں تو اللہ کے اوپر کیا ذمہ داری ہے کہ وہ مہدی کو بھیجے۔ اور اگر محض تخیّل مقصود ہے تو مایوس قوموں کے تخیلات بھی ان کے لئے عذاب ہی ہوا کرتے ہیں۔ صدیوں پر صدیاں گزرتی جا رہی ہیں۔ اور اُمّت ہے کہ اس اُمید میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہے کہ

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

کبھی کبھی جب مایوسی کا غلبہ ہوتا ہے تو گھبرا کے کہنے لگتی ہے۔

یہ انتظارِ مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے

پھر مجبور ہو کر اسی ٹوٹی ہوئی اُمید کا سہارا لیتی ہے اور پکارتی ہے۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا

غالباً اسی تخیّل کا اثر ہے کہ ملّت کے اُن سربرآوردہ افراد کو بھی جو اس وقت تعمیرِ قوت میں سرگرم ہیں ڈاکٹر صاحب اپنے بلند معیار کے مطابق نہیں پاتے اور کہتے ہیں۔

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اسکی ۔۔۔ کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

دوسری بات یہ ہے کہ انہوں نے کہا ہے

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے ۔۔۔ غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

یہ خالص شاعرانہ استدلال ہے۔ غالبؔ کی طرح جس نے کہا ہے۔

کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

جس طرح مگس کی قے کہہ دینے سے شہد کی لطافت اور شیرینی میں فرق نہیں آسکتا۔ اسی طرح محکومیت کی نسبت سے الہام بھی اگر حق ہو، غارت گرِ اقوام نہیں ہو سکتا۔ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام رومی سلطنت کے محکوم تھے جن کی نسبت ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے۔

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا ۔۔۔ نبیِ عفت و غم خواری و کم آزاری

بلکہ اکثر انبیاءِ کرام علیہم السلام محکوم اقوام ہی میں مبعوث کئے گئے جس کے خاص اسباب و علل تھے جن کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔

دراصل نبوت کی صداقت کا معیار حاکمیت یا محکومیت پر نہیں ہے بلکہ خود الہام کی نوعیت پر ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اسی مجموعے میں ایک دوسرے شعر میں اس کسوٹی پر بھی اس کو کسا ہے۔

وہ نبوّت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش — جس نبوّت میں نہیں قوّت و شوکت کا پیام

نسخِ جہاد اور کفر کی غلامی کا دوامی پٹہ کبھی سچّی نبوّت کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔

پنجابی مسلمانوں کی مذہبی ذہنیت کے متعلق فرماتے ہیں۔

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت — کر لے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد

تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا — ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد

تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے — یہ شاخِ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

یہ حقیقت اگرچہ ناقابلِ انکار ہے مگر اسی دم سے پنجابی مسلمان کی مدح کا بھی ایک پہلو نکلتا ہے جو یقیناً ڈاکٹر صاحب کے پیشِ نظر بھی رہا ہوگا۔ مگر انہوں نے اس تنبیہ کے موقع پر اس کا اظہار مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن میں تو ظاہر کئے بغیر نہیں رہوں گا یعنی

لیکن اسے مل جائے جو اچھا کوئی رہبر
بگڑا ہوا مدت کا سنورتا ہے بہت جلد

نظریۂ حیات کے متعلق تین اقوال لکھے ہیں۔

سپنوزا

نظر حیات پہ رکھتا ہے مردِ دانش مند — حیات کیا ہے حضور و سرور و نور و وجود

افلاطون

نگاہ موت پہ رکھتا ہے مردِ دانش مند — حیات ہے شبِ تاریک میں شرر کی نمود

اقبال

حیات و موت نہیں التفات کے لائق — فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

فلسفۂ خودی پر پہنچ کر رک گئے لیکن تصوّف وکر برائے شعر گفتن خوب است) ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور اور صوفی کی زبان سے کہتا ہے۔

حیات و موت و خودی جملہ ہیں عوارضِ نفس
حقیقت ایک ہے جو خود ہے شاہد و مشہود

.....۰.....

مقالہ بہت گراں قدر تھا۔ عابد علی صاحب عابد ایم۔ اے کی تحریر بھی نہایت دلچسپ تھی اور حفیظ جالندھری کی شاعری اور موسیقی دونوں قابلِ داد تھیں۔ نیز صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم ایم اے نے اقبال کی شاعرانہ حیثیت کو کامیابی کے ساتھ نمایاں کر لیا تھا۔

تیسری نشست جو ساڑھے چھ بجے شام کو شروع ہوئی اس میں علامہ عبداللہ یوسف علی صدر تھے۔ اسی نشست میں بیگم شاہنواز نے ایک مختصر تقریر فرمائی اور اعلان کیا کہ ان کے شوہر نے دس مربع زمین ڈاکٹر اقبال کے چھوٹے بیٹے جاوید کے نام اسی اقبال ڈے کے سلسلہ میں منتقل کر دی ہے۔ اس اعلان نے اس یادگار کو ایک مادی قوت بخشی اور حاضرین نے اس پر بہت خوشی اور شکریہ کا اظہار کیا۔ اس کے بعد علامہ عبداللہ یوسف علی نے اپنی جگہ پر مجھ کو بٹھادیا اور خود چلے گئے۔ پروفیسر محمد عمر فاروق ایم۔ اے اور پروفیسر منیر الدین صاحب ایم۔ ایس۔ سی نے انگریزی زبان میں پُر مغز مقالے پڑھے۔ کئی نظمیں بھی پڑھی گئیں جن میں سے مولانا اسد ملتانی کی نظم جو ہمارے دہلی کے قافلہ میں گئے تھے خصوصیت کے ساتھ دلچسپی سے سُنی گئی۔ آخر میں چوہدری غلام احمد خاں صاحب پرویز نے اپنی تقریر اقبال اور قرآن پر شروع کی جو اس قدر پسند کی گئی کہ خاتمہ کے وقت بار بار لوگ درخواست کرتے تھے کہ کچھ اور اضافہ کیجیے۔ مگر چونکہ وقت زیادہ گزر چکا تھا اس لئے میں نے جلسہ کو ختم کر دینا مناسب سمجھا اور حسب ذیل تقریر کی۔

- ڈاکٹر اقبال ؒ کے کلام کا میں اس وقت سے سلسلہ وار مطالعہ کر رہا ہوں جبکہ آج سے ایک تہائی صدی پیشتر شیخ عبدالقادر کا رسالہ مخزن لاہور سے نکلتا تھا جس میں ڈاکٹر صاحب موصوف کی نظمیں چھپا کرتی تھیں۔ زمانۂ مابعد میں ڈاکٹر صاحب کی مثنویوں اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی اور پیام مشرق نیز جاوید نامہ وغیرہ پر میں نے تبصرے بھی لکھے جو ملک کے ممتاز رسالوں میں شائع ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کے کلام کے ساتھ میری دلچسپی اور گرویدگی کی خاص وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری سے ادب کی جس قدر خدمت کی ہے اس سے کہیں زیادہ اسلام اور قرآن کی خدمت کی ہے۔

ادھر صدیوں سے مسلمانانِ ہند کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ قرآن سے ان کا لگاؤ نہیں رہا اور ان کا دینی رشتہ اس کی تعلیمات سے ٹوٹا ہوا ہے۔ وہ صرف ان خیالات کے پیرو ہیں جو سرتاسر انسانی ہیں، جن کو ملاؤں نے فرقہ بندی اور باہمی افتراق کا ذریعہ بنا کر ملت کے اجتماعی شیرازہ کو ایسا درہم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا یومِ اقبالؒ

گزشتہ زمانوں میں بالعموم اہلِ کمال کو ان کے کمالوں کی داد ان کی زندگیوں میں کم ملتی تھی۔ بلکہ مرجانے کے بعد جبکہ وہ اس دنیا کو چھوڑ کر چلے جاتے۔ ان کا نام روشن ہوتا، عرفی نے اسی کا ماتم کرتے ہوئے کہا ہے

چہ دل کشاید از نیم کہ بعدِ من گویند — کہ بودہ است فلاں دام اسمہ استاد
از انکہ بعدِ بریدن تمام شانہ شود — گرہ کشادہ نگردد ز طرۂ شمشاد

لیکن آج ذرائع الحاق و اتصال اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ ساری دنیا بمنزلہ ایک گھر کے ہو گئی ہے۔ اور جو کمال کسی میں ہوتا ہے فوراً ہی لوگ اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال کے اشعار کی محبوبیت اور مقبولیت نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر اسلامی ممالک تک بھی جا پہنچی ہے اور ہر پڑھے لکھے مسلمان کے دل میں ان کی عزت اور عظمت جاگزیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "دی انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ" نے اس سال کے آغاز میں ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو "اقبال ڈے" منانے کا فیصلہ کیا تاکہ دنیا کے اس عظیم الشان اسلامی شاعر کے حضور میں وہ اپنی طرف سے عقیدت کا نذرانہ اور تحسین کا خراج پیش کرے۔ ان طلباء نے مجھے بھی اس جلسہ میں مدعو کیا اور نہایت اصرار کے ساتھ بلایا۔ اس لئے میں تاریخ مذکورہ پر دہلی سے لاہور پہنچا۔ دن صرف ایک تھا اور پڑھنے والے، بولنے والے نظمیں اور مضامین سنانے والے بہت۔ یعنی تقریباً تیس کی تعداد میں۔ اس وجہ سے پروگرام بہت طویل ہو گیا تھا۔ تین تین گھنٹے کی تین نشستیں صبح نو بجے سے رات کے دس بجے تک رکھی گئی تھیں۔ پہلی نشست میں مسٹر گوکل چند نارنگ صدر جلسہ تھے۔ ہمارا دہلوی قافلہ ذرا دیر سے پہنچا تھا اس وجہ سے ہم اس نشست کے آخر میں شریک ہو سکے۔ اور بعض مقالات اور نظمیں سننے سے محروم رہے۔ دوسری نشست ڈیڑھ بجے زیرِ صدارت شیخ عبدالقادر صاحب ممبر انڈیا کونسل منعقد ہوئی۔ اس میں متعدد مقالے نہایت عمدہ پڑھے گئے۔ خاصکر خواجہ غلام السیدین صاحب ایم۔ اے۔ ڈی۔ پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کا انگریزی

وبرہم کم دکھا ہے کہ جدید تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کے دلوں میں ان کی حالت دیکھ کر خود اسلام اور قرآن کی طرف سے بے اعتنائی بلکہ بدگمانی پیدا ہو گئی جو اس صورت میں ہر عقلمند اور صاحب فہم کے دل میں پیدا ہونی چاہیئے تھی۔ ایسی حالت میں ڈاکٹر اقبال نے جو خود جدید تعلیم کے ایک درخشندہ آفتاب ہیں اپنی خداداد قابلیت اور اندرونی روشنی سے شاعری کے ساز پر وہ دیپک کا راگ چھیڑا جس سے مسلم نوجوانوں کے افسردہ دلوں میں قرآن کی محبت کی آگ بھڑک اٹھی اور انہوں نے اس کی عظمت اور اسلام کی برتری کو پہچانا۔
بھولے ہوئے راستہ کی طرف قوموں کو مائل کرنا اور ان کے دلوں کو ہدایت کی جانب موڑنا وہ کام ہے جس کے لئے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل گزشتہ زمانوں میں انبیاء کرام آیا کرتے تھے۔ اسی قسم کا کام قدرت نے ڈاکٹر صاحب سے اور ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری سے لیا۔ مولانا گرامی مرحوم کا یہ شعر کس قدر صحیح ہے۔

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

دوسری طرف ہماری شاعری بجائے خود اس قدر لغو اور مہمل ہو گئی ہے کہ اس کے تمام رشتے حیات اور عمل سے مدتہائے دراز سے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ شعراء خود انہیں سمجھتے ہیں کہ وہ کس ہذیان میں مبتلا ہیں اور کس لئے ہیں۔ بس ایک پرانی لکیر ہے جس کو پیٹے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس صدی کے نامور شاعر اور قومیت کے مبشر مولانا حالی نے فرمایا۔

وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
مَلک جن سے شرماتے ہیں آسماں پر زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر

وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا
ہوا علم دیں جس سے تاراج سارا

ڈاکٹر اقبال نے ایسی عام بدمذاقی کی دنیا میں اپنی شاعری کا رشتہ زندگی اور بالخصوص قرآنی اور اسلامی زندگی کے ساتھ قائم کیا۔ یہ وہ چیز ہے جس کے لئے توفیق الٰہی اپنے کسی خاص ہی بندہ کو چنتی ہے۔ چنانچہ آج بھی جبکہ ان کے کلام کا اتنا نمونہ ہمارے شعراء کے سامنے موجود ہے کوئی ان کی نکالی ہوئی شاہراہ پر چلنے کے قابل نہ ہو سکا۔ بعضوں نے صرف لفظی نقالی کی کوشش کی مگر زیادہ

کی ان برقی لہروں کو نہیں دیکھ سکے جو ڈاکٹر صاحب کے شعروں کے اندر دوڑ رہی ہیں۔

اسلامی زبانوں میں سے کم سے کم تین زبانوں عربی۔ فارسی اور اردو کے اکثر بڑے بڑے شعرا کے کلاموں کا میں نے غور اور دلچسپی سے مطالعہ کیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال کے اشعار ایسے دلکش، امیدوں سے اس قدر بھرے ہوئے اور اسلامی حقائق سے اتنے لبریز ہیں کہ میں ان کو اسلام کا سب سے بڑا شاعر ماننے پر مجبور ہوں۔ اس انتہائی زوال اور ذہنی پستی کے زمانہ میں مسلمانانِ ہند کے لئے ان کا کلام قدرت کی طرف سے ایک موہبتِ کبریٰ ہے، جس نے ہمارے نوجوانوں کی جدید دماغی تعمیر میں بڑا حصہ لیا ہے اور آئندہ کے لئے وہ ہمارا نہ صرف ادبی بلکہ ملی سرمایہ ہے۔"

ہر چند کہ یہ پہلا اقبال ڈے تھا اور طلباء کی طرف سے تھا، جن کے ابتدائی کاموں میں لازمی طور پر خامیاں ہوتی ہیں۔ لیکن پھر بھی بحیثیتِ مجموعی نہایت کامیاب رہا۔ مولوی عبدالحق صاحب سیکرٹری انجمن ترقی اردو، مولانا سید سلیمان ندوی۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب پی ایچ ڈی پروفیسر جامعہ ملیہ اور ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب پی ایچ۔ ڈی پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے آنے کی بھی خبریں تھیں اور ان میں سے سوائے مولوی عبدالحق صاحب کے سب کے نام بھی پروگرام میں درج تھے۔ لیکن یہ حضرات اپنی مجبوریوں کی وجہ سے نہ آسکے۔ ورنہ اقبال ڈے اور بھی کامیاب رہتا۔

دوسرے دن ہم ڈاکٹر اقبال سے ملے جو ہمارے منتظر تھے۔ نو بجے دن سے سلسلۂ گفتگو ایک بجے تک رہا۔ امسال حج کی شرکت کا ارادہ رکھتے تھے مگر بیماری اور کمزوری کی حالت یہ ہے کہ کوٹھی سے باہر بھی نکلنا مشکل ہے، اس لئے نہ جا سکے۔ کہتے تھے کہ میں تو دو سال سے ارادۂ سفرِ حج میں ہوں۔ عملاً جب اللہ موقع دے۔ بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لئے ہیں۔ جو اس سفر سے متعلق ہیں۔ ان میں سے کہیں کہیں سے کچھ سنایا بھی۔ مکہ سے مدینہ کی روانگی کے وقت ایک غزل لکھی ہے۔ جس میں اللہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز   کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

یہ شعر سناتے ہی گریہ ایسا گلوگیر ہوا کہ ان کی آواز بند ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ مجھے یہ دیکھ کر مجبوراً موضوعِ سخن بدلنا پڑا۔ محبتِ رسول کا یہ جذبہ میں نے کم کسی میں دیکھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثنوی مخزن الاسرار

(نوشتہ ۱۹۳۱ء)

فارسی زبان کے ادب عالیہ میں جو رتبہ شیخ نظامی کی مثنویوں کو حاصل ہوا وہ کسی دوسرے کے کلام کو نصیب نہ ہوسکا۔ زبان کی شستگی، بندش کی پختگی، خیالات کی بلندی اور شاعرانہ لطافت میں وہ جملہ ادبیات ایران سے فائق تر ہیں۔ متاخرین میں سے اکثر نے ان کی پیروی بھی کی تھی لیکن بالعموم ناکامیاب رہے۔ اس موقع پر ہم چاہتے ہیں کہ ان کی مثنوی مخزن الاسرار پر ایک نگاہ ڈالیں۔

ان کی پانچ مثنویاں ہیں۔ مخزن الاسرار، شیریں وخسرو۔ لیلی ومجنوں، ہفت پیکر اور سکندر نامہ یہی خمسہ یا پنج گنج کہلاتی ہیں۔ نظامی کے بعد سے آج تک جملہ مثنوی گو شعراء مثلاً امیر خسرو، مولانا جامی، ہاتفی اور فیضی وغیرہ نے اسی خمسہ کو پیش نظر رکھ کر جواب لکھنے یا چربہ کشی کرنے کی کوشش کی ہے۔

مخزن الاسرار خمسہ نظامی کی اوّلین مثنوی ہے۔ انہوں نے سکندر نامے میں اپنی مثنویوں کی ترتیب کو لکھ دیا ہے۔

سوئے مخزن آوردم اوّل پسیچ	کہ سستی نہ کردم دراں کار ہیچ
ازو چرب و شیریں ترانگیختم	بہ شیرین و خسرو در آویختم
وزانجا سراپردہ بیروں زدم	در عشق لیلیٰ و مجنوں زدم
چو از عشق مجنوں بہ پرداختم	سوئے ہفت پیکر فرس تاختم
کنوں بر بساطِ سخن گستری	زنم کوس اقبال اسکندری

مخزن الاسرار ۵۸۲ھ میں جبکہ نظامی کی عمر ۴۰ سال کی تھی۔ فخر الدین بہرام شاہ رومی والئ ارزنجان کی فرمائش سے لکھی گئی تھی، ہاشمی کرمانی اپنی مثنوی مظہر الآثار میں جو اس نے مخزن الاسرار کے جواب میں لکھی ہے۔ اس کی وجۂ تالیف اس طرح بیان کرتا ہے۔

دادگرے بود ہمایوں خصال — عادل و دریا دل و صاحب کمال
شاہِ فلک مسند و انجم سپاہ — خسروِ جم کوکبہ بہرام شاہ
بسکہ نکو طبع و خردمند بود — در طلبِ موعظت و پند بود
داشت وزیرے بہ نسب نامدار — عارفِ موزون و فضائل شعار
طرفہ شبے آں شہ روشن ضمیر — روئے سخن داشت بسوئے وزیر
گفت چہ سازم کہ در ایامِ من — زندہ جاوید شود نامِ من
گفت وزیر از رہِ تدبیر و رائے — کائے بہمہ گم شدگاں رہنمائے
آنکہ ازو زندہ بود نامِ کس — در دو جہاں نام نکو نیست و بس
یا خلفے بعدِ تو در روزگار — از تو و نامِ تو بود یادگار
شاہ ازیں نکتہ چو گل بر شگفت — برگِ گل از غنچہ بر آورد و گفت
آنچہ تو گفتی ہمہ سنجیدہ است — دلکش و مطبوع و پسندیدہ است
زیں دو سخن آنچہ مرا آرزوست — شہرت و آوازۂ نامِ نکوست
بوئے خلف در گلِ ایام نیست — گر خلفے ہست بجز نام نیست
حمدِ خدا را کہ دریں روزگار — شیخ نظامیست ز مردانِ کار
بہ کہ باخلاص روم سوئے او — دیدہ منور کنم از روئے او
چوں بسوئے پیرِ سخن رو کنم — روئے سخن را بسوئے او کنم
کائے سخنت در ہمہ عالم سند — نظم خوشت گوہرِ بحرِ ابد
لطف کن و بہرِ دل چوں منے — ساز کن از گنجِ ہنر مخزنے
تا بود از نظمِ تو نامی شوم — در ہمہ آفاق گرامی شوم
بر سرِ پا خاست وزیر از نشاط — گفت بہ سلطاں ز رہِ انبساط
خضرِ رہت ہادیِ توفیق باد — جلوہ گہت وادیِ تحقیق باد
شاہ و بخیل و سپاہ نامدار — شد ز رہِ صدق و کرامت سوار
رفت سوئے شیخ ز بہرِ طواف — با نظرِ بینش و مرآتِ صاف

بہر ہدایا بہ طریق جمیل — زر بہ شتر بردو جواہر بہ پیل
چوں بحضور آمد و ممتاز شد — محترم زاویۂ راز شد
شاہ سخنداں سخن آغاز کرد — قصۂ پوشیدۂ خود باز کرد
کرد پس از مکرمت بے قیاس — از کرم حضرت شیخ التماس
تا رقم نسخۂ مخزن کند — گنج نہاں بر ہمہ روشن کند
شیخ مدد خواست ز فیاض جود — ملتمس شاہ اجابت نمود
از پئے ایں مژدہ شہ نامدار — کرد بسے نقد گرامی نثار
ساخت یکے منظر فیروزہ فام — تا بکند شیخ درانجا مقام
بود مہیا ہمہ اسباب او — منعم و خوش دل ہمہ احباب او
با ہمہ قدر و عدم احتیاج — یافتہ از گنج و بردہ خراج
چوں دلش از قید جہاں سادہ شد — خاطر او از ہمہ آزادہ شد
خیمہ بروں زد ز گل و آب تن — رفت بہ معراج بیان سخن
ساخت کتابے کہ ز اوج بریں — نعرہ برآمد کہ ہزار آفریں
نامۂ خود بر ہمہ فرخندہ ساخت — نام خود و نام ہمہ زندہ ساخت
نسخۂ او معدن امید شد — مخزن گنجینۂ جاوید شد

اس سے پہلے حکیم سنائی نے بہرام شاہ بن مسعود شاہ غزنوی کے نام پر اپنی مثنوی حدیقہ لکھی تھی۔ نظامی کہتے ہیں۔

نامہ دو آمد ز دو ناموس گاہ — ہر دو مسجل بدو بہرام شاہ
آں زرے از کان کہن ریختہ — ویں درے از بحر نو انگیختہ

یعنی حدیقۂ حکیم سنائی کے اشعار مثل زر کے ہیں اور پرانی زبان اور پرانے طرز میں ہیں اور مخزن کے اشعار مثل گوہر کے ہیں جو جدید بحر میں نئے طرز پر لکھی گئی ہے۔

آں بدر آوردہ ز غزنین علم — ویں زدہ بر سکۂ رومی رقم
گرچہ دراں سکۂ سخن چو زر است — سکۂ نظم من از آں بہتر است

یہ فیصلہ کوئی تعلّی نہ تھی بلکہ حقیقت تھی جس کو انہوں نے بے جھجک ظاہر کردیا۔
مخزن کے اشعار کی تعداد ۲۲ اور ۲۳ سو کے درمیان ہے۔ نظامی نے اس کو صرف چند روز میں لکھ ڈالا تھا۔ چنانچہ کہا ہے :-

آنچہ دریں حجلۂ خرگاہی است	جلوہ گر چند سحر گاہی است

آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	ہست کلید در گنج حکیم

ایک حدیث بیان کی جاتی ہے کہ "وَ لِلّٰہِ تحت العرش کنز مفاتحہ البنۃ الشعراء"
یعنی اللہ تعالیٰ کے عرش کے نیچے ایک خزانہ ہے۔ جس کی کنجیاں شعراء کی زبانیں ہیں۔
صاحب مخزن الفوائد نے اس کے متعلق یہ دلچسپ قصّہ لکھا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معراج میں تشریف لے گئے تو عرش کے نیچے ایک مقفّل مکان دیکھا۔ جبرائیل علیہ السلام سے دریافت فرمایا کہ یہ کیسا مکان ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ معانی کا خزانہ ہے۔ جس کی کنجیاں آپ کی اُمّت کے شعراء کی زبانیں ہیں۔ فرمایا کہ اس میں سے کچھ مجھے بھی ہدیہ کرو۔ جبریلؑ نے دو شعر نکال کر پیش کئے۔ آپ اس کو اپنے دل میں رکھتے تھے۔ ایک روز حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو جو دربار نبویؐ کے شاعر تھے، آپ نے ایک سادہ قرطاس عطا فرمایا اور کہا کہ اس پر ایک قصیدہ حمد و نعت میں لکھ کر جمعہ کے دن سناؤ۔ انہوں نے آپؐ کے دست مبارک سے وہ قرطاس لے کر جیب میں رکھ لیا اور قصیدہ لکھنا بھول گئے۔ جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ آپؐ نے حکم دیا کہ حسان قصیدہ سناؤ۔ اب ان کو یاد آیا۔ قصیدہ تو لکھا نہیں تھا مگر پاس ادب سے منبر پر کھڑے ہو گئے اور وہی قرطاس ہاتھ میں لے کر فی البدیہہ حمد و نعت میں اشعار پڑھنے شروع کر دیئے۔ اتفاقاً وہ دونوں شعر بھی جو حضرت جبریلؑ نے ہدیہ میں دیئے تھے اور سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کو ان کا علم نہ تھا اس وقت حسان کی زبان سے نکلے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اُن شعروں کو سوا میرے کوئی سمجھانتا نہ تھا۔ تم جو اس وقت تعمیل فرمان کے خیال سے فی البدیہہ قصیدہ پڑھنے لگے تو جبریلؑ نے تمہارے دل میں القا کر دیئے۔ پھر حضورؐ نے ان کے حق میں دعا فرمائی کہ " اللھم ایدہ بروح القدس "
اس شاعرانہ قصّہ کو نظامی نے آغاز مثنوی میں ان اشعار میں ادا کیا ہے۔

قافیہ سنجان کہ علم برکشند　　　گنج دو عالم بہ سخن درکشند
زآتش فکرت چو پریشاں شوند　　　با ملک از جملۂ خویشاں شوند

اس دلچسپ تلمیح کی وجہ سے نظامی کے بعد ان کی مثنوی کے جواب لکھنے والے شعراء نے بسم اللہ پر مصرعے لگانے شروع کئے اور یہ طبع آزمائی کا میدان بن گیا۔ ہم اس جگہ چند مصرعے درج کرتے ہیں۔

امیر خسرو	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	خطبۂ قدس است بملکِ قدیم
مولانا جامی	" " "	ہست صلائے سرِ خوانِ کریم
ہاشمی کرمانی	" " "	فاتحہ آرائے کلامِ قدیم
غزالی مشہدی	" " "	ہست شہاب از پئے دیوِ رجیم
فیضی	" " "	گنج ازل را ست طلسمِ قدیم
عرفی	" " "	موجِ نخست است ز بحرِ قدیم
شفائی	" " "	تیغ الٰہی ست بدستِ حکیم
ملا شیدا	" " "	آمدہ سرچشمۂ فیضِ عمیم
زلالی	" " "	مطلع دیباچۂ نظمِ قدیم
آزاد بلگرامی	" " "	تیغ سیہ تاب رسولِ کریم
میر الٰہی	" " "	قافلہ سالارِ کلامِ حکیم
صفا	" " "	ہست عصائے رہِ امید و بیم
وحید	" " "	کعبۂ جان و دلِ اہلِ نعیم
تمنا	" " "	ہست علاج از پئے قلبِ سقیم
قاسم	" " "	خال رخ آرائے عروسِ قدیم
کامی	" " "	مطلع انوارِ کلامِ قدیم
وحدت	" " "	مصرع برجستۂ نظمِ قدیم
معنی	" " "	حاصلِ ہر چار کتابِ قدیم
آزاد	" " "	آیتِ الطافِ خدائے کریم

لیکن جو بات نظامی کے مصرعہ "ہست کلید در گنج حکیم" میں ہے وہ ایک میں بھی نہیں پیدا ہوئی۔

نظامی نے مثنوی کے دیباچہ کے واسطے چند چیزیں لازمی کر دی ہیں۔ توحید، مناجات، نعت معراج، مدح سلطانِ وقت، تعریفِ سخن و سخنوراں اور سببِ تصنیفِ مثنوی۔ امیر خسرو نے ان کے اوپر پیر کی مدح اور شیخ نظامی کی استادی کا اقرار بھی اضافہ کر لیا جس کی تقلید ان کے بعد مثنوی نگاروں ہاتفی اور جامی وغیرہ نے بھی کی۔

مثنوی مخزن الاسرار میں نہ حسن و عشق کا افسانہ ہے نہ رزم و بزم کی داستان اور نہ سلسلہ وار کوئی قصہ صرف مذہبی اور روحانی جذبات کو ابھارنے والے چند مضامین شاعرانہ تخیل کے قالب میں ڈھال دیئے گئے ہیں۔ تین خلوت ہیں اور بیس مقالے، جن میں مختلف نصائح اور صوفیانہ باتیں ہیں۔ آخر میں خاتمہ ہے۔ جس میں مثنوی تمام ہو جاتی ہے۔

اس مثنوی سے ادبیاتِ ایران کا ایک نیا باب شروع ہوا ہے۔ اس وجہ سے اس کی اہمیت نہایت عظیم الشان ہے۔ پچاسوں جوابات لکھے جانے کے بعد بھی وہ اب تک لاجواب ہے اور بعض اساتذۂ سخن نے تو اس کو شاعری کا معجزہ قرار دیا ہے، جس کا مقابلہ ناممکن ہے۔

مثنوی مخزن الاسرار ایشیا اور یورپ میں مختلف مطابع میں چھپ چکی ہے۔ اس کی تین شرحیں قلمی دہلی کے کتب خانہ میں ہیں۔ ایک محمد بن رستم بن احمد بن محمود بلخی کی۔ دوسری ابراہیم تتوی کی اور تیسری امان اللہ کی۔ ایک شرح مولوی ظہور الحسن کی لکھنؤ میں ۱۸۸۹ء میں چھپ چکی ہے۔

انگریزی زبان میں اس مثنوی کے دو ترجمے ہوئے ہیں ایک ہنڈلے نے کیا ہے جو برٹش میوزیم میں قلمی رکھا ہوا ہے۔ دوسرا بلینڈ کا ہے جو ۱۸۴۴ء میں لندن میں چھپا تھا۔

مثنوی

مثنوی کا لفظ اصل میں مثنیٰ تھا جس کے معنی ہیں دو۔ دو۔ مولوی کے قاعدے کے مطابق یائے نسبتی لگا کر مثنوی بنایا گیا۔ چونکہ اس کے ہر ہر شعر میں دو دو قافیے ہوتے ہیں اس لئے اس کا نام مثنوی رکھا گیا۔

اصنافِ شاعری میں سے قصص، حکایات اور تواریخ وغیرہ کے لئے مثنوی کا شعبہ مخصوص کر لیا گیا اس لئے کہ طویل واقعہ یا افسانے کو قصیدہ یا غزل کی طرح ایک ہی قافیہ کی پابندی کے ساتھ منظوم کرنا سخت مشکل ہے۔ نیز آسانی کے لئے مثنوی چھوٹی بحروں میں لکھی جاتی ہے۔ بڑی بحریں مثلاً رجز، رمل، ہزج

نام وغیرہ اس میں نہیں استعمال کی جاتیں۔

عربی زبان میں مثنوی نہیں تھی۔ صرف متأخرین شعراء نے بہ تتبع عجم مثنویاں لکھا ہیں جو بالعموم غیر متداول ہیں۔

اساتذۂ فن کا قول ہے کہ شاعری کی جملہ اقسام میں مثنوی گوئی زیادہ مشکل ہے کیونکہ اس میں ہر شعر کے لئے وہی الفاظ لانے پڑتے ہیں جو معین معنی کے تابع ہوتے ہیں تاکہ قصہ یا مضمون کا تسلسل قائم رہے بخلاف قصیدہ یا غزل کے کہ ان میں یہ پابندی نہیں ہے۔

فارسی زبان کا پہلا مشہور شاعر حافظ ابوالحسن رودکی ہے۔ اسی کے عہد سے جہاں قصیدہ اور غزل گوئی شروع ہوئی وہاں مثنوی کا آغاز بھی ہوا۔ اس نے امیر نصر بن احمد سامانی کے حکم سے ۳۲۰ھ میں کلیلہ ودمنہ کا قصہ عربی زبان سے لے کر فارسی میں منظوم کیا اور چالیس ہزار درم انعام پایا عنصری نے بسبیل تذکرہ لکھا ہے۔

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش ‍ ‍ ‍ عطا گرفت بنظم کلیلہ و دمنہ

رودکی سے نظامی کے زمانے تک حسب ذیل مثنویاں لکھی گئیں۔

نام مثنوی	نام مصنف	سنہ وفات ہجری
گشتاسپ نامہ	دقیقی منصور بن احمد	
گرشاسپ نامہ	اسدی طوسی	۴۰۹
شاہنامہ و یوسف زلیخا	فردوسی طوسی	۴۱۱
ویس ورامین	فخر الدین اسعد گورگانی	۴۲۹
وامق و عذرا	عنصری	۴۳۱
روشنائی نامہ و سعادت نامہ	ناصر خسرو علوی	۴۳۱
قوس نامہ	حکیم قطران بن منصور	۴۸۵
حدیقۃ الحقیقۃ وغیرہ	حکیم سنائی غزنوی	۵۲۵
قصۂ یوسفؑ	عمعق بخاری	۵۴۳
وامق و عذرا	فصیحی جرجانی	

ان کے علاوہ اور بھی چھوٹی چھوٹی مثنویاں نظامی عروضی، سمرقندی اور بعض دوسرے شعراء نے لکھی تھیں۔ ان مثنویوں کا عام انداز یہ تھا کہ قصہ بہ واقعہ منظوم کر دیا جاتا تھا۔ مگر کلام کی فصاحت، شوکت، بندش و ترکیب کی چستی شاعرانہ لطافت اور نزاکت پیدا کرنے کا خیال کم کیا جاتا تھا۔

جب نظامی گنجوی کا زمانہ آیا تو ان کی دور بین نگاہ نے ان نقائص کو تاڑ لیا۔ انہوں نے شاعری کے تمام اصناف سے منہ موڑ کر زیادہ تر اسی شعبۂ مثنوی کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائی اور اس میں بہت سی اصلاحیں کیں۔

قدما کی مثنویوں میں جو نامانوس اور غیر فصیح الفاظ مستعمل تھے ان سے زبان کو پاک کیا اور رائج الوقت زبان جو عربی الفاظ کے اختلاط سے نہایت لطیف ہو گئی تھی استعمال کی بندشوں اور ترکیبوں میں چستی کا خیال رکھا۔ کلام کو بلند اور شاندار بنایا اور استعاروں اور تشبیہوں کے زیوروں سے اس کو آراستہ کر کے ایک نئی شکل و صورت میں جلوہ گر کیا۔ ناپسندیدہ قوافی چھوڑ دیئے۔ اور نامطبوع اوزان کو خارج کر کے صرف پانچ بحریں اس لئے مخصوص کیں[1]۔ مخزن الاسرار اور ہفت پیکر کی بحروں میں سب سے پہلے انہیں نے مثنوی لکھی۔ ان سے پیشتر کسی نے ان بحروں میں قدم نہیں رکھا تھا۔

قدما کی شاعری میں عشق مجازی تھا اور شاہد و مے کا راگ گایا جاتا تھا۔ انہوں نے ان چیزوں کو نکال کر تصوف اور فلسفے کو شامل کیا[2]۔ اگرچہ ان سے پہلے حکیم سنائی نے حدیقہ وغیرہ کئی مثنویاں تصوف میں لکھی تھیں لیکن ان کا انداز صوفیانہ اور واعظانہ تھا۔ شاعرانہ روش پر نظامی ہی نے ان مضامین کو ڈالا۔

الغرض شیخ نظامی نے مثنوی کا نہ صرف نیا قالب تیار کیا بلکہ نئی روح بھی اس میں پھونکی۔ وہ اپنے اس کارنامہ کو کس مستانہ انداز میں مخزن الاسرار میں لکھتے ہیں۔

مسند کہ وریں شیوہ مصیب آمدم — دیدکم آرزو کہ عزیب آمدم
شعر بمن صومعہ بنیاد شد — شاعری از مصطبہ آزاد شد

---

[1] متاخرین نے ان پر وزن اور اضافہ کر کے مثنوی کے سات اوزان قرار دیئے۔ امیر خسرو نے جدت پسندی سے اس پر بھی دو وزن اور بڑھا کر ایک مثنوی نو بحروں میں لکھی اور اس کا نام نُہ سپہر رکھا۔ لیکن محققین نے سات ہی اوزان باقی رہنے دیئے۔ چنانچہ مولانا جامی نے سات مثنویوں کو لکھ کر ان کا نام ہفت اورنگ رکھا۔

[2] نظامی فن نجوم کے ماہر تھے اس لئے ان کے کلام میں جا بجا اس کا اثر بھی آگیا ہے۔

زاہد و راہب سوئے من تاختند　　خرقہ و زنار دراندا ختند

اپنی تجدید فن کو سراہتے ہیں کہ میں صرف اپنی ہی تیار کی ہوئی شاہراہ پر چلا ہوں۔ کسی کی تقلید نہیں کی ہے۔

عاریت کس نہ پذیرفتہ ام　　آنچہ دلم گفت بگو گفتہ ام
شعبدۂ تازہ برانگیختم　　ہیکلے از قالب نو ریختم
صنعت من بردہ ز جادو شکیب　　سحر من افسون ملائک فریب

یہی وجوہ ہیں جن سے وہ فن مثنوی کے امام تسلیم کئے گئے اور کہا گیا ع
امام مثنوی گویاں نظامیست

مخزن الاسرار کے جوابات

یہ مثنوی بحر سریع مطوی موقوف (مفتعلن مفتعلن فاعلات) میں سب سے پہلی ہے جس کو نظامی نے ۵۸۲ھ میں لکھا۔ اس وقت سے امیر خسرو کے عہد تک جہاں تک ہمارا علم ہے کسی نے اس کا جواب یا اس بحر میں کوئی دوسری مثنوی فارسی زبان میں نہیں لکھی۔ ایک صدی سے زائد گزر جانے کے بعد ۶۹۸ھ میں امیر خسرو نے اس کے جواب میں اپنی مثنوی مطلع الانوار تصنیف کی۔ خسرو نے نہ صرف مخزن الاسرار بلکہ پورے خمسۂ نظامی کا جواب لکھا۔ ان کے بعد سے مثنوی گو شعراء نے خمسۂ نظامی کو اپنے پیش نظر رکھ لیا۔ اور اُن کی تقلید شروع کی بعض شعراء مثلاً شوکتی شیرازی نے خمسہ کے دو جواب لکھ ڈالے۔

لیکن مثنوی مخزن الاسرار خود نظامی کی مثنویوں میں ایک خاص پایہ رکھتی ہے۔ صاحب ہفت اقلیم نے تو اس کو شاعری کا معجزہ قرار دیا ہے اور بعض بعض اساتذہ مثلاً ہاتفی اور ہلالی وغیرہ نے بھی جنہوں نے خمسۂ نظامی کے جواب لکھے ہیں۔ اس کا جواب ناممکن سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے جتنے جواب لکھے گئے سب اس سے فروتر رہے۔

اب تک مشہور شعراء فارس نے مخزن کے جواب میں جو مثنویاں لکھی ہیں ان کی فہرست بہ ترتیب زمانہ ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

نام مثنوی	مثنوی نگار	سنہ وفات ہجری
مطلع الانوار	امیر خسرو	۷۲۵

نام مثنوی	مثنوی نگار	سنہ وفات ہجری
روضۃ الانوار	خواجو کرمانی	۷۵۳
مونس الابرار	خواجہ عماد فقیہ کرمانی	۷۷۳
گلشن ابرار	مولانا کاتبی نیشاپوری	۸۳۹
تحفۃ الاحرار	مولانا جامی	۸۹۹
منظر الابصار	قاضی سنجانی	۰
مظہر الآثار	امیر ہاشمی کرمانی	۹۴۸
مشہد انوار و قدرت آثار	غزالی مشہدی	۹۸۰
منظور انظار	رہائی مروی	۹۸۲
مظہر الآثار	حکیم ابوالفتح دوائی	
مجمع الابکار	عرفی شیرازی	۹۹۹
زبدۃ الافکار	نیکی اصفہانی	۱۰۰۰
مرصد الاحرار	ابواسحاق گازرونی	
مرکز ادوار	شیخ فیضی فیاضی	۱۰۰۴
مثنوی نامی	میر محمد معصوم نامی	
مثنوی شانی تکلو	آقا شانی تکلو	۱۰۲۳
منبع الانہار	ملک قمی و مولانا ظہوری	۱۰۲۴
دیدۂ بیدار	حکیم شفائی اصفہانی	۱۰۲۷
حسن گلوسوز	زلالی خوانساری	
مظہر الانوار	ہاشمی بخاری	
مثنوی طاہر وحید	مرزا طاہر وحید قزوینی	
مخزن والہ	درویش حسین والہ ہروی	
مطلع الانوار	میر محمد باقر داماد اشراق	۱۰۹۴
دولت بیدار	ملا شیدا	۱۰۸۰

ان کے علاوہ اور مثنویاں جو اسی بحر میں لکھی گئی ہیں مثلاً جلال اسیر، مولانا وحشی، شیخ علی حزیں یا قاآنی وغیرہ کی اگر ان سب کو ہم شمار کریں تو یہ فہرست بہت طویل ہو جاتی ہے۔

جوابوں پر ایک نظر

مخزن الاسرار کے جواب میں جس قدر مثنویاں لکھی گئیں بالاتفاق اساتذہ کے نزدیک کوئی بھی اس کے درجہ کو نہ پہنچ سکی۔ خلد برین میں مولانا وحشی کہتے ہیں۔

بانیٔ مخزن کہ نہاد ایں اساس　　مایۂ او بود بروں از قیاس
خانہ پراز گنج خدا داد داشت　　عالمے از گنج خود آباد داشت
ہر کہ بہمسائیگی او شتافت　　غیرت شاہی جگرش را شگافت

لیکن عام طور پر امیر خسرو کی مطلع الانوار ان جوابوں میں سب سے بہتر تسلیم کی گئی ہے۔ اس کے بعد مولانا جامی کی تحفۃ الاحرار عاصم کہتا ہے۔

بود نظامی بسریر سخن　　بادشہ طرز جدید و کہن
ملک سخن ملک نظامی بود　　شحنگی از خسرو و جامی بود

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ بعض ان جوابوں کی نسبت جو بڑے بڑے استادوں کے ہیں۔ نقادان فن کی رائیں درج کریں۔ عرفی شیرازی جو قصیدہ اور غزل کا نامور استاد ہے۔ اس کی مثنوی مجمع الابکار کی نسبت آذر اصفہانی لکھتا ہے۔

"عرفی در باب استعارہ اصرار دارد۔ بحدیکہ مستمع از معنی مقصود غافل می شود۔ از آنجملہ مثنوی کہ در برابر مخزن الاسرار گفتہ شاید بر بے وقوف مشتبہ باشد، اما استاد ماہر می داند کہ بسیار بد گفتہ۔"

حکیم ہمام کی رائے بھی اس مثنوی کی بابت یہی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

عرفی مادر غزل استاد بود　　خانہ خراب و دہش آباد بود
مثنویش طرز فصاحت نداشت　　کان نمک بود و ملاحت نداشت

ملک قمی اور مولانا ظہوری نے جو دربار دکن سے ملک الشعرا کا خطاب پائے ہوئے تھے۔ جب مخزن کے جواب میں منبع الانہار لکھ کر پیش کی تو ابراہیم عادل شاہ نے ایک شتر بار زر ان کو انعام دیا۔ ذہنی کاشی

اس عہد کا مشہور شاعر تھا۔ اس سے بھی اس قسم کی مثنوی لکھنے کا اشارہ ہوا، اس نے یہ رباعی لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔

در مدح و ثنایت اے شہنشاہ و دکن　　معذورم دار اگر نگویم مخزن
پسند کہ بہر یک شتر زر گیرم　　خون دو ہزار بیت بدور گردن

مرزا جلال اسیر خیال بندی کا موجد ہے۔ اس کی مثنوی کی بابت والہ داغستانی لکھتا ہے کہ

اکثر ابیاتش از لباس معنی عور ماندہ

مولانا ذلالی خوانساری کی مثنوی حسن گلوسوز کے متعلق داغستانی کی رائے ہے۔

"ذلال افکارش اکثر درد آمیز ست"

حکیم ابوالفتح دوائی کی مثنوی مظہر الاسرار پر تنقید کرتے ہوئے محمد طاہر نصر آبادی یہ لطیف جملہ لکھتا ہے۔

مثنوی کہ در بحر مخزن گفتہ اسرار خفیہ دراں درج ست۔ چوں فقیر قابلیت فہم آں معانی ندارم اکثر نافہمیدہ ماند "

ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ زاہد نے جب مخزن کی بحر میں مثنوی لکھی تو میر مرتضیٰ علی کے پاس جو مشاہیر شعراء اکبری میں سے تھے، سنانے کے لئے لے گیا۔ بسم اللہ کی تعریف میں شعر پڑھا۔

کنگرۂ سین چو خنداں شدہ　　خندۂ او از بن دنداں شدہ

میر موصوف نے کہا کہ "کنگرۂ سین چیست۔ بہ شعر تو در و دیوار خندہ می زند"

شیخ فیضی فیاضی نے مخزن کے جواب میں مرکز ادوار لکھی۔ اس میں اپنی عادت کے مطابق ایجاد معانی کے بڑے بڑے دعوے کئے۔ چنانچہ اپنے کو خطاب کرتے ہیں۔

تاز تو آراستہ گردد سخن　　معنی نو باید و لفظ کہن
تصفیۂ باطن مرتاض کن　　رو بسوئے مبدء فیاض کن
دزد سخن راہ بجائے نبرد　　کز کف او باز قفائے نخورد
چند خیال دگر اندوختی　　کیسہ پئے نقد دگر دوختن
قطع نظر کن زخیال دگر　　زانکہ پسر خواندہ نہ گردد پسر
ہر چہ خدا داد بر آں شاد باش　　طالب معنی خدا داد باش

لیکن اسی مثنوی کی بابت مولانا نشانی نے جو فیضی کے ہمعصر ہیں لکھا ہے۔

چند زنی لاف کہ در ساحری سامریم سامریم ساحری
دعوے ایجاد معانی مکن شمع نہ چرب زبانی مکن
طبع تو ہر چند در ہوش زد یک سخن تازہ نہ شد گوش زد
انچہ تو گفتی دگراں گفتہ اند در کہ تو سفتی دگراں سفتہ اند
خانہ کہ از نظم بیا راستی آب و گلش از دگراں خواستی
سقف منقش کہ دراں خانہ است نقش وے از خامۂ بیگانہ است
طبع تو دارد روش باغباں ساختہ باغے زنہال کساں
سبزۂ آں باغ زراغ دگر ہر گل رعناش زباغ دگر
غنچۂ آں گرچہ رواں پرور است لیک زخون جگر دیگر است

یہاں تک کہ آخر میں کہتے ہیں۔

یک سخن از نظم تو نہ بود درست مضحکۂ اہل سخن نظم تست
گرچہ بروئے تو نگوید کسے عیب تو پیش تو نجوید کسے
لیک بعیب تو ملامت گراں انجمن آرائے سخن پروراں
شعر ترا گر بہ میاں آورند عیب تو یک یک بزباں آورند
شعر ترا پیش تو تحسیں کنند وز پس تو لعنت و نفریں کنند

اگرچہ مولانا نشانی کی رائے میں کسی قدر معاصرانہ عداوت شامل ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ فیضی دوسروں کے مضامین عمداً اخذ کرتا ہے۔

ملا شیدا شاہجہانی عہد کا مشہور شاعر تھا۔ اس کی مثنوی دولت بیدار کی نسبت ریاض الشعرا میں لکھا ہے کہ

"اکثر اشعارش ماخوذ از دیگرانست نہ اینکہ بعنوان توارد بلکہ دریں امر عامد و مصر بود۔"

غزالی مشہدی کا اگرچہ یہ وتیرہ نہیں تھا۔ لیکن بعض بعض اشعار اس کی مثنوی میں بھی ایسے ہیں جن سے یہ شبہ ہوتا ہے مثلاً وہ لکھتا ہے۔

نام خود و نام پدر زندہ کن — مردۂ خود را بہنر زندہ کن
از پدر مردہ مگو ہر زمان — گر نہ سگی دم مزن استخوان

بعینہ یہی مضمون امیر خسرو کی مطلع الانوار میں موجود ہے۔

زندہ بہ مردہ مشو اے ناتمام — زندہ تو کن مردۂ خود را بنام
از پدر مردہ ملاف اے جوان — گر نہ سگی چوں خوشی از استخوان
ساخت طلسمے بہزاراں خیال — سر بسر از صنعت شعبِ کمال
گشت چو آں درج لآلی تمام — کرد ورا مخزن الاسرار نام
ملکِ سخن گشت مسلّم بدو — کرد ثنا جملۂ عالم بدو
مہر زد از خاتم و تم الکتاب — بست بروئے ہمہ راہِ جواب

لیک در فیض ازل بستہ نیست — ہیچ درے بستۂ پیوستہ نیست
چوں ز قضا لائحہ نو رسید — کوکبۂ نوبتِ خسرو رسید
خامۂ خسرو چو گہر بار شد — نامۂ او مطلع الانوار شد
کرد در آں نامہ تکلف بسے — گفت جوابے کہ نگوید کسے
گفتۂ او در نظر نکتہ داں — می دہد از علم لدنی نشاں

چوں مئے خسرو بہ تمامی رسید — دورِ مئے عشق بجامی رسید
قلزم طبعش چو گہر بار شد — نامۂ او تحفۃ الاحرار شد
ختم سخن گشت بنامش درست — گفت جوابے ہمہ شیریں و چست

بعد دو قرن از کرم ذو المنن — عشق بمن داد کلید سخن
باہمہ محتاجی و عجز و نیاز — ساختم از بسملہ مفتاح راز
مدرج ہر گنج کہ بکشا فتم — چوں کفِ آزادہ تہی یافتم

پیشتر از مرتبہ اہل فنکر — مصطبۂ گنج سخن بود بکر
چوں بدر آں مصطبۂ مفتوح شد — گنج معانی ہمہ مشروح شد
آنچہ تواں گفت نظامی ربود — باقی آں خسرو و جامی ربود
از گہر و گنج دراں سر زمیں — ماند ہمیں جائے تہی بر زمیں
من بچنیں خشک زمیں کردہ جا — بستہ دل خویش بفضل خدا

اس فضل خدا پر بھروسہ کرنے کا یہ انجام ہوا کہ مولانا جامی کی مثنوی کے بعد کا درجہ مبصرین فن نے اس مثنوی کو دے دیا۔

الغرض فن مثنوی کا آغاز اور اس کا خاتمہ دونوں نظامی ہی کے اوپر ہو گیا اور بعد کے شعراء قطعاً ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود نظامی کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مثنویوں میں کئی جگہ اس خیال کو ظاہر کیا ہے۔ مخزن میں کہتے ہیں۔

راہ روانے کہ دریں رہ روند — گر سخن از سحر سخن بشنوند
پیش نظامی بحساب ایستند — او دگر است ایں دگراں کیستند
منکہ دریں منزل شاں ماندہ ام — مرحلۂ پیشترک راندہ ام
تیغ ز الماس زباں ساختم — ہر کہ پس آمد سرش انداختم

یعنی الماس زبان سے میں نے تیغ زبان تیز کی ہے کہ جو کوئی شیوۂ سخنوری و مثنوی گوئی میں میرا تتبع کرے اس کا سر اڑا دوں۔

نظامی و خسرو دولت شاہ لکھتا ہے کہ امیر زادہ بائسنغر خمسۂ خسروی کو خمسۂ نظامی پر ترجیح دیتا تھا اور خاقان الغ بیگ خمسۂ نظامی کا معتقد تھا۔ ان دونوں بادشاہوں میں اس اختلاف کی وجہ سے کئی بار مخالفت بھی پیدا ہو گئی۔

افسوس یہ ہے کہ دولت شاہ نے وہ وجوہات نہ لکھے جو خمسۂ خسروی کی ترجیح کو ثابت کرتے۔

خان آرزو نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے بعض شعراء نے محض اس ایک شعر کی وجہ سے جو خسرو نے مطلع الانوار میں لکھا ہے۔

قطرۂ آبے نہ خورد ماکیاں — تا نکند رو بسوئے آسماں

خمسۂ خسروی کو خمسۂ نظامی سے بہتر قرار دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ شعر توحید میں نادر ہے۔ لیکن صرف اس ایک شعر کی وجہ سے پورے خمسہ کو ترجیح دینا عجیب بات ہے۔ قوسی ایرانی لکھتا ہے کہ "ہندوستان کے سخن فہموں پر تعجب ہے۔ کہ خمسۂ نظامی کے ۲۸ ہزار اشعار میں سے کہ ہر ایک عقد ثریا سے برابری کا دعویٰ رکھتا ہے اس پایہ کا ایک شعر بھی ان کو نہ مل سکا۔" حقیقت یہ ہے کہ یہ مضمون بھی خسرو کا نہیں ہے بلکہ ان سے پہلے خاقانی شروانی نے اس کو اپنے رنگ میں کئی جگہ باندھا ہے۔ ایک قصیدہ میں کہتا ہے۔

مرغ کہ آبگی خورد، سر سوئے آسماں برد گوئی اشارتیست ایں بہر دعائے شاہ را

برخلاف دولت شاہ کے جملہ آشنایانِ فن کی بالادستی یہ رائے ہے کہ جتنے خمسے نظامی کے جواب میں لکھے گئے کوئی بھی اس کے درجہ کا نہ ہوا، یہ مشہور ہے ؎

خمسۂ او ہست بہ نہیں پنج گنج

خود امیر خسرو کے متعلق انہیں کے زمانہ کے ایک شاعر عبید نے کہا تھا ؎

غلط افتاد خسرو راز خامی کہ سکبا پخت در دیگ نظامی

ایک دوسرے شاعر نے بھی کہا ہے اور امیر کے لفظ سے امیر خسرو کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ؎

گر دیگراں امیر بسیم و زر ندلیک ایں سکہ را بنام نظامی زوند و بس

مولانا جامی کے بعض معتقدوں نے ان کے خمسہ کو خسرو خمسہ سے بہتر قرار دیا ہے۔ لیکن خود جامی نے بہارستان میں لکھا ہے کہ خمسۂ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا۔ مگر خسرو کے خمسہ کو وہ زر خالص قرار دیتے ہیں اور نظامی کے جواہر خمسہ ا ۔ اور ان دونوں میں جو فرق ہے ظاہر ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

نظامی کہ استاد ایں فن ولیست دریں بزم گہ شمع روشن ولیست

ز دیرانۂ گنجہ شد گنج سنج رسانید گنج سخن را بہ پنج

چو خسرو بداں پنج ہمہ پنجہ شد ازاں بازوئے فکرتش رنجہ شد

کفش بود زانگو نہ گوہر تہی زرش ساخت لیکن زرِ دہ دہی

زر از سیم اگرچند برتر بود بلے کمتر از درو گوہر بود

تمام نقادانِ فن اس فیصلے کے ساتھ متفق ہیں۔

عاشقانہ مثنویاں مثلاً شیریں و خسرو یا لیلیٰ و مجنوں پھر بھی خسرو نے اچھی لکھی ہیں لیکن مطلع الانوار کو مخزن سے نسبت دینا مشکل ہے استادوں کی یہی رائے ہے کہ اس میں خامی ہے۔

اس جگہ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ مخزن الاسرار اور مطلع الانوار سے بعض بعض عنوانات کے ہم مضمون اشعار بالمقابل نقل کر دیں تاکہ ناظرین اصل اور جواب دونوں کا کچھ اندازہ کر سکیں۔

نظامی نے مخزن الاسرار میں جوانی کی غفلت سے تنبیہہ کی ہے۔ خسرو نے بھی اس مضمون کو سترہویں مقالے میں لیا ہے۔

نظامی	خسرو
عہد جوانی بسر آمد مخسپ	راہ مخوفست مخسپ اے جواں
شب شدہ اینک سحر آمد مخسپ	خیز کہ بگذشت ز پل کارواں
صبح برآمد چہ شوی مست خواب	خواب تو بسیار شب اندر گریز
کز سر دیوار گذشت آفتاب	تات سپیدہ نہ دمیداست خیز
رفت جوانی بتغافل بسر	آہ کہ ایام جوانی گذشت
جائے دریغ است دریغے بخور	عمر بدانگو نہ کہ دانی گذشت
چشمۂ مہتاب تو سردی گرفت	سینہ بہ برید طرب را امید
لالۂ سیراب تو زردی گرفت	لالہ کبود م شد و سبزہ سفید
شیفتہ شد عقل و تبہ گشت رائے	ماند ز رفتن قدم رہ گرائے
آبلہ شد وشت و درم گشت پائے	تک بہ تگ پائے بر دل شد ز پائے
غافلی از قدر جوانی کہ چیست	پیر شناسد کہ جوانی چہ بود
تا نشوی پیر ندانی کہ چیست	تا نشوی پیر ندانی چہ بود

نظامی نے ایک باغ کا بیان لکھا ہے خسرو نے بھی خلوت دوم میں انکی تقلید کی ہے یہیں دونوں کا منظر دکھاتا ہوں۔

قافلہ زن یاسمن و گل بہم	خندۂ گلہائے چمن رو برو
قافیہ گو قمری و بلبل بہم	نغمۂ مرغان ہوا سو بسو
فاختہ فریاد کناں صبح گاہ	فاختہ شیفتانہ دم از حق زدہ
فاختہ گوں کردہ فلک راز آہ	گرد گریباں نہ ازرق زدہ
چنگل دراج بخون تذرو	زاغ کہ با کبک نمودہ خرام

سلسلہ آویخته بر پائے سرو — خندہ فرو خوردہ شگوفہ بہ کام

چشمہ درخشندہ تر از چشم حور — آب ز مہتاب زمیں گرد تر

بروز سر چشمۂ خورشید نور — چشمہ ز خورشید جواں مرد تر

لالہ بہ آتش گہ راز آمدہ — لالہ کہ شد یاد دہن بوس او

چون مغ ہندو بہ نماز آمدہ — دیدۂ نرگس شدہ جاسوس او

خواست پریدن چمن از چابکی — تازہ شد از بر بہاری چمن

خواست چکیدن سمن از نازکی — خندہ زداز بوئے ریاحین سمن

اسی قسم کی بہت سی مثالیں نقل کی جاسکتی ہیں کیونکہ بالعموم ان مضامین کو جن کو نظامی نے لکھا ہے۔ جواب نگاروں نے بھی لکھنے کی کوشش کی ہے۔ امیر خسرو یہ جانتے تھے کہ میں نظامی کا مدمقابل نہیں ہوسکتا۔ اس کا انہوں نے جابجا اپنی مثنویوں میں اعتراف بھی کیا ہے۔ ان کا دعوے صرف یہ تھا کہ میں نظامی کی چربہ کشی کرسکتا ہوں اور بس۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں :-

آں نمط آرم کہ ہمہ ناقداں — فرق ندانند ازیں تا بداں

لیلیٰ اور مجنوں میں اس کو اور واضح طور سے کہا ہے :-

زاں سکہ کہ مرد پر ہنر داشت — بہ زیں نتواں نمونہ برداشت

خود امیر خسرو نے قرآن السعدین میں اپنا اور نظامی کا مقابلہ تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ ہم مختصراً اس کو درج کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو مخاطب کرکے کہتے ہیں۔

از ہوس مثنویت در دلست — حل کنم ایں بر تو کہ بس مشکلست

در بدکشی کز تو نیاید مرد — گفت بدم مشنود نیکو شنو

نظم نظامی بہ لطافت چو در — وز در او سر بسر آفاق پر

پختہ از و شد چو معانی تمام — خام بود پختن سودائے خام

زیں دو خیالے کہ ترا اکثر است — جستن آنماہ خیال کژ است

بگذر از یں خانہ کہ جائے تو نیست — ویں رہ باریک بپائے تو نیست

تا بود ایں سکہ بہ عالم درست — بستن تو سکے بود ایں شکستہ جست

بہ کہ دریں جنبش طبع آزمائے ــ سر بنہی با دل و آں گاہ پائے
گفتۂ او را شنود گوش باش ــ گفتۂ من بشنو و خاموش باش
سحر درانے کہ در و دیدہ اند ــ خامشی خویش پسندیدہ اند
مثنوی او راست تمنائے بگو ــ بشنو واز دور دعائے بگو
ایں ہمہ ز انصاف نگر زور نیست ــ گر تو نہ بینی دگرے کور نیست
گر نہ بدلے ایں نمط جاں نواز ــ بود کہ دلم را بتو بودے نیاز
لیک چو سرہا ہمہ زاں بوخوشست ــ عود تو آنجا علت آتشست
تا بود آوازۂ قمری بباغ ــ کس ندہد گوش بر آواز زاغ
درہوست می نگزاید عناں ــ می کشدت دل بخیال چناں
کوشش آں کن کہ دریں راہ تنگ ــ زاں گل تر بوئے دہندت نہ رنگ
از پئے بخشش بخدا آرزوئے ــ لیک عنایت ز بزرگاں بجوئے
سوز سخن را نہ بجا می طلب ــ پختگیش ہم ز نظامی طلب
لیک اگر پند من آری بگوش ــ مصلحت آنست کہ مانی خموش

ان باتوں کے جان لینے کے بعد اب ہر شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ انہوں نے مطلع الانوار میں جو یہ شعر لکھا ہے۔

دبدبۂ خسرویم شد بلند ــ زلزلہ در گور نظامی فگند

محض ایک سخن گسترانہ تعلی اور شاعرانہ شوخی ہے۔ نظامی کی تحقیر ہرگز اس سے منظور نہیں، حاشیہ چڑھانے والوں نے اس پر عجیب و غریب حاشیہ چڑھایا ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ امیر خسرو شعرار متقدمین پر جرح کیا کرتے، ان کے پیر حضرت نظام الدین اولیار اس بات کو منع فرماتے لیکن وہ کہتے کہ جب میں آپ کے سایۂ حمایت میں ہوں تو مجھے کسی کا خوف نہیں۔ جب نظامی کی شان میں انہوں نے یہ شعر کہا تو غیب سے ایک برہنہ تلوار نکلی اور ان کی طرف بجلی کی طرح لپکی اسی وقت غیب سے ایک ہاتھ پیدا ہوگیا جس نے اس تلوار کو اپنی آستین سے روک لیا۔ امیر خسرو اس واقعہ سے خوف زدہ ہوکر دوڑتے ہوئے اپنے پیر کے پاس گئے مگر قبل اس کے کہ کچھ کہیں پیر نے اپنی پھٹی ہوئی آستین دکھلائی۔ اسی وقت انہوں

نے سرنیاز زمین پر رکھ کر آئندہ بزرگوں کی جناب میں بے ادبی کرنے سے توبہ کی۔ اس واقعہ کو ایک عظیم شاعر نے نظم کر دیا۔

تیغ نظامی کہ بر آمد چو برق　　از سر خسرو سر مو بود فرق
ماہ رخش راست دو پیکر شدے　　گر نہ شدے پنجۂ پیرش چو درق

اس موقع پر خسرو کی مطلع الانوار اور ان کے مذکورۂ بالا شعر کی شاعرانہ توجیہ پر راقم الحروف بھی ایک نظم لکھتا ہے۔

اے صنم شیدائے طراز سخن　　خیز و ببیں جلوۂ تازِ سخن
بیں کہ چو حوریست بر آراستہ　　جاں پئے نذر قدمش خواستہ
نور رخش بیں کہ بزیر نقاب　　روشنیش خیرہ کند آفتاب
مطلع الانوار کہ نامش بود　　چشمۂ خورشید بجایش بود
معنی او در تہ حرف سیہ　　چوں بلشب تامہ مہ چار دہ
روشنیش زنگ زدائے دلست　　نے کہ پئے گلکن آب و گلست

مطلع انوار خدائیست ایں
شیوۂ اعجاز نمائیست ایں

خسرو سرمست ز جام سخن　　آنکہ بکف داشت زمام سخن
آنکہ بسر پنجگی کلک خویش　　ملک سخن ساختہ در ملک خویش
رسم نظامی ز سر آغاز کرد　　مخزن اسرار سخن باز کرد
کرد بزیر قلمش پنج گنج　　گشت باقلیم سخن گنج سنج
مہر زد گنج نظامی شکست　　سکہ خود را بسرش نقش بست
ملک سخن کردہ بزیر قلم　　میزند از خسروی خود علم

دبدبۂ خسروئم شد بلند
زلزلہ در گور نظامی فگند

مغیش آں نیست کہ از رشک و تاب　　سوخت نظامی چو بر آتش کباب
بلکہ ز اعجاز دم خسروی　　زندہ شدش رسم درہ مثنوی

دید چو شاگرد عقیدت سرشت	کرد ز وچرا و حرکت در بهشت
زلزله از هیبت و از خوف نیست	زانکه بجز حرمتش طوف نیست
کس نتوانست ز اهل سخن	تا بنهد پائے در آں انجمن
هر که نگه کرد بسویش ز دور	خیره شدش دیده ز انبوه نور

بارگه اوست بغایت بلند
زلزله کس می نتواند فگند

بادشه نظم نظامیست و بس	خام بود از دگراں ایں هوس
لیک کسانیکه دریں تنگنائے	گام نهادند بفرهنگ و رائے
خسرو از آنجمله دریں داوری	برد فضیلت بزباں آوری
گرچه نه هم سنگ نظامیست او	لیک پر از فیض و جامیست او
مطلع الانوار ز آیات اوست	معجزه گر نیست کرامات اوست
یافت ز سر از قلم خسروی	قاعدهٔ نظم نظامی نوی

بر قلمش باد هزاراں درود
از من و ازجملهٔ یاراں درود

علامہ محمد اسلم جیراجپوری

قرآنی فکر و بصیرت کے طائرِ پیش رس ہی نہیں، ایک دیدہ ور مؤرخ بھی تھے۔ اُن کا سلسلۂ تاریخ اسلام، جسے اُنہوں نے .....

تاریخ الاُمّت

... کے نام سے مدوّن فرمایا تھا۔ سلیس اور مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ، بڑا جامع ہے۔ یہ کئی درسگاہوں میں داخل نصاب ہو چکا ہے۔ طلوعِ اسلام ٹرسٹ نے اس پورے سلسلہ کو بڑی محنت سے شائع کیا ہے۔ تفصیل حسبِ ذیل ہے:

جلد اوّل مشتمل بر سابقہ جلد اوّل، دوم اور سوم
- سیرتِ نبی اکرمؐ
- خلافتِ راشدہ
- خلافتِ بنی اُمیّہ

جلد دوم مشتمل بر سابقہ جلد چہارم، پنجم
- خلافتِ عبّاسیہ
- خلافتِ عباسیہ (بغداد)

جلد سوم مشتمل بر سابقہ جلد ششم، ہفتم اور ہشتم
- تاریخِ مصر
- آلِ عثمان
- پوری تاریخ پر عالمانہ تبصرہ

زیرِ طبع

انشاء اللہ عنقریب تیار ہو کر آ رہی ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

التفہیمات الالٰہیہ

تذکرین

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب جو عربی و فارسی میں مل چکی ہے، مجلس علمی ڈابھیل نے پہلی بار دو جلدوں میں مع فہرست کے شائع کی ہے اور میرے پاس بھیجی ہے کہ اس پر تبصرہ لکھوں اس لئے مجھے اس حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔

یہ کتاب قلمی آج سے ۲۵، ۲۶ سال پہلے میں نے مطالعہ کی تھی۔ اس وقت اس کی طرف سے میری روح میں سخت بغاوت پیدا ہوئی تھی اور جس طرح شیخ اکبر علامہ محی الدین ابن عربی[1] کی فتوحات اور نصوص کے مطالعہ کے بعد ان کو بند کر کے میں نے ان سے صرف نظر کر لیا تھا۔ وہی معاملہ اس کے ساتھ بھی کیا۔ مگر باوجود اس کے ان دونوں بزرگوں کی عقیدت میرے دل میں قائم رہی۔ اور میں ان کی علمیت اور ولایت سے منحرف نہیں ہوا، تا آنکہ ایک مدت کے بعد مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ یہ حضرات اہل حال ہیں اس کے بعد میری اجنبیت جاتی رہی اور میں نے دوبارہ ان کی تصانیف کو جس قدر پڑھا اسی قدر محظوظ ہوا۔

لیکن تاہم میری یہ رائے حتمی تھی اور اب بھی ہے کہ یہ کتابیں عوام کے لئے جن میں وہ علماء و فقہاء بھی شامل ہیں جو اہل ظاہر ہیں اور لفظوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں، ہرگز مفید نہیں۔ بلکہ تشویش خاطر کا باعث ہیں۔ اس لئے ان کی اشاعت اسی حلقے میں محدود رہنی چاہئے، جو ان کو سمجھنے اور ان سے بہرہ ور ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

---

[1] اس کتاب میں جا بجا شیخ اکبر کو ابن العربی الف، لام کے ساتھ لکھا گیا ہے اور تصحیح نہیں کی گئی ہے، حالانکہ اہل علم میں یہ متیقن ہے کہ ابن العربی شیخ ابوبکر ہیں جو فقہاء شافعیہ میں سے ہیں اور جن کی کتاب احکام القرآن علماء میں بہت مقبول ہے اور ابن عربی بلا الف، لام کے شیخ اکبر علامہ محی الدین ہیں۔

شاہ صاحب پر جو فیوض اور عطیاتِ الٰہی ہوئے منجملہ اُن کے وہ شرح صدر بھی ہے جس کی بدولت اسرار و رموز کے بیان پر ان کو ایسی قدرت بخشی گئی جو آج تک کسی ولی کو نصیب نہیں ہوئی، اس کتاب میں انہوں نے سینکڑوں حقائق صوفیانہ، متکلمانہ اور فلسفیانہ زبان میں بیان کئے ہیں جن کو سمجھنے کے لئے ان علوم کے ساتھ قرآنی بصیرت کی بھی ضرورت ہے، جو لوگ صرف تصویروں کی عینک سے قرآن کو دیکھنے کے عادی ہیں وہ ان حقائق تک نہیں پہنچیں گے، اور یا تو ان سے بیزاری کا اظہار کر دیں گے، یا اضطراب کے گرداب میں پھنس کر حیرت میں پڑ جائیں گے۔ کیونکہ شاہ صاحب کے بیانات معنوی مشاہدات پر مبنی ہیں اور دلائل و براہین سے جن سے کہ اہلِ ظاہر فارغ ہوتے ہیں بیشتر عاری۔ دو ایک باتیں مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

حشر انسانی معاد کے متعلق اہلِ ظاہر یہ سمجھتے ہیں کہ ہر فرد مرنے کے بعد قیامت کے دن اٹھایا جائے گا اور اپنے نامۂ اعمال کے مطابق جزا یا سزا پائے گا اور ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہے گا، یا دوزخ میں، اس مدت کا کبھی خاتمہ نہ ہوگا۔

اور شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ "الرحمٰن" کا اسم رحموت کی جہت سے جملہ فعلیات پر حائز ہے اور ازل خالص ہے اس کی امتیازی خصوصیت صرف اسی فعلیت سے قائم ہے، ورنہ حقیقت ایک ہی ہے جس کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۤءُ الْحُسْنٰى (۱۷/۱۱)

اسی "الرحمٰن" کی تجلیات کے فیضان سے "انسانِ اکبر" کا ظہور ہوا۔ یہ انسانِ اکبر، انسانِ اصغر کے ساتھ حقیقتاً متحد ہے، ان میں باہم کلی اور جزئی کی تفریق کرنا منطقی عقل کا فسادِ نظر ہے۔ کیونکہ ان دونوں کی ساخت ایک ہی ہے اور ایک ہی کلمہ سے ہے۔ اسی انسانِ اکبر پر جس میں اس کے اجزاء (افراد) معطل اور محو ہوتے رہتے ہیں۔ فساد طاری ہوگا[1] اور بالآخر نہ صرف وہ بلکہ جملہ حیوانات و نباتات بھی فنا ہو جائیں گے یہاں تک کہ کوئی عنصر باقی رہے گا نہ کوئی فلک اور عدم کی آندھیوں کے جھکڑ ملا، عرش اور پانی پر چلنے لگیں گے۔ جس سے وجود کی دنیا سرتاسر ویران ہو جائے گی۔ اس کے بعد پھر الرحمٰن کی تجلیات کا آغاز ہوگا جن کی وجہ سے عالمِ ہستی کا نیا دور شروع ہو جائے گا۔

اس قسم کے کتنے دور گذر چکے ہیں؟ ان کا کوئی حساب انسانوں کے تو کیا خود آسمانوں کے بھی حاشیۂ خیال میں نہیں ہے۔ بلکہ گذشتہ دور کی یاد بھی نئے دور میں باقی نہیں رکھی جاتی۔

---

[1] غالباً آیت کریمہ وما خلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدۃ سے اس رمز کا سراغ لگایا ہے۔

عرش اہلِ ظاہر عرش کو اس طرح سمجھتے ہیں کہ اس کی نوعیت ایک تخت کی ہے جس پر اللہ مستوی ہے اور وہاں سے عالم پر اپنے احکام جاری کرتا ہے۔ قرآن میں یہ بھی ہے کہ "کان عرشہ علی الماء" (۱۱:۷)، جس کی تشریح حدیث میں اس طرح کی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کا فاصلہ ۷۱، ۷۲، یا ۷۳ سال کی راہ ہے اور آسمان سات ہیں۔ جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی قدر ہے۔ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے۔ اس کے اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھروں سے گھٹنوں تک کے فاصلے بھی اسی قدر ہیں، ان بکروں کی پُشت پر عرش ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے (ترمذی کتاب التفسیر باب سورۃ الحاقہ)

اور شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ وحدتِ کبریٰ اور وجودِ اقصیٰ کی پیہم تجلیات کا مآل کار ایک ایسی تجلی پر ہوا جو زبانِ شرع میں "الرحمٰن" کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس تجلی کے فیضان سے ایک ناسوتی موجود کا ظہور ہوا۔ جو دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ایک عرش جس پر الرحمٰن مستوی ہے اور دوسرا پانی[1]۔ جو عالم امکان کا مبداء ہے۔ جملہ کائنات کی صورتیں عرش میں ہیں اور جو اس سے خارج ہے۔ وہ عدم محض ہے۔ اس طرح یہ عرش مع اپنے مشمولات کے بمنزلہ شخصِ واحد کے ہے، جس کے آنکھ بھی ہے اور وہ "الرحمٰن" ہے۔ اسی کو اصطلاحِ فلسفہ میں عقل فعّال کہتے ہیں۔ اور جس کے نفسِ ناطقہ بھی ہے۔ جو مین اس کی ذات ہے اور جس کی جان بھی ہے جو اس کے تمام اعضا یعنی افلاک و عناصر میں ساری ہے۔ اور جس میں قلبی قوٰی بھی ہیں جن سے امورِ جزئیہ کا صدور ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کے بیان کے مطابق عرش و ماء دونوں میں چار چیزیں منسلط ہیں۔ یہاں وہاں، آج، کل، کون و فساد اور بالفعل و بالقوۃ۔ ناسوتی عقل نے ان کے لئے مکان و زمان و ہیولیٰ و صورت کے نام تراشے ہیں[2]۔ ان مثالوں سے میرا مدعا یہ ہے کہ شاہ صاحب کا بیان بلند اور لطیف سہی۔ لیکن جمہور مسلمانوں کے لئے کس قدر بعید الفہم ہے۔

---

[1] غالباً مراد ہے آیۂ کریمہ "وجعلنا من الماء کل شیءٍ حیّ" (۲۱:۳۰) میں نے اپنی کتاب تعلیمات قرآن میں وہ آیتیں بھی نقل کی ہیں جن میں عرش کے پانی پر اور پانی کے مبداء حیات ہونے پر غایتِ تخلیق کا انحصار ظاہر کیا گیا ہے۔

[2] نہ صرف یہی بلکہ فلسفیوں کے عقولاتِ عشرہ بھی اہلِ حقیقت کے نزدیک سراسر موہومات ہیں۔

ظہورِ خودی

راہِ عرفان میں جس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ عارف کے اوپر خود اس کے نفس کے مراتب کا ظہور ہوتا ہے۔ شاہ صاحب نے اس کتاب میں اپنے ان مراتب کو جا بجا بیان فرمایا ہے۔ میں ان کو نہایت اختصار کے ساتھ لکھتا ہوں۔

(۱) اللہ نے مقامِ کریم اور مرتبۂ عظیم سے مجھ کو سرفراز فرمایا جس پر بزرگوں کو بھی رشک ہوگا۔ لوگو! میں تم میں اجنبی ہوں تم مجھ کو نہیں جانتے۔ میرے سر پر تاج ہے اور ہاتھ میں قلم، میرا قلب حلیم ہے اور زبان شیریں۔
(صفحہ ۵۴، ج ۲)

(۲) دو گوہر گراں بہا بمن دادہ اند، یکے آں تمام دورۂ کمال، دیگر وصایۃ آنکہ مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ ہمہ جوشش او میزد۔

جہانیاں بمن آیند و ہمتے طلبند ۔۔۔ ازاں سبب کہ منم ایں زماں مطلعِ جہاں
کنوں وصی رسولم خزانہ دارِ علوم ۔۔۔ بدستِ ماست کنوں خیر وانتفاعِ جہاں[1]
(ص ۵۴ ج ۲)

(۳) مجھ سے کہا گیا کہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو جنت میں بلا حساب داخل کر دیئے جائیں گے[2]
(ص ۹۴ ج ۲)

(۴) اللہ سبحانہٗ نے مجھے مجددیت کا خلعت پہنایا۔ کیونکہ میرے اوپر حکمت کا دور ختم ہو گیا۔
(ص ۱۳۳، ج ۲)

(۵) میں اللہ کی کس زبان سے حمد کروں اور کن لفظوں میں اس کی صفت بیان کروں جس نے مجھ کو سارے کمالات عطا کر دیئے۔ (ص ۱۴۳، ج ۲)

(۶) مجھے صحابہ کرامؓ، اولیاء عظام اور علماء اعلام کے مقامات ملے، پھر وصایت، ارشاد اور مجددیت کے مناصب عطا ہوئے۔ (ص ۱۴۴، ج ۲)

(۷) چہ گوئی در حق کسیکہ منسلخ است بسوئے وحدت کبریٰ ہر جہت ولیست، و ہر جہت

---

[1] غالباً شاعری کا کمال شاہ صاحب کو نہیں عطا ہوا، کیونکہ کمالاتِ بزرگانہ میں ان کا شمار نہیں ہے۔
[2] اس کا ماخذ یہ آیت ہو سکتی ہے۔ ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا (الآیۃ)

تفضیل ولیت۔ (ص ۱۹۴، ج ۲)

(۸) مجھے معلوم ہے کہ قبر میں کون سی تجلی ہوگی اور کون سی حساب کے دن اور کون سی جنت میں۔ یہ جملہ تجلیات میرے سامنے حاضر بلکہ میرے قلب میں موجود ہیں۔ میں افلاک، معادن، اشجار، بہائم، ملائکہ، جن، لوح قلم، اسرافیل بلکہ ہر اس شئے کے کمال کا کامل احاطہ کئے ہوں جو وجود کے تحت میں ہے۔ (ص ۷۶، ج ۲)

(۹) اس نے مجھے اہل طریقت کا امام بنا دیا اور حقیقت قرب تک پہنچنے کے سارے راستے بجز میری پیروی کے بند کر دیئے۔ اب اہل مغرب و مشرق سب میری رعایا ہیں اور میں ان کا امام خواہ جانیں یا نہ جانیں۔ (ص ۱۲۵، ج ۲)

(۱۰) امراء اور ملوک میری زیارت کو آئیں گے۔ علماء و صلحاء مجھ سے استفادہ کریں گے، میرے اوپر ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی جائیں گی۔ میرے اصحاب اور ذریت میں برکت ہوگی۔ میں اگر نہ ہوتا تو دنیا بھی نہ ہوتی۔ (ص ۳۰، ج ۱)

(۱۱) امید آنست کہ اگر خدا نخواستہ بردست وے (من) زمانہ تازہ شود۔ (ص ۸۰، ج ۱)

(۱۲) میری پیروی دو جماعتیں کریں گے۔ ایک میں سابقین کی استعداد ہوگی، ایک میں اصحاب یمین کی۔ (ص ۱۸، ج ۲)

یہ اور اسی قسم کے بہت سے مراتب تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں موجود ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کا کوئی محل آیات یا احادیث سے نکل نہ سکے یا اہل ظاہر کو اس سے دہشت ہو۔

شاہ صاحب کے مجددیت کے دعوے پر اعتراض نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان کے ذریعے سے ہندستان کے مسلمانوں میں قرآن اور بالخصوص حدیث کا علم پھیلا اور جیسا کہ انہوں نے فرمایا ہے دو گروہ خصوصیت کے ساتھ اس کی نشر و اشاعت میں مصروف ہوگئے یعنی اہل حدیث و علماء دیوبند۔ ترویج اور شرک و بدعت کے مٹانے میں بلاخوف لومۃ لائم عملاً و علماً ایسی کوششیں کیں کہ سارے ہندوستان میں ان کی روشنی پھیلی اور توحید کا منارہ بلند ہوا۔ اگرچہ اب لامرکزیت کی وجہ سے ان میں اضمحلال پیدا ہوگیا ہے اور وہ ولولہ اور جوش جو پہلے تھا باقی نہیں رہا۔ پھر بھی ان کی دینی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

دیوبندی جماعت مرتفقین کا گروہ ہے جو عوام کے ساتھ ملا جلا رہا۔ اس نے تقلید کو بھی قائم رکھا۔

اور فروعی امور میں امتیازی خصوصیت اختیار کر کے اپنا فرقہ الگ نہیں بنایا۔ مگر اصولی اصلاح یعنی محو شرک و بدعت اور اشاعت کتاب و سنت میں پوری جد و جہد سے کام لیا۔ یہاں تک کہ اپنی اسلامی خدمات کی بدولت ہندوستان کے جمہور مسلمانوں پر ان کا اثر غالب آگیا اور اب تک مدرسۂ دیوبند کی وجہ سے چونکہ ان میں ایک مرکزیت باقی ہے اس لئے ان کی کوششوں کا سلسلہ جاری ہے۔ یہی جماعت اس وقت اسلامی ہند میں مذہب کی علمبردار ہے۔

یہ دونوں گروہ شاہ صاحب کو اپنا مقتدا اور پیشوا تسلیم کرتے ہیں۔ کیا یہ بات ان کی مجددیت کے ثبوت کے لئے کافی نہیں ہے؟ ہاں اپنی ذریت کے متعلق انہوں نے برکت کی جو خبر دی تھی وہ صرف تھوڑے زمانے تک صحیح ثابت ہوئی۔ پھر ان کی اولاد منقرض ہو گئی۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۱۰ء میں مولانا عبدالحق صاحب محدث دہلوی کے خاندان میں ایک شادی تھی جس کی شرکت کے لئے میں دہلی آیا تھا۔ اس وقت ایک شخص سید احمد نامی جو اپنے آپ کو ولی اللّٰہی کہتے تھے، مجھ سے ملے تھے۔ اُن کا قد چھوٹا تھا اور ڈاڑھی بڑی تھی وہ اسی کتاب یعنی تفہیمات کو طبع کرانے کی فکر میں تھے۔ اس کے چار جزء چھپے ہوئے مجھے دکھائے بھی تھے۔ اس کے تھوڑے ہی زمانے کے بعد وہ انتقال کر گئے۔ اب جہاں تک مجھے علم ہے شاہ صاحب کی ذریت میں کوئی باقی نہیں ہے۔

لطیفہ

حافظ حمید الدین فراہی مرحوم نے جو قرآن سے کبھی کبھی علمی لطائف بھی نکالا کرتے تھے ایک بار مجھ سے کہا کہ اس آخری دور میں اللہ تعالیٰ نے دو شخصوں کو خدمت قرآن کے لئے چُنا۔ جن کی خبر اس آیت میں دی ہے۔ وهو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمته وهو الولی الحمید (۲۸) یعنی شاہ ولی اللہؒ اور حمید الدین، ایسا ہی ایک اشارہ اس کتاب میں مجھے ملا۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

صوفی امروز اسمیست از اسماء حسنیٰ کما قال " وهو الذی ینزل الغیث الآیۃ" ہیچ میدانی کہ ایں کجا صورت خواہد بست۔ جائیکہ کس نگوید کہ پدر ولی فلانست و مادرش فلانہ" (ص ۱۸ ج ۲)

مجددیت

یہاں یہ ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ مسلمانوں میں دو منصب، مجددیت اور مہدویت کے احادیث کی رُو سے مسلّم چلے آتے ہیں۔ پہلا مجدد جو دوسری صدی ہجری کے سرے پر ہوا لوگوں نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کو قرار دے دیا۔ لیکن اس کے بعد سے یہ رتبہ علماء و صلحا کے حصے میں آگیا۔ ہر ہر صدی

میں مختلف جماعتیں مختلف اسلامی ممالک میں اپنے اپنے معتمد علیہ اکابر کو مجدد گردانتی رہیں۔ جس کا سلسلہ اب تک برابر چلا جاتا ہے۔ چونکہ مجددیت کا مدار عمل سے زیادہ ذاتی وجاہت پر ہے اس لئے اس کے واسطے میدان بہت وسیع ہے۔ مہدی کا منصب اہلِ سیف کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ کیونکہ اس کے فرائض علماء وصلحاء کے حیطۂ قدرت سے باہر تھے اور روایات کی بنیاد پر چونکہ یہ غیر اہل بیت سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے انہیں کے ساتھ مخصوص ہو گیا۔ دوسرے خادمانِ ملت وحامیانِ دین جنھوں نے جہاد اور اعلاء کلمۃ الحق میں اپنا خون اور پسینہ ایک کیا جیسے سلطان محمود غزنوی، سلطان نور الدین زنگی شہید، سلطان صلاح الدین اور سلطان محمد فاتح، وغیرہ ان کے واسطے نہ مجددیت رہی نہ مہدویت۔

اہلِ عرفان

قرآن میں وارثینِ کتاب کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ سابق، مقتصد اور ظالم النفسہ" (۳۵/۳۲) ان کی تفصیل مختلف صورتوں میں ہے۔ جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہاں اہلِ عرفان کا مقام معلوم کرنے کے لئے تاریخی ادوار کے لحاظ سے انہیں ناموں کے ساتھ مسلمانوں کے طبقات کو مختصراً بیان کرتا ہوں۔

(۱) سابق :۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کو ایسا امام متفق علیہ[1] نصیب ہوا جو خالص اللہ کی مرضی اور اس کے احکام کے مطابق چلنے والا تھا۔ مرکزیت کی بدولت اُن کے اجتماعی مقاصد متعین تھے اور اُن کے سامنے سوائے اللہ اور اس کی رضا کے کچھ نہ تھا۔ یہی مقربینِ بارگاہ ہیں۔ السابقون السابقون اولٰئك المقربون (۵۶/۱۰-۱۱) ان کو عرفان کی جستجو کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ صداقت مجسم ان کے سامنے تھی اور عمل بالقرآن نے خود ان کو سراسر عرفان بنا دیا تھا۔ افسوس ہے کہ ان کا زمانۂ نبوت کے بعد صرف ۳۰ سال تک رہا۔

(۲) مقتصد :۔ اپنے امراء کے تغلب سے یہ طبقہ امام متفق علیہ سے محروم ہو گیا اور براہِ راست احکام الٰہی کی ماتحتی سے ان کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اُن کے مرکزی مقاصد میں استبدادی اغراض شامل ہو گئے تھے۔ اس لئے ان میں سے بہت سے لوگ جزئی جماعتوں میں یا انفرادی طور پر اپنی اپنی نجات کی راہیں نکالتے تھے۔ انہیں میں سے کچھ لوگوں نے ترکِ دنیا اور زہد کا طریقہ اختیار کیا۔ یہی لوگ اہلِ عرفان یا اہلِ تصوف کہے گئے۔

---

[1] امام منصوص نہیں۔ کیونکہ قرآن سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ اگر امام منصوص کوئی ہے تو صرف رسول ہے جو امام متفق علیہ میں داخل ہے۔

(۳۱) ظالم لنفسہٖ : مقتصدین نے جب ایک مدت تک کی مہلت پاکر بھی اپنی حالت کی اصلاح کی کوشش نہیں کی اور اپنے امراء کی غلامی پر قانع رہ کر حکومتِ الٰہی کو بھلا بیٹھے تو اس کی سزا میں وہ اور ان کے امراء سب کے سب کفر کی محکومیت کے جہنم میں ڈال دیئے گئے۔ اُن کے لئے نہ صرف اجتماعی بلکہ بہت سے انفرادی راستے بھی نجات کے بند ہو گئے۔ لیکن پھر بھی مختلف راہیں مقبولیت کی کھلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے بھی کچھ لوگ تصفیۂ باطن کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور سلوک کے مقامات طے کرکے نجات کی امید رکھتے ہیں۔

اگرچہ اہلِ نظر میں ابھی یہی مسئلہ زیرِ بحث ہے کہ یہ نجات اور مقبولیت کا ذریعہ بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ باطنی ریاضتوں سے یہی مدارج غیر مسلم کو بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس بحث سے قطع نظر کرکے نفسِ طریقت یا تصوف کو دیکھا جائے تو تاریخی حیثیت سے اس امر میں بہت کم شبہ کی گنجائش ہے کہ مسلمانوں میں یہ چیز عہدِ غلامی کی پیداوار ہے۔

ان اہلِ عرفان میں بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر ان کو متفق علیہ امام مل جائے تو وہ بھی سابقین کے رتبہ تک پہنچ جائیں۔ مگر اجتماعی اعمالِ نجات کی راہیں بند پاکر ان کا سارا رجحان باطنی اصلاح کی طرف ہو جاتا ہے۔ اس راہ میں آسانیوں سے زیادہ دشواریاں ہیں اور ایسے مقامات آتے ہیں کہ اگر حبل اللہ یعنی قرآن کا دامن دونوں ہاتھوں سے مضبوط نہ پکڑے ہوئے رہیں تو قدم اپنی جگہ سے اُکھڑ جاتا ہے اور پھر حیرت میں سرگرداں ہونے لگتے ہیں۔

ان حضرات میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جن پر حال کا غلبہ ہو جاتا ہے اور ان کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں مگر بعض کی نسبتِ علمی حال پر غالب رہتی ہے۔ وہ اُن قلبی واردات کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کے لئے نہ زبان ہے نہ الفاظ۔ اس وجہ سے بالعموم ان کے کلام میں ابہام پایا جاتا ہے۔ علاوہ بریں یہ کلام بھی خالص صحو میں نہیں ہوتا بلکہ فی الجملہ سکر کی کیفیت اس میں شامل رہتی ہے۔ ان بیانات کو زیادہ سے زیادہ وجدانیات اور ذوقیات کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ بعض اہلِ علم نے تو ان کو سراسر شطحیات قرار دیا ہے۔

اُن بزرگوں میں سے جنہوں نے ان کیفیات کو لکھا ہے۔ شیخ اکبر اور شاہ صاحب ممتاز ہیں۔ شاہ صاحب کا قدم جادۂ شرع سے کہیں ہٹنے نہیں پایا۔ مگر شیخ اکبر نقطۂ اتصال پر پہنچ کر جہاں حظیرۂ قدس کی تجلیات کا ظہور ہوتا ہے۔ اتحاد کی طرف جھک گئے اور اپنی کتاب فتوحاتِ مکیہ کا پہلا فقرہ یہ لکھا۔

سبحان الذی خلق الاشیاء وھو عینھا

اور پھر زندگی بھر اسی کی تشریح کرتے رہے۔

مجھے امام ابنِ تیمیہؒ جیسے شخص پر جو اس قابل ہیں کہ اُمت اُن کے اوپر فخر کرے تعجب آتا ہے کہ انہوں نے حال کا کوئی لحاظ نہیں رکھا اور شیخ اکبرؒ جیسے قدوۃ الاولیاء کو طاغوتِ اکبر کہہ دیا۔ بجز اس کے کیا کہا جائے کہ یہ وہی اہلِ باطن و ظاہر کا مقابلہ تھا جو اس سے پہلے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور امام ابنِ جوزی میں پیش آچکا ہے۔

باوجود اس کے کہ شاہ صاحبؒ نے غلبۂ حال میں بھی ظاہر شرع کا لحاظ رکھا ہے اور اس سے تجاوز نہیں کیا ہے پھر بھی وہ اپنے اس کلام سے خوش نہیں ہیں بلکہ اس سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"یہ بیان میری فطرت کی قوتِ ممیزہ کے باعث ہے۔ میں عنقریب اس کو قتل کر کے ایک گہرے کنوئیں میں دفن کر دوں گا۔"

(ص ۱۵ ج ۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسبابِ زوالِ اُمّت

(از رسالہ طلوعِ اسلام، ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ)

اس زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے سب سے زیادہ حیرت انگیز امر مسلمانوں کا زوال ہے۔ کیونکہ وہ ایسی سچی اور روشن کتاب کے حامل ہیں جو اُن کو نہ صرف آخرت بلکہ دنیا میں بھی ہر قسم کی عزت اور بلندی بخشنے کا اعلان کرتی ہے۔

قرآن کا وعدہ حق ہے کہ مومنوں کے لئے امن ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (۶/۹)

جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو انہوں نے ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا، ان کے لئے امن ہے اور وہ ہدایت پر ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ عزت مومنوں کے لئے ہے۔

لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ (۹/۲۸)

حقیقت یہ ہے کہ عزت اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے لئے ہے۔

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ مومنوں کی مدد اللہ کے ذمہ ہے اور وہی سربلند رہیں گے۔

وَكَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۳۰/۴۷ ، ۳/۱۳۹)

اور ہمارے اوپر ہے حق مومنوں کی مدد کا۔ اور نہ شکستہ ہو اور نہ غم کرو حال یہ ہے کہ تمہیں سربلند ہو گے۔ اگر تم مومن ہو۔

قرآن یہ بھی اطمینان دلاتا ہے کہ کفار کو مومنوں پر کبھی غلبہ نہ ہوگا۔

وَلَن يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (۴/۱۴۱)

اور اللہ کافروں کو کبھی مسلمانوں کے اوپر راستہ نہ دے گا۔

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ مومن کفار پر ہمیشہ غالب رہیں گے۔

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۴۸/۲۲)

اور جو کفار تم سے لڑیں گے تو وہ نہ کوئی پشت پناہ پائیں گے نہ کوئی مددگار۔

اور قرآن مومنوں کے لئے روئے زمین کی بادشاہت کا بھی وعدہ کرتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۴/۵۵)

اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور عمل صالح کئے کہ ان کو ضرور روئے زمین کا بادشاہ بنائے گا۔

لیکن ان کے برخلاف صدیوں سے مسلمان ایک مسلسل زوال اور انحطاط کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں۔ جو سرعت کے ساتھ ان کو ہلاکت اور تباہی کی طرف لے جا رہا ہے اور نہ صرف یہ کہ وہ زندگی کی دوڑ میں اقوام عالم سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ بلکہ ان کا بڑا حصہ کفر و شرک سے مغلوب ہو کر محکومیت کے دردناک عذاب میں گرفتار ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم کے وعدے غلط نہیں ہو سکتے اور ممکن نہیں ہے کہ مومن ہوتے ہوئے ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے پورے نہ کرتا۔ اس لئے کچھ خرابیاں ہمارے ہی ایمان و عمل میں ہیں، جن کی وجہ سے ہم ان کے مستحق نہ رہ سکے۔

ہمارے اسباب زوال دو قسم کے ہیں۔ ایک خارجی، جو غیر اقوام کے حرب و ضرب و تغلب و تسلط سے پیدا ہوئے۔ دوسرے داخلی، جو ہماری بے راہ روی اور سیاسی غلطیوں کی وجہ سے پیش آئے۔ میں انہیں داخلی اسباب سے بحث کروں گا۔ کیونکہ ملت کے امراض کے اصلی باعث یہی ہیں۔ انھیں کی بدولت ہم کمزور ہو گئے۔ جس کی وجہ سے دوسروں نے جو توانا اور قوی تر تھے ہمارے اوپر تسلط جما لیا۔ اگر ان اسباب کے دفیعہ کا سامان ہو جائے تو کمزوری خود بخود جاتی رہے گی۔

لہٰذا اصل نقطۂ بحث وہی امور ہیں جن کے باعث ہم انعاماتِ الٰہی کے مستحق نہ رہے اور کرم کی جو بارشیں ہمارے اسلاف پر ہوئی تھیں ان سے محروم کر دیئے گئے۔ اس لئے لازم ہے کہ آغازِ عہد سے اُن کے اُوپر ایک سرسری نگاہ ڈالی جاتے تاکہ مسئلہ کی حقیقت واضح ہو سکے۔

اسلامی تعلیم کی اصلی روح یہ ہے کہ انسانوں کا حاکم اکیلا اللہ ہے اور سب صرف اسی کے بندے ہیں۔ یہ وہ عظیم الشان منتہائے نظر ہے جو قرآنی آیات میں جا بجا واضح کیا گیا ہے۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ ۔ (۱۲/۴)

کسی کی حکومت نہیں سوائے اللہ کے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم بجز اس کے کسی کے بندے نہ بنو۔

اسلام کی رُو سے ایک انسان دوسرے انسان پر یعنی ایک بھائی دوسرے بھائی پر حکمران نہیں ہو سکتا۔ ان معنوں میں کہ اپنی منفعت کے لئے اپنی منشا کے مطابق اس پر حکومت کرے، بلکہ اسلامی امارت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے احکامِ الٰہی کی تنفیذ کی جائے اور بس۔ اللہ کے سوا اسلام کسی کو حاکم نہیں تسلیم کرتا۔

خلافتِ راشدہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں جس طریق پر اُمت کو چلایا اس کے متعلق کچھ کہنا ہی غیر ضروری ہے۔ وہ تو خالص پیغمبرانہ تعلیم اور مربیانہ تربیت تھی جو عالم کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ آپ کا ۲۳ سالہ عہدِ نبوت گویا ۲۳ موتیوں کی مالا ہے جو زمانہ کی گردن میں پڑی ہوئی ہے۔ آپ کی صحبت کے فیض سے صحابۂ کرامؓ نے خلافت کو انہی اصولوں پر قائم کیا۔ خلیفہ میں شاہانہ تمکنت اور جاہ و جلال کی حکومت کی کوئی شان نہ تھی۔ عام لوگوں کی طرح وہ بھی سڑکوں پر پیدل پھرتا تھا، نہ اس کے ساتھ محافظ ہوتے تھے، نہ نقیب۔ سب لوگ اس سے ملتے تھے اور سب سے وہ ملتا تھا۔ اس میں اور دوسرے مسلمانوں میں بجز عہدۂ خلافت کے اور کوئی امتیاز نہ تھا، نہ اس کو اس قسم کی دینی ریاست حاصل تھی کہ جو چاہے حکم دے دے وہی مذہبی مسئلہ ہو جائے بلکہ وہ صرف احکامِ دینی کو نافذ کرنے کا مجاز تھا۔

اس خلافت کا کل زمانہ تیس سال رہا۔ اس تیس سال کے عرصہ میں مسلمانوں کو وہ سربلندی نصیب ہوئی کہ ترکستان سے بحرِ خزر تک اور افریقہ میں تونس تک اسلام پھیل گیا۔ اور قوت اس قدر زبردست ہو گئی کہ روئے زمین پر کسی کو اُن سے ٹکرانے کا یارا نہ رہا۔ یہ تمام آسمانی برکتیں اور فتوحات اور اُمتِ اسلامیہ

کی یہ عظمت و شان اس وجہ سے تھی کہ سب اسلامی نظام میں منسلک اور اکیلے اللہ کے فرمانبردار تھے۔ خلیفہ کی ذات میں ان کی مرکزیت تھی، جس کی وجہ سے ان کے ملی مقاصد متعین تھے اور ساری اُمت ایک محور پر گھومتی تھی۔

عہدِ بنی اُمیہ

خلافت راشدہ کے بعد بنی اُمیہ کا دور آیا جو اس دن سے شروع ہوا، جس دن امیر معاویہؓ کی خلافت پر عام بیعت ہوئی یعنی ۴۱ھ ۔ اس دور میں بھی جو ۹۲ سال رہا اُمت ایک ہی جھنڈے کے نیچے رہی۔ ان خلفاء کی ذات میں بھی اُمت کی مرکزیت قائم تھی اور خواہ وہ کیسے ہی رہے ہوں۔ اسلامی قوت اور شوکت کو انہوں نے سنبھالے رکھا بلکہ ولید بن عبدالملک کے عہد میں تو فتوحات کے حدود مشرق میں سندھ اور چینی ترکستان تک اور مغرب میں اندلس تک پہنچ گئے تھے۔ اور بری فوجوں کے علاوہ ایک طاقتور بحری بیڑہ بھی تھا۔ جس نے سطح آب پر کئی بار رومیوں کو شکستیں دی تھیں۔ دولت کی فراوانی کا یہ حال تھا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد میں اہل نصاب زکوٰۃ کو اشرفیوں کی تھیلیاں لے کر گھومتے تھے مگر کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا۔

استبداد

لیکن باوجود ان خوبیوں کے مرض پیدا ہو چکا تھا یعنی استبداد، وہ استبداد جو اقوام و اُمم کے لیے ہمیشہ مہلک ثابت ہوا ہے۔ اس کا پہلا مظہر خود ان کی خلافت تھی۔ خلفائے راشدہ میں سے اگرچہ ہر ایک کی نوعیت انتخاب جداگانہ تھی، مگر مشورہ اور بیعت عامہ یعنی جمہوریت کی روح ہر ایک میں موجود تھی۔ لیکن امیر معاویہؓ جو خلافت بنی اُمیہ کے بانی ہیں، ان کا انتخاب عام نہیں ہوا تھا۔ صرف اہل شام نے ان کو خلیفہ بنایا تھا اور اہل عراق نے امام حسنؓ کو منتخب کیا تھا مگر جب امیر معاویہؓ نے ان پر لشکر کشی کی تو انہوں نے اُمت میں خونریزی کو ناپسند کر کے مصالحت کر لی۔ لہٰذا اہل عراق نے بھی امیر معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی، مگر مغلوب ہو کر۔ اس وجہ سے ان کی خلافت میں تغلب شامل تھا۔ چنانچہ جب حضرت سعد بن وقاصؓ فاتح قادسیہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، امیر معاویہؓ کے پاس آئے تو ان کو اس طرح سلام کیا جس طرح بادشاہوں کو کیا جاتا ہے۔ امیر معاویہؓ ہنسے اور کہا کہ اگر تم مجھے امیر المومنین کہتے تو کیا بگڑ جاتا۔ انہوں نے جواب دیا کہ جس طریق سے تم نے خلافت حاصل کر لی ہے اگر مجھے ملتی تو میں کبھی قبول نہ کرتا۔

غرض اہل نظر اور ارباب تقویٰ خلافت کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے جو خلفائے راشدین کے عہد میں تھا۔ امیر معاویہ کا غلبہ اور تسلط سے اس کو حاصل کرنا ان کو پسند نہ تھا۔ اگرچہ بعد میں یہ تغلب رضامندی

سے بدل گیا، کیونکہ امیر معاویہؓ کی خلافت کی قابلیت میں کسی شخص کو بھی اختلاف نہ تھا۔ لیکن انہوں نے خلیفہ کے انتخاب عام کے دستور ہی کو توڑ ڈالا اور اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد مقرر کیا۔ جس کے بعد سے خلفائے بنی امیہ سلسلہ وار اپنے ہی خاندان کے افراد میں سے جس کو چاہتے تھے، ولی عہد بناتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی خلافت پر استبداد کا رنگ غالب رہا اور ان کی حکومت خاندانی سلطنت ہو گئی مگر چونکہ خلیفہ کا لفظ دینی اقتدار اپنے ساتھ لئے ہوئے تھے اس لئے انہوں نے اس لقب کو ترک نہیں کیا، کیونکہ اس کے ذریعہ سے وہ لوگوں پر اپنا مذہبی اثر قائم رکھتے تھے۔ بیشک بنی اُمیہ کی حکومت میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا عہد مستثنیٰ ہے۔ جنہوں نے ان کے مظالم کو مٹا کر خلافت راشدہ کی شان قائم کر دی تھی مگر ان کا کل زمانہ صرف دو سال پانچ ماہ تھا۔

قہر و غلبہ بنی اُمیہ کے عہد میں قہر و غلبہ کی حکمرانی تھی یہاں تک کہ عبدالملک نے جو ان کا چوتھا اور سب سے مدبر خلیفہ تھا، صاف صاف کہہ دیا کہ تم لوگ کیوں یہ خواہش رکھتے ہو کہ ہم شیخین رضی اللہ عنہما کے طریقے سے تمہارے اوپر حکومت کریں۔ پہلے خود تو ویسے بنو جیسے ان کے زمانہ کے لوگ تھے۔" اس وجہ سے ان کی حکومت میں وہ مظالم ہونے لگے جو اس استبداد میں لازمی ہیں۔ لوگ سختی کے ساتھ دبائے جانے لگے، جس کی طرف سے مخالفت ہوتی اس کا سر کٹوا کر مشتہر کیا جاتا۔ تاکہ دوسرے لوگ ڈر جائیں اور مخالفت کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

خلفاء کے علاوہ ان کے بعض بعض عمال نے بھی آزاد طبع اور حریت پسند مسلمانوں کو جنہوں نے خلافت راشدہ کا عہد دیکھا تھا نہایت سختی کے ساتھ محکوم اور رعایا بنانا شروع کیا۔ زیاد اور اس کے بیٹے ابن زیاد کے مظالم مشہور ہیں۔ یہ صرف شبہ پر لوگوں کو گرفتار کر کے سخت سزائیں دیتے تھے۔ حجاج بن یوسف کوفہ کے حاکم نے جس قدر آدمیوں کو قتل کیا مسعودی کے بیان کے مطابق ان کی تعداد سوا لاکھ سے کم نہ تھی۔

تفریق اُمت استبداد کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ ان کی حکومت رعایا کے فائدہ کے لئے نہیں ہوتی، بلکہ حکمران جماعت کے مقاصد کے لئے ہوتی ہے، یہ خلفاء اپنے مخصوص اغراض کے لئے قوم میں وحدت قائم رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ جاہلانہ عصبیتوں کو ابھار کر ان کو ایک دوسرے کا دشمن رکھتے تھے تاکہ ضرورت پر ایک فریق سے دوسرے فریق کے مقابلہ میں کام لے سکیں۔ ان کی باہمی عداوتوں کی وجہ سے خود خلفاء کو بھی خطرہ رہتا تھا اس لئے وہ اپنے ساتھ محافظ دستے رکھتے تھے۔ یہاں تک

کہ مسجدوں میں بھی ان کے لئے مقصورے بنائے جاتے تھے اور جب وہ نماز پڑھتے تھے تو دائیں بائیں دونوں طرف مسلح سپاہی حفاظت کے لئے کھڑے رہتے تھے۔ حالانکہ خلفاء راشدینؓ عام لوگوں کی طرح بازاروں میں پھرتے تھے اور سب کے ساتھ مسجدوں میں جاتے تھے اور خود نماز پڑھاتے تھے۔

بیت المال

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ خلفاء راشدین عام افرادِ ملت کیطرح بسر کرتے تھے۔ بیت المال کو مسلمانوں کی ملکیت سمجھتے تھے اور خود اپنے مال سے زیادہ اس کی حفاظت کرتے تھے اس میں سے سوائے اس کے جو اُن کے گزارہ کے لئے مقرر کر دیا جاتا اپنی ذات کے واسطے ایک حبّہ بھی نہیں لیتے تھے۔ اس پر بھی کہا کرتے تھے کہ خلافت کی ذمہ داریوں سے قیامت کے دن اگر ہم بلا عذاب اور ثواب کے نجل گئے تو بہت بڑی کامیابی ہے۔ لیکن خلفائے بنی امیہ شاہانہ شان وشوکت سے رہتے تھے۔ بیت المال کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے تھے اور جس طرح چاہتے تھے اپنی منشاء کے مطابق اس کو صرف کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ جس کا اقتدار خزانہ پر ہوگا وہی ملک کے لوگوں پر اپنا اثر قائم کر سکتا ہے۔ یہ خلفاء مسلمانوں کے بیت المال کو اپنے استبدادی اغراض پر صرف کر کے لوگوں میں مقبولیت حاصل کرتے تھے۔ کیونکہ جو لوگ اُن کے یہاں سے تنخواہیں پاتے تھے ان میں یہ جرأت باقی نہیں رہتی تھی کہ مخالفت کر سکیں، جو نافرمانی پر آمادہ ہوتا اس کی تنخواہ بند کر دی جاتی۔ چنانچہ یزید کے عہد میں اہلِ حرمین کی اور ولید کے زمانہ میں آلِ حزم کی تنخواہیں بند کی گئیں۔ انصار کے وظائف بارہا اس بنا پر روک دیئے گئے کہ اہلِ بیت کی طرفداری کرتے ہیں۔

[illegible] زکوٰۃ کی رقم قریش کے اعیان کو قرض پر دیتا تھا جس کی وجہ سے ان پر اپنا قابو رکھتا تھا۔ جہاں کوئی مخالفانہ حرکت ان سے نمایاں ہوئی فوراً قرض کا مطالبہ شروع ہو جاتا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ بنی امیہ کی اطاعت پر مجبور ہو گئے۔

ہوسِ زر

خلافتِ راشدہ میں ممالکِ مفتوحہ سے محاصل اس لئے وصول کئے جاتے تھے کہ مجاہدین کی ضروریات رفع کی جائیں لیکن بنی امیہ کا نصب العین چونکہ اپنے گھرانے میں ایک مستقل سلطنت قائم کرنا تھا، اس لئے اُن کو ضرورت ہوئی کہ طاقتور قبائل واشخاص پر اپنا اثر رکھیں۔ اس کی صورت سوائے اس کے اور کیا تھی کہ ان کے سامنے دولت پیش کریں، چنانچہ انہوں نے بیت المال کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا اور جا و بے جا بیدریغ اس کی رقمیں صرف کرنے لگے۔ اُمراء و رؤساء قبائل کے علاوہ خطباء وشعراء کو بھی بڑی بڑی رقمیں زبان بندی کے لئے دی جاتی تھیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ محاصل کی وصولی میں

ناجائز سختیاں بھی عمل میں آنے لگیں۔ یہاں تک کہ بعض صوبوں میں ذمیوں کے مسلمان ہو جانے کے بعد بھی ان سے جزیہ وصول کیا جانے لگا۔ افریقیہ اور خاص کر خراساں میں اس جھگڑے نے بہت طول کھینچا۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے یہ کہہ کر کہ ہم مبلغ ہیں محصل نہیں ہیں۔ اس خلاف اسلام طریقہ کو بند کیا۔ جس کے بعد لاکھوں ترک حدود سمرقند میں جو اسلام سے برگشتہ ہو گئے تھے پھر مسلمان ہو گئے۔

مالِ زکوٰۃ کو بھی جس کے مصارف خود قرآن کریم نے متعین کر دیئے ہیں۔ یہ خلفاء اپنے ذاتی مصارف میں خرچ کرتے تھے۔ یہ دیکھ کر عمالِ حکومت میں بھی دست درازی کی عادت ہو گئی۔ خلفاء بنو اُمیہ نے ایک مدِ تحصیل زر کی یہ بھی نکالی کہ عہدوں کو فروخت کرنے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمال ان کو اپنی زر خرید جائیداد سمجھ کر رشوت، غبن اور جبر ہر طریق سے دولت پیدا کرنے لگے۔ خلفاء جب ان سے خفا ہوتے تو ان کو برطرف کر کے ان کی جائیدادیں ضبط کر لیتے۔

الغرض شخصی اور استبدادی حکومت کی جو لازمی خرابیاں ہیں وہ خلافت بنی امیہ میں پیدا ہو چکی تھیں۔ خلفائے بنی امیہ اگرچہ مسلمانوں کا مرکز تھے لیکن ان کی مرکزیت خلفاء راشدین کی طرح اخوت مساوات اور جمہوریت کی مرکزیت نہ تھی بلکہ انہوں نے ملتِ اسلام کو جو خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں صرف اللہ کی غلام تھی اپنا غلام بنا لیا تھا۔

بنی عباس

بنی عباس جنہوں نے مخفی تبلیغوں سے بنی اُمیہ کی بغاوت کا بیج بویا اور پھر ان کے مقابلے کے لئے لوگوں کو کھڑا کیا۔ جب کامیاب ہو کر ۱۳۲ھ میں تختِ خلافت پر آگئے تو انہوں نے بھی وہی استبداد قائم رکھا جو بنی امیہ کے عہد میں تھا۔ ان میں سے ابتدائی آٹھ خلفاء کا زمانہ جو تقریباً سو برس رہا۔ قوت اور شوکت کا زمانہ تھا۔ انہوں نے شعائر اسلامی کا احترام رکھا، نمازیں بھی پڑھتے تھے، حج بھی کرتے تھے اور جہاد میں بھی حصہ لیتے تھے، مگر باوجود اس کے ملک و ملت کو ہمیشہ کے لئے اپنا اور اپنی اولاد کا غلام رکھنا چاہتے تھے۔ ایک کے بجائے دو دو بلکہ تین تین ولی عہد مقرر کرتے تھے اور ان کے عہدناموں پر اللہ اور رسول اور ملائکہ سب کو گواہ بناتے تھے تاکہ یہ جائیداد کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ جا سکے۔

اور ابد تک ساری ملتِ اسلامیہ انہیں کے استبداد کے شکنجوں میں رہے۔

خلفاء بنو امیہ کو تو جملہ امت کی مرکزیت بھی حاصل تھی مگر بنی عباس کے قبضہ سے اندلس

روزِ اوّل سے خارج رہا۔ جہاں بنی اُمیہ کے بقایا میں سے ایک شخص عبد الرحمٰن بن معاویہ نے پہنچ کر اپنی سلطنت قائم کرلی جو تھوڑے ہی دنوں کے بعد عظمت و شان کے لحاظ سے خلافتِ عباسیہ کی حریف ہو گئی۔ علاوہ بریں عہد بنی امیہ میں قوت کی حکمرانی تھی۔ کیونکہ ان کی سلطنت اپنی قوم عربوں کی عصبیت اور طاقت پر قائم تھی مگر بنی عباس نے عجمیوں خاص کر خراسانیاں کی مدد سے سلطنت حاصل کی تھی، اس وجہ سے قوی طاقت ان کے پاس نہ تھی۔ ان کی خلافت بجز اس کے کہ خلیفہ عرب تھا اور زبان عربی تھی سرتاسر عجمی تھی اور سارے وزارتیں اور امارتیں عجمی موالیوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ بنی عباس کو یہ خطرہ ہوا کہ کہیں یہ خلافت کو ہمارے ہاتھوں سے نکال کر دوسروں کو نہ دے دیں۔ چنانچہ انہوں نے ایرانیوں کی طاقت کے بالمقابل ترکوں کی بھی ایک فوج مرتب کی تاکہ توازن قائم رکھیں۔ مگر اس ترکی فوج نے خود خلفاء پر تغلب حاصل کرلیا۔ جس کو چاہتے تھے معزول بلکہ قتل کر دیتے تھے۔

خلفاء کی اس بے بسی کے زمانہ میں نئی نئی اسلامی سلطنتیں ظہور پذیر ہونے لگیں جن کے غلبہ سے وہ بالکل بے دست و پا ہو گئے۔ دیالمہ اور سلاجقہ کے تسلط کے عہد میں جو صدیوں رہا۔ ان خلفاء کا صرف مذہبی اثر رہ گیا تھا اور حکومت سلاطین کے ہاتھوں میں تھی۔ یہاں تک کہ ۲۹۵ھ میں افریقیہ میں فاطمیہ نے اور اس کے بعد اندلس میں عبد الرحمٰن ناصر نے اپنی اپنی خلافتوں کا اعلان کر دیا جس سے دنیائے اسلام میں بیک وقت تین خلافتیں قائم ہو گئیں جو ایک دوسرے کی حریف تھیں اور وہ مرکزیت جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوعِ انسانی کی صلاح و فلاح کے لئے نصب فرمایا تھا۔ ان قریشی خانوادوں کی باہمی رقابت اور دنیاوی منافست سے بازیچۂ طفلاں بن گئی۔

خلافت کا مقصد یہ تھا کہ جملہ بنی نوعِ انسان صرف حکومتِ الٰہی کے فرمانبردار ہوں نہ کہ انسانوں کے لیکن خلفاء بنی اُمیہ و بنی عباس نے اس کو محض خاندانی سلطنت بنانے کی کوشش کی۔ جس کا انجام وہی ہوا جو ہر ایسے دنیاوی کارگاہِ عمل کا ہوا کرتا ہے۔ اُمراء ولایت نے جب خلفاء کی یہ خود غرضی دیکھی تو ان میں بھی اس قسم کی خواہش پیدا ہوئی اور وہ یکے بعد دیگرے خود مختار ہوتے گئے۔ خلفاء کا رسماً صرف اسی قدر اثر رہ گیا تھا کہ یہ متغلبین تحفے اور ہدیے بھیج کر ان سے اپنی اپنی حکومتوں کے فرمان لکھوا لیتے تھے۔ آخر ۶۵۶ھ میں یہ بے جان خلافت بھی ہلاکو خاں کے ہاتھوں غارت ہو گئی۔

خلفاءِ عثمانیہ

بغداد کی عباسی خلافت کی تباہی کے بعد سلاطینِ مصر نے انہیں بقایائے بنی عباس میں سے ایک شخص کو مصر میں خلیفہ بنالیا تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنی حکومت کو مستحکم رکھیں۔ ان خلفاء کا عزل و نصب خود سلاطینِ مصر کے ہاتھوں میں تھا۔ جن کے وظیفہ پر یہ گذر کرتے تھے ۹۲۳ھ میں سلطان سلیم عثمانی نے مصر کو فتح کرکے خلافت بھی حاصل کرلی اور اس طرح اپنے دنیاوی وقار کے دستار میں دینی عزت کا بھی طرہ لگایا، لیکن خلفاء عثمانیہ بالطبع اپنے رتبۂ سلطنت ہی کو جس کے ذریعہ سے انہوں نے خلافت حاصل کی تھی بالاتر سمجھتے رہے اور سوائے سلطان کے کبھی اپنے آپ کو خلیفہ کہلانا پسند نہ کیا۔ علاوہ بریں ان کی خلافت بھی خلافتِ عامہ نہ تھی بلکہ ان کے رقبۂ مقبوضہ تک محدود تھی اور انہوں نے شروع سے آخر تک بجز حرمین شریفین کے خادم اور جزیرۃ العرب کے محافظ ہونے کے جو فتح مصر کے بعد ان کی سلطنت کا جزو ہوگیا تھا، فرائض خلافت کا خیال نہ رکھا یہاں تک کہ حج جس میں اقصائے عالم کے مسلمان آکر شریک ہوتے ہیں اور جو اجتماعِ ملت کا دینی مرکز ہے۔ اس میں بھی وہ کبھی نہیں آئے۔ بالآخر ۱۳۴۲ھ میں جمہوریہ ترکیہ نے اس خلافت کا بھی جو اتحادِ ملت کا ایک بوسیدہ رشتہ اور بے معنی ادارہ رہ گیا تھا الغا کردیا۔ جس کے بعد سے مسلمانوں کی مرکزیت زندگی کا نام بھی جاتا رہا۔

موجودہ حالت

آج اُمتِ اسلامیہ کی تعداد تمام عالم میں تقریباً ساٹھ کروڑ بتائی جاتی ہے جو دنیا کی بڑی سے بڑی قوموں کی تعداد سے اگر زیادہ نہیں ہے تو کم بھی نہیں ہے مگر ان میں سے سوائے ترک، ایرانی، افغانی اور عرب کے جن کی مجموعی تعداد چھ کروڑ سے زیادہ نہیں ہے۔ بقیہ ساری اُمت غیر مسلم حکومتوں کے قبضہ میں ہے۔ یعنی مسلمانوں کی مجموعی تعداد کا زیادہ سے زیادہ صرف دسواں حصہ ہے جو آزاد کہا جاسکتا ہے۔ ان آزاد اقوامِ مسلمہ کا بھی کوئی ایک مرکز نہیں ہے بلکہ متعدد خود مختار سلطنتوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ عرب جس میں اسلام کا چشمہ اُبلا تھا آج اس میں چھوٹی بڑی دس سلطنتیں ہیں جن میں سے کوئی کسی کے اثر میں ہے اور کوئی کسی کے۔ یہ سارا نتیجہ ہے اُمراء و سلاطین کی ان مطلق العنانیوں کا جن کی وجہ سے انہوں نے مرکزیت کا لحاظ نہیں رکھا اور اپنے ذاتی اغراض کے پیچھے ملت کے انجام پر نظر نہیں ڈالی۔

جو قومیں دوسروں کی محکوم ہیں ان کا انتشار تو اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ ان کے اعمال سے صلاحیت مفقود ہوگئی ہے۔ ادھر کم سے کم دو سَو سال کے کارناموں پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ باوجود کوششوں

اور قربانیوں کے بھی کامیابیوں کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہو سکا۔ مراکش سے لے کر دیوارِ چین تک کتنے ہنگامے اٹھے اور کتنے مجاہدانہ معرکے ہوئے مگر ہر ایک میں نقصان ہی اٹھانا پڑا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اُمّت کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے اور کوئی مرکز نہیں ہے جو اس کی قیادت کرے۔

ہندوستان کے متعلق میں کچھ کہنا نہیں چاہتا اس کی حالت خود آپ کے سامنے ہے یہاں دس کروڑ کے قریب مسلمان آباد ہیں۔ مگر اجتماعی زندگی کا نام تک نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم دن بدن ہر لحاظ سے گرتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ کوئی راہ نہیں جس پر سب متفق ہو کر چلیں، کوئی کام نہیں جس کو سب مل کر کریں۔ جمود اور تعطل کی زندگی ہے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

ذہنی تشتت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے صرف ایک کتاب لے کر آئے تھے یعنی قرآن کریم۔ جس پر عمل کر کے صحابہ کرام نے دینی اور دنیاوی سربلندی حاصل کی۔ خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم نے اپنا عمل اسی کتاب پر رکھا اور امت کو اس سے ہٹنے نہ دیا، جس کی وجہ سے ان کے زمانوں میں کوئی مذہبی فرقہ پیدا نہ ہو سکا اور ساری ملت متحد رہی۔

عہدِ بنی اُمیّہ میں جب استبداد کا تسلط ہوا تو خلفاء نے دنیا کو لے کر دینی قیادت چھوڑ دی جو علماء کے حصہ میں آ گئی۔ اسی وقت سے اختلافات پڑنے لگے اور شخصیت پرستی کی وجہ سے نت نئے فرقے بننے شروع ہو گئے۔ عباسی عہد میں فقہاء میں اختلاف واقع ہوئے جن کی وجہ سے رفتہ رفتہ ان کے پیروؤں کی ٹولیاں الگ الگ ہونے لگیں۔ اسی زمانے میں علوم عقلیہ کے تراجم ہوئے۔ اس وقت سے اختلافاتِ روایات و تاویلات کے باعث یہ ذہنی تشتت اور بھی بڑھ گیا۔ چنانچہ ایک ہی ملت میں ۷۲ فرقے بن گئے۔ جن میں سے ہر ایک اپنے ہی کو ناجی سمجھنے لگا اور دوسروں کو ناری۔ اس طرح پر ملت کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اُمتِ اسلامیہ کو دو عظیم الشان نعمتیں ملی تھیں۔ ایک قرآن کریم، دوسری امامتِ کبریٰ۔ یعنی مرکزیتِ امت جس کو آپ نے نصب فرمایا تھا۔ ملوکیت نے مرکزیت کو فنا کر دیا اور اشخاص پرستی نے قرآن کو متروک و مہجور کر دیا۔ جس سے دنیاوی اور دینی دونوں لحاظ سے اُمت میں لامرکزیت پیدا ہو گئی اور یہی زوال کا باعث ہوئی۔

مستقبل

اُمت کی آئندہ صلاح و فلاح کی صورت صرف یہی ہے کہ لامرکزیت چھوڑ کر وحدت کی طرف آئے، یعنی رفتہ رفتہ مسلمانوں کا مرکز ایک ہو جائے، جہاں سے ملت

کے اجتماعی مقاصد کی تعیین اور ان کو عمل میں لانے کی تشکیل ہو اور دینی مرکز قرآن کریم ہو تاکہ ہر قسم کی فرقہ بندی مٹ جائے اور سب کے سب متحد ہو کر ایک راستہ پر گامزن ہوں۔

حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد مسلم اقوام نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور ان کے پیش نظر نہ صرف ملت کا اتحاد عمل ہے بلکہ مرکزیت کا نصب کرنا بھی ہے۔ اس لئے امید ہوتی ہے کہ شاید ان عروق مردہ میں پھر زندگی کا خون دوڑنے لگا اور ساری امیدیں تو اللہ کے کرم اور رحم سے ہیں جو افراد کی طرح ملت کے گناہوں کو بھی معاف کر دیتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مسئلہ خلقِ قرآن

(از رسالہ البیان نومبر ۱۹۴۲ء)

ذیل کے گراں قدر مضمون میں عبارت کے تسلسل کی خاطر آیات بغیر ترجمہ ہی لکھنی مناسب تھیں اس لئے حضرت علامہ نے یہی التزام رکھا ہے لیکن ہم نے عام ناظرین کے افادے کے لئے حاشیہ پر اپنی طرف سے ترجمہ دے دیا ہے۔ ترجمے میں استدلال سے متعلقہ الفاظ پر خط کھینچ دیا گیا ہے۔

(مدیر)

مسلمانوں میں جب دینی عقائد کے متعلق موشگافیاں ہونے لگیں اس وقت معتزلہ نے نفی صفات اور تنزیہہ ذات کا عقیدہ نکالا۔ انہیں بحثوں کے سلسلہ میں ذاتِ باری سے صفتِ کلام کی نفی کے بعد قرآن کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کا سوال پیدا ہوا۔ سب سے پہلے دوسری صدی ہجری کے آغاز میں جعد بن درہم نے قرآن کے مخلوق ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس کے بعد جہم بن صفوان نے اس کا تتبع کیا۔ محدثین نے اس کو اسلام کے خلاف قرار دیا۔ چنانچہ جعد کو خالد بن عبداللہ قسری والیٔ عراق نے عید الضحیٰ کے دن بطور قربانی کے ذبح کیا اور جہم کو سلمہ بن احوز نے مرو میں قتل کر ڈالا۔ لیکن اس خیال کے پیرو باقی رہ گئے اور جہم کی نسبت سے ان کی جماعت فرقہ جہمیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔

مامون الرشید خلیفۂ عباسی کے عہد میں اس مسئلہ نے بہت اہمیت اختیار کر لی کیونکہ خلیفہ خود اور اس کے درباری علماء اسی خیال کے ہو گئے۔ اب انہوں نے علماء اہلِ سنت کے خلاف اپنی قوت سے کام لینا شروع کیا۔ بہت سے محدثین کو کافر قرار دے کر قتل اور قید کی سزائیں دیں اور سینکڑوں کو سخت اذیتیں پہنچائیں۔ اسی معاملہ میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اہلِ سنت کے چوتھے امام بھی ابتلا میں ڈالے گئے۔ ان کو خلیفہ معتصم کے دربار میں لا کر قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار لئے جانے کی کوشش کی جاتی تھی اور جب وہ اس سے انکار کرتے تھے تو کوڑے لگائے جاتے تھے۔ ۲۸ ماہ تک قید و بند اور امتحان و آزمائش میں مبتلا رہے۔ لیکن اللہ نے ان کو ثابت قدم رکھا اور وہ اپنے عقیدہ سے نہیں پلٹے۔ یہاں تک کہ خلیفہ متوکل کا

زمانہ آگیا جو اہلِ سنّت کا ہم خیال تھا۔ اس نے اس جھگڑے کو ختم کر کے علمار اور ائمہ کو اس مصیبت سے رہائی دلائی۔

اُردو زبان میں اس بحث کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ خود ہم نے "تاریخ الامت" میں اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، لیکن آج ہم امام احمد بن حنبلؒ کے رسالہ "ردِ جہمیہ" سے جو انہوں نے جہمیوں کی تردید میں لکھا تھا، اُس حصّہ کو نقل کرتے ہیں جو خاص اس مسئلہ سے متعلق ہے۔ ہم لفظی ترجمہ نہیں کریں گے بلکہ اپنے انداز و الفاظ میں ان کے بیان کا مطلب اختصار کے ساتھ لکھ دیں گے۔

امام احمدؒ۔ کیا تم کتاب اللہ کی کوئی آیت یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی صحیح حدیث پیش کر سکتے ہو جس سے یہ ثابت ہو کہ قرآن مخلوق ہے؟

جہمی۔ قرآن میں ہے، اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (زخرف ۳) جب اللہ نے قرآن کو عربی بنایا تو بنائی ہوئی چیز مخلوق کے سوا اور کیا ہو گی؟

امام۔ جعل کو خلق کے معنی میں لیکر تم غلطی میں پڑ گئے۔ یہ لفظ تو خلق سے عام ہے۔ یعنی ان معنوں میں بھی آتا ہے جن میں خلق نہیں آتا۔ مثلاً، جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ [1] (حجر ۹۱) کفار نے قرآنی آیات کو شعر، سحر، اساطیر الاولین [2]، اضغاث [3] احلام وغیرہ کہا۔ یہاں جعلوا کے معنی سموا کے ہیں۔ یعنی انہوں نے نام رکھا۔ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ (بقرہ ۱۹) وہ اپنی انگلیاں کانوں میں ڈال لیتے تھے ان کو پیدا نہیں کرتے تھے۔ حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا [4] (کہف ۹۶) میں بھی جَعَلَ کے معنی خَلَقَ کے نہیں ہیں۔ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا [5] (بقرہ ۱۲۴) یہاں بھی جاعل خالق کے معنی میں نہیں ہے، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کی تخلیق ان کے امام بننے سے پہلے ہو چکی تھی۔ علیٰ ہذا قرآن میں بہت سی آیتیں ہیں جن میں جعل خلق کے معنی

---

[1] جنہوں نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا

[2] اگلے لوگوں کی کہانیاں

[3] خواب ہائے پریشاں

[4] یہاں تک کہ جب ان (لوہے کے ٹکڑوں) کو اس (ذوالقرنین) نے آگ (کی طرح) کر دیا۔

[5] (اے ابراہیمؑ) میں (خدا) تجھ کو لوگوں کے لئے امام بنانے والا ہوں۔

میں نہیں لیا جا سکتا۔ بے شک کہیں کہیں جعل خلق کے معنی میں لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا [1] (اعراف ۱۸۹) وَجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ [2] (نمل ۶۱) وغیرہ۔ لیکن جو آیت تم نے پیش کی ہے، اس میں جعل خلق کے معنی میں ہرگز نہیں ہے۔

جہمی۔ آپ یہ بتائیے کہ قرآن اللہ ہے یا غیر اللہ۔ اگر اس کو اللہ کہتے ہیں تو یہ کفر ہے۔ اور اگر وہ غیر اللہ ہے۔ تو اس کے مخلوق ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔

امام۔ قرآن میں اللہ نے نہیں کہا ہے کہ میں قرآن ہوں بلکہ اسکو اپنا کلام فرمایا ہے اور ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ تم جو اس کو غیر اللہ قرار دے کر مخلوق کہتے ہو تو بتاؤ کہ کیا جملہ غیر اللہ پر اس لفظ کا اطلاق صحیح ہے؛ اللہ نے فرمایا ہے۔ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ [3] (اعراف ۵۴) دو چیزیں الگ الگ ہیں، ایک خلق، اور ایک امر۔ قرآن کو اس نے خلق نہیں کہا ہے بلکہ امر قرار دیا ہے۔ ذَٰلِكَ أَمْرُ اللَّهِ أَنزَلَهُ إِلَيْكُمْ [4] (طلاق ۵) اگر تم یہ کہو کہ خلق اور امر میں بلحاظ مخلوق ہونے کے کوئی فرق نہیں ہے تو ہم اس کو تسلیم نہیں کریں گے، کیوں کہ ہم قرآن میں یہ اصول مقرر پاتے ہیں کہ جب وہ ایک ہی چیز کو دو یا تین مختلف الفاظ میں ذکر کرتا ہے تو ان کے درمیان واؤ عاطفہ نہیں لاتا، مثلاً۔ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ [5] (حشر ۲۳) اور جب وہ دو مختلف چیزیں ہوتی ہیں تو ان کے درمیان فصل کے لئے واؤ داخل کرتا ہے۔ جیسے وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۝ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ۝ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ ۝ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ [6] (فاطر ۱۹-۲۰-۲۱-۲۲) ایک ہی آیت میں دیکھو۔ أَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنكُنَّ مُسْلِمَاتٍ

---

[1] ۔ آدم سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔

[2] ۔ زمین کے لئے پہاڑ پیدا کئے۔

[3] ۔ خلق اور امر اللہ ہی کے لئے ہے۔

[4] ۔ یہ امر الٰہی ہے جو اس نے تمہاری طرف اتارا۔

[5] ۔ بادشاہ۔ پاک۔ امن دینے والا۔ نگران

[6] ۔ اندھا اور آنکھوں والا یکساں نہیں۔ اور نہ تاریکیاں اور نہ روشنی اور نہ سایہ اور نہ دھوپ اور نہیں یکساں ہیں زندے اور مردے۔

مُؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا[1] (تحریم ۵) جہاں تک ایک ہی چیز کے مختلف اسماء یا صفات تھے وہاں تک بلا فصل رکھا، لیکن ثیبہ اور بکر دو مختلف صفتیں ہیں۔ جن کا باہم اجتماع نہیں ہو سکتا، اس لئے ان میں فصل کر دیا۔ تمہارا یہ دعویٰ کہ قرآن اگر اللہ نہیں ہے تو مخلوق ہے صحیح نہیں۔ قرآن وحی ہے اور صرف وحی ہے اور غیر مخلوق۔ اللہ فرماتا ہے: وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى[2] (نجم ۱ تا ۴) کفار قریش کہتے تھے کہ قرآن شعر ہے، افترا ہے، اضغاث احلام ہے، اساطیر الاولین ہے، سحر ہے، سنی سنائی بات ہے۔ اللہ نے قسم کھا کر کہا کہ وہ وحی کے سوا اور کچھ نہیں ہے اسکے بعد فرمایا، فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى، یعنی جبریل نے وہی کچھ اللہ کے بندے کو وحی کی جو اللہ نے اس کو وحی کی تھی۔ یہاں بھی قرآن کو وحی کہا، مخلوق نہیں کہا۔ (۵۳/۱۰)

جہمی۔ اچھا یہ فرمایئے کہ قرآن شے ہے یا نہیں؟

امام۔ بے شک وہ شے ہے۔

جہمی۔ پھر تو وہ مخلوق ہے کیونکہ اللہ نے اپنی صفت میں کہا ہے خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ[3] (زمر ۶۲)

امام۔ تم الفاظ کے ہیر پھیر سے لوگوں کو دھوکا دینا چاہتے ہو سنو! کیا اللہ نے اپنے لئے نفس کا لفظ نہیں استعمال کیا ہے۔ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ[4] (طہٰ ۴۱) يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ[5] (آل عمران ۲۸)

---

[1] (اے نبی کی بیویو!) تم سے بہتر بیویاں، اسلام والیاں، ایمان دار، فرمانبردار، توبہ کرنے والیاں، عبادت گزار، روزہ رکھنے والیاں، بیوہ اور کنواریاں۔

[2] ستارے کی قسم، جب گرے، تمہارا ساتھی نہیں بھولا، اور نہ بہکا اور نہ وہ خواہش نفس سے بولتا ہے۔ یہ صرف وحی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے۔

[3] اللہ ہر شے کا پیدا کرنے والا ہے

[4] (اے موسیٰ!) میں نے تجھے اپنے نفس یعنی اپنے خاص کام کے لئے تیار کیا۔

[5] اللہ تعالیٰ تم کو اپنے نفس (یعنی اپنے آپ) سے ڈراتا ہے۔

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ [۱] (انعام ۲)، پھر قرآن میں وہ کہتا ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ [۲] (آل عمران ۱۸۵) کیا تمہارے خیال میں نفس الٰہی کے لئے بھی موت ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ گو ہم قرآن کو شئ کہیں لیکن خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ میں قرآن جو امر، وحی، کلام اور قول الٰہی ہے، داخل نہیں ہے۔ اسی طرح جیسے كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ میں نفس الٰہی شامل نہیں ہے۔ قرآن میں اللہ نے سخت تاکید کے ساتھ کہا ہے۔ أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِيثَاقُ الْكِتَابِ أَنْ لَا يَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ [۳] (اعراف ۱۶۹) پھر دوسری جگہ حرام کیا ہے کہ أَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ [۴] (بقرہ ۱۶۹) اور اس کی سزا یہ رکھی ہے کہ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَى اللَّهِ وُجُوهُهُمْ مُسْوَدَّةٌ [۵] (زمر ۶۰) ان وعید کو دیکھتے ہوئے بے جانے اور بے سمجھے ایسے الفاظ کو استعمال کرنا جن کو اللہ یا اس کے رسولؐ نے کلام الٰہی کے لئے استعمال نہیں کیا ہے، سخت جرأت ہے۔

جہمی - قرآن میں تو اللہ نے کہا ہے، مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنْ رَبِّهِمْ مُحْدَثٍ [۶] (انبیاء ۲) محدث وہی مخلوق ہے۔

امام - (بہت دیر تک سوچنے، اللہ سے مدد مانگنے اور لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھنے کے بعد) قرآن کا اصول یہ ہے کہ جب وہ ایسا کوئی لفظ استعمال کرتا ہے جو عام ہو اور اس میں اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں قسم کے افراد ہوں تو جہاں مدح کے ساتھ ذکر ہوگا وہاں اعلیٰ افراد، اور جہاں ذم کے ساتھ ہوگا وہاں ادنیٰ افراد

---

[۱] اس نے اپنے نفس یعنی ذات پر رحمت کو لازم کرلیا ہے۔
[۲] ہر نفس موت کو چکھنے والا ہے۔
[۳] کیا ان سے تورات کے ذریعے عہد نہ لیا گیا تھا کہ اللہ پر سوائے حق کے کچھ نہ کہیں گے۔
[۴] ایسا نہ ہو کہ اللہ کے متعلق ایسی بات کہو، جس کا تمہیں علم نہیں۔
[۵] اور قیامت کے دن تو ان لوگوں کو دیکھے گا جنہوں نے اللہ پر جھوٹ بولا (کہ) ان کے منہ کالے ہیں۔
[۶] ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے کوئی نیا محدث، ذکر نہیں آتا، مگر وہ اس کو سن لیتے ہیں اس حال میں کہ وہ کھیل میں لگے ہوتے ہیں۔

مراد ہوں گے۔ مثلاً عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ[1]۔ (دہر ۶) عباد کا لفظ ہر قسم کے عباد پر مشتمل ہے لیکن مراد یہاں صرف نیکو کار ہیں، کیونکہ دوسری جگہ تصریح ہے کہ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِىْ نَعِيْمٍ[2] (انفطار ۱۳) اور لَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِى الْاَرْضِ[3] (شوری ۲۷) میں عباد سے مراد اشرار ہیں، کیونکہ مومنوں کی شان میں ہے، وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا[4] (۲۵/۶۷) اور قارون کے بارے میں ہے۔ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ[5] (قصص ۷۶) اب آیت مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ میں جو تم نے پیش کی ہے، وہ ذکر بھی ہے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوتا ہے اور وہ ذکر بھی ہے جو نبی کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ یہ محدث کا لفظ اس ذکر کے بارے میں ہے جو نبی کی وساطت سے ہوتا ہے جہاں صرف قرآن کا ذکر ہو گا وہاں محدث یا مخلوق کا لفظ بولنا صحیح نہ ہو گا[6]

جہمی۔ اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ کلمۃ اللہ ہیں اور عیسیٰؑ تو سب کے نزدیک مخلوق ہیں۔ پھر قرآن جو کلمۂ الٰہی ہے، کیوں مخلوق نہیں؟

امام۔ اللہ نے تمہارے دلوں اور قرآن کے درمیان پردہ ڈال دیا ہے، وہ تمہاری سمجھ میں کیسے آئے۔ قرآن حضرت عیسیٰؑ کو مولود، صبی، ذریۃ نوحؑ، اولاد ابراہیمؑ اور کھانا کھانے والا بتاتا ہے۔ کیا تم ان میں سے کوئی لفظ بھی قرآن کے متعلق استعمال کر سکتے ہو؟ دراصل وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ۔

---

[1] چشمہ ہے، جس سے اللہ کے بندے پیتے ہیں۔

[2] یقیناً نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے۔

[3] اگر اللہ اپنے بندوں کے لئے رزق فراخ کر دے تو وہ زمین میں سرکش ہو جائیں۔

[4] اور وہ لوگ جو خرچ کرنے کے موقع پر نہ بے جا خرچ کرتے اور نہ تنگی کرتے ہیں۔

[5] قارون موسیٰؑ کی قوم سے تھا اور ان پر زیادتی کرتا تھا۔

[6] یہ جواب سراسر تکلف ہے۔ آیت زیر بحث سے اول نبی مراد لے کر ان کو محدث کہنا صحیح توجیہ نہیں ہے۔ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ سے قرآنی آیات ہی مقصود ہیں۔ اس کا جواب قرآن کی رو سے یہی ہے کہ وہ محدث ہے مگر مخلوق نہیں ہے۔ آخر میں ہم اس کی تفصیل کر دیں گے۔ (اسلم)

[1] (نساء ۱۷۱) سے اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کلمۂ کن سے پیدا کئے گئے۔ وہ خود کن یعنی کلمۃ اللہ نہیں ہیں۔ لہٰذا کن، مخلوق نہیں بلکہ قول اور کلمۂ الٰہی ہے اور عیسیٰؑ مخلوق ہیں۔

جہمی۔ قرآن کو یا تو آپ آسمان میں تسلیم کریں گے یا زمین میں، یا ان دونوں کے درمیان، اور اللہ نے صریح کی ہے کہ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا[2] (فرقان ۵۹) اس لئے قرآن کو بھی لازمی طور پر مخلوق ماننا پڑے گا۔

امام۔ ما فوق السماء بھی کچھ موجودات ہیں، جن کو اللہ نے مخلوقات میں نہیں گنایا۔ اس لئے تم نے جو مکانی حدود و قیود سے استدلال کر کے قرآن کو مخلوق قرار دینے کی کوشش کی ہے وہ صحیح نہیں ہے اللہ نے فرمایا ہے۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ[3][4] (حجر ۸۵) وہ حق جس سے اس نے اس کی تخلیق کی ہے۔ کلمۂ کن ہے[5] اَللّٰهُ یَقُوْلُ الْحَقَّ[6] (احزاب ۴) وَالْحَقَّ اَقُوْلُ (ص ۸۴)

---

[1] مسیح، عیسیٰ بن مریمؑ صرف اللہ کا رسول اور اس کا کلمہ ہے جو اس نے مریمؑ کی طرف القا کیا۔

[2] وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے (چھ وقتوں میں) پیدا کیا۔

[3] ہم نے زمین، آسمانوں اور ان کی درمیانی چیزوں کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

[4] امام رحمۃ اللہ علیہ نے بالحق سے امر تکوینی جو مراد لیا ہے، بہت کچھ بحث کے قابل ہے اور میرے خیال میں صحیح نہیں ہے، یہ لفظ اصل مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ (انبیاء ۱۶) نہیں پیدا کیا ہم نے زمین اور آسمانوں کو کھیلنے والے البیان) اور وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا بَاطِلًا (ص ۲۷)، ہم نے زمین و آسمان اور ان کی درمیانی چیزوں کو باطل نہیں بنایا۔ البیان) کے مقابل میں مستعمل ہوا ہے جس سے اس بات کا اظہار کا مقصود ہے کہ ان کی تخلیق ایک نتیجہ اور انجام رکھتی ہے جو جزا و سزا کی صورت میں ہوگا۔ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ (جاثیہ ۲۲) اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، حق کے ساتھ اور تاکہ ہر جی کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے (البیان) باقی جہمی کے اعتراض کا جواب جو انہوں نے دیا ہے کہ کچھ چیزیں ہیں جن کو اللہ نے مخلوقات میں نہیں گنایا، اپنی جگہ پر ٹھیک ہے۔

[5] اللہ حق کہتا ہے۔

وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ[1] (انعام ۷۳)، قَوْلُهُ الْحَقُّ[2] (انعام ۷۳)، اس لئے کلمۂ حق آسمان و زمین کی تخلیق سے پہلے تھا جو اس کا قول ہے اور مخلوق نہیں ہے۔

توضیح مسئلہ ان سوالوں اور جوابوں کو دیکھ کر جہمیہ کے طفلانہ اعتراضات پر سخت افسوس ہوتا ہے۔ انھوں نے فلسفیانہ غلو اور قرآن سے ناواقفیت کے باعث ملت میں تشتت اور افتراق کا بیج بویا اور بہت سے بزرگوں کو مصیبت میں مبتلا کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ غیر مخلوق کہہ دینے سے قرآن قدیم ہو جاتا ہے جس سے قدماء کا تعدد لازم آتا ہے اس لئے خلیفۂ اسلام کا فریضہ ہے کہ وہ ایسے عقیدہ کا جو توحید کے خلاف ہے، انسداد کرے۔ دوسری طرف محدثین کے پاس بھی دلائل بھی اس قدر واضح نہ تھے جو ان کی تشفی کر کے اُن کو مطمئن کر سکتے اس لئے عصبیت پیدا ہوئی اور معاملہ بہت بڑھ گیا۔ عوام کو مطمئن کرنے کے لئے محدثین کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں پیش کر کے ان کے ایمان کو تازہ رکھیں۔ چنانچہ متعدد حدیثیں اس مضمون کی کہ "القرآن کلام الله غير مخلوق" نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی گئیں اور وعظ میں تذکیر کے ذریعہ سے لوگوں میں پھیلائی گئیں۔ لیکن اگر قرآن میں زیادہ غور کیا جاتا تو یہ مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا اور روایات کی مطلق ضرورت نہ پڑتی۔

امام رحمۃ اللہ علیہ نے اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ سے یہ جواب تو بالکل صحیح دیا کہ قرآن امر ہے خلق نہیں۔ لیکن عالم امر کی مزید حقیقت ان کے سامنے واضح نہ تھی کہ وہ حادث ہے اور محدث کا لفظ اس کے لئے بولا جا سکتا ہے۔ اس لئے جہمی کے استدلال مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ کا ٹھیک جواب وہ نہ دے سکے۔

اصلیت یہ ہے کہ امر کا لفظ قرآن کریم میں متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی حکم جیسے اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ[3] (یوسف ۴۰) بات، یا کام یا معاملہ جیسے شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ[4] (آل عمران ۱۵۹)

---

[1] اور جس دن کہتا ہے کہ ہو، تو وہ ہو جاتا ہے۔

[2] اس کا قول حق ہے۔

[3] اللہ نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو۔

[4] کام میں ان کا مشورہ لیتے رہو۔

اور فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ [1] (محمد ۲۱) امارت یا حکمرانی جیسے وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ [2] (شوریٰ ۳۸) اختیار جیسے لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا [3] (آل عمران ۱۵۴) امر تکوینی جیسے اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ [4] (یٰسین ۸۲) وغیرہ وغیرہ۔ لیکن آیت زیر بحث یعنی اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ میں جو امر مذکور ہے، وہ امر تدبیری ہے۔ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے کے بعد اللہ نے ان کی تدبیر نظام کے لئے اپنے اوامر نافذ فرمائے۔ اس طرح دو عالم الگ الگ ہو گئے۔ عالم خلق اور عالم امر خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ [5] (یونس ۳) سورۂ حم سجدہ میں تفصیل کے ساتھ بتایا کہ ہم نے دو دن میں زمین پیدا کی، پھر دو دن میں پہاڑ اور زمین کے جملہ اندرونی ذخائر بنائے پھر دو دن میں ساتوں آسمان کر کھڑے کئے۔ اس کے بعد اَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا [6] (حم سجدہ ۱۲) ساتوں بلندیوں میں اوامر تدبیری و انتظامی نافذ فرمائے۔ اسی طرح ساتوں پستیوں کے متعلق فرمایا کہ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ [7] (طلاق ۱۲) جس طرح ساتوں بلندیوں میں اوامر تدبیری نافذ ہیں، اسی طرح ساتوں پستیوں میں بھی۔ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ [8] (سجدہ ۵) اب واضح ہو گیا کہ عالم امر، عالم خلق کے بعد ہے اور دونوں حادث ہیں اور دونوں کی ہر چیز پر محدث کا لفظ بولا جا سکتا ہے عرش اور استواء علی العرش سب تخلیق عالم کے بعد کی چیزیں ہیں، جن کی قرآن میں متعدد مقامات پر تصریح ہے۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى

---

[1] پھر جب معاملہ پختہ ہو گیا

[2] اور ان کی حکمرانی آپس کے مشورہ سے ہوتی ہے۔

[3] اگر ہمارا بھی کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کئے جاتے۔

[4] اس کا حکم جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے صرف یہی ہوتا ہے کہ اسے کہتا ہے، ہو جا، سو وہ ہو جاتی ہے۔

[5] آسمانوں اور زمین کو چھ زمانوں میں پیدا کیا پھر وہ عرش پر غالب ہے، ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔

[6] ہر آسمان میں اس کا امر (انتظامی) وحی کیا۔

[7] سات آسمان پیدا کئے اور زمین سے انھیں کی مانند۔ ان کے درمیان (انتظامی) حکم نازل ہوتا ہے۔

[8] وہ اس امر کی تدبیر آسمان سے زمین تک کرتا ہے۔

عَلَى الْعَرْشِ[1] (سجدہ ۴) عرش وہی ہے جہاں سے امر تدبیری نافذ ہوتے ہیں، جن کا نفاذ رحمت کی تجلی سے ہوتا ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى[2] (طہٰ ۵) عرش یا استوا علی العرش کو قدیم سمجھنا جیسا کہ بعض ناسمجھ مفسروں نے لکھ ڈالا ہے۔ خود قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔

اسی امر تدبیری کے ذیل میں امر تشریعی ہے، وہ بھی تخلیق عالم کے بعد کی چیز ہے۔ بنی اسرائیل کے بارے میں ہے۔ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ[3] (جاثیہ ۱۷) خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ[4] (جاثیہ ۱۸) وحی اور کلام الٰہی اسی امر تشریعی میں داخل ہے۔ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَيْكُمْ (۵-۶۵)، وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا[5] (شوریٰ ۵۲) اس لئے قرآن کریم جو امر تشریعی ہے حادث اور محدث ہے۔ مگر عالم امر سے ہے۔ عالم خلق سے نہیں، لہٰذا اس کو مخلوق کہنا قرآن کے خلاف ہے۔

---

[1] جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، چھ وقتوں میں پیدا کیا۔ پھر اس کے بعد وہ عرش (حکومت) پر متمکن ہوا۔

[2] وہ رحمٰن (ہے جو) عرش (نظام سلطنت) پر غالب ہے۔

[3] اور ہم نے انہیں امر (شریعت) کے متعلق کھلی دلیلیں دیں۔

[4] پھر ہم نے تجھے اس امر کی ایک کھلی شریعت پر لگا دیا۔

[5] اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے امر سے ایک روح (قرآن) وحی کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وہم تعارض

(از رسالہ البیان جون سنہ ۱۹۴۳ء)

قرآن کریم کی بعض آیتوں میں لوگوں کو تعارض کا خیال پیدا ہوا۔ بلا مزید غور و فکر کے، لگے ایک کو دوسرے سے منسوخ کرنے اور انہوں نے یہ نہ سوچا کہ قرآنی تعلیمات میں تعارض ممکن نہیں ہے۔ یہ جو کچھ ہے ہماری فہم کا قصور ہے۔ اس نسخ کی بحث کو تفصیل کے ساتھ میں اپنی کتاب تاریخ القرآن وغیرہ میں لکھ چکا ہوں جو ان کو دیکھے گا وہ یقین کر لے گا کہ موجودہ آیاتِ قرآنی میں سے ایک آیت بھی منسوخ نہیں ہے۔

ان کے علاوہ کچھ آیتیں ایسی ہیں جن میں تعارض کے وہم کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ توجیہات کچھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہیں، کچھ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ میں میری نظر سے گزریں اور بعض دیگر تفسیروں، خاص کر حافظ جلال الدین سیوطی کی الاتقان میں، ان میں سے بعض توجیہات مجھے صحیح معلوم نہیں ہوئیں اور بعض کی متعدد توجیہات کی گئی ہیں۔ حالانکہ صحیح توجیہہ تو صرف ایک ہی ہو سکتی ہے۔ اس لئے ان سب کو مطالعہ کرنے کے بعد ان میں سے جو توجیہہ مجھے صحیح معلوم ہوئی یا جو میں نے خود سوچی ان سب کو اپنے الفاظ میں اختصار کے ساتھ لکھتا ہوں۔

(۱)

قَالُوا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ (۶/۲۳)

(قیامت کے دن مشرک، کہیں گے کہ ہمارے پروردگار اللہ کی قسم ہم مشرک نہ تھے۔

لَا يَكْتُمُونَ اللّٰهَ حَدِيثًا (۴/۴۲)

وہ اللہ سے کوئی بات چھپائیں گے نہیں۔

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرک اپنے شرک کو چھپائیں گے اور دوسری آیت کہہ رہی ہیں۔

کہ وہ کوئی بات نہیں چھپائیں گے۔ جواب یہ ہے کہ مشرک موحدوں کو نجات پاتے ہوئے دیکھ کر اپنے شرک کو چھپانے کی کوشش کریں گے مگر ان کے منہ پر مہر لگادی جائیگی اور ان کے ہاتھ اور پاؤں ان کے اعمال کی شہادت دینے لگیں گے۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۳۶/۶۵)

آج ہم ان کے منہ پر مہر لگادیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور ان کے پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔

اس لئے "چھپائیں گے نہیں" کے معنی ہیں "چھپا نہیں سکیں گے" لہٰذا تعارض جاتا رہا۔

(۲)

فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ (۲۳/۱۰۱)

اس دن نہ ان میں رشتے ہوں گے نہ وہ آپس میں پوچھ گچھ کریں گے۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ (۳۷/۵۰)

اور وہ ایک دوسرے کی طرف رخ کرکے سوال وجواب کریں گے۔

پہلی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ چونکہ قیامت میں رشتے باقی نہیں رہیں گے۔ اس لئے آپس میں رشتہ داراز ہمدردی یا امداد نہ ہوگی اور دوسری آیت میں میدانِ حساب میں تابعین و متبوعین کے باہمی سوال وجواب کا ذکر ہے، یعنی دو مختلف چیزیں ہیں دو مختلف اوقات میں جن میں تعارض پیدا نہیں ہوتا۔

(۳)

وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا (۱۷/۹۷)

اور ہم ان کو قیامت کے دن اوندھے منہ اٹھائیں گے، اندھے، گونگے اور بہرے۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ (۳۹/۳۱)

پھر تم قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے جھگڑو گے۔

اندھے، گونگے، بہرے، پھر جھگڑیں گے کیسے؟ جواب یہ ہے کہ اللہ کے سامنے مجرموں کو نجات کی کوئی حجت نظر نہ آئے گی۔

فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنْبَاءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَاءَلُونَ (۲۸/۶۶)

اس دن باتیں ان کو سوجھائی نہ دیں گی، سو وہ باہم گفتگو نہ کریں گے۔
اس وجہ سے اندھے، گونگے اور بہرے کی طرح چپ رہیں گے۔

لَا يَنْطِقُونَ ۝ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ (۷۷/۳۵،۳۶)

وہ نہ بولیں گے، ان کو معذرت کی اجازت ملے گی۔

مگر اپنے سرغنوں اور سرداروں سے کہیں گے تم نے ہم کو گمراہ کیا، یعنی اندھا، گونگا اور بہرا ہونا مجاز ہے اور جھگڑنا حقیقت۔

إِنَّ ذَٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ أَهْلِ النَّارِ (۳۸/۶۴)

جہنمیوں کا آپس میں لڑنا بالکل حقیقت ہے۔

(۴)

وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ (۲۰/۱۲۴)

اور اسے ہم قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے

فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ (۵۰/۲۲)

اور تیری نگاہ آج کے دن تیز ہے۔

یہاں بھی وہی صورت ہے یعنی کوئی حجت اس کو نظر نہ آئے گی، لیکن اعمال جو اس کو گھیرے ہوئے ہوں گے صاف صاف دکھائی دیں گے۔

(۵)

وَقِفُوهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُولُونَ (۳۷/۲۴)

اور ان کو روکو ان سے سوال کیا جائے گا۔

فَيَوْمَئِذٍ لَا يُسْأَلُ عَنْ ذَنْبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌّ (۵۵/۳۹)

اس دن کسی انس و جن سے اس کے گناہ کی بابت سوال نہیں کیا جائے گا۔

بظاہر تعارض کا وہم ہوتا ہے لیکن فرد اور جماعت کا فرق ہے، یعنی افراد کے گناہ نمایاں ہوں گے ان کے بارے میں سوال نہ ہوگا۔ لیکن اقوام و امم سے ان کو قائل کرنے کے لئے سوال ہوگا اور ان کے رسولوں سے بھی۔

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ (۷/۶)

ہم ضرور سوال کریں گے ان سے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور رسولوں سے بھی ضرور پوچھیں گے۔

(۶)

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (۵/۱۰۹)

اس دن اللہ رسولوں کو جمع کرکے ان سے پوچھیگا کہ تم کو کیا جواب ملا، وہ کہیں گے کہ ہم کو کچھ علم نہیں، تو ہی ہے جو غیب کی باتوں کو خوب جانتا ہے۔

وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰي رَبِّهِمْ (۱۱/۱۸)

اور گواہ کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا۔

رسولوںؑ کی طرف سے ایک جگہ لاعلمی کا اظہار، دوسری جگہ منکرین کے خلاف شہادت، یہ متعارض بیانات ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ رسولوںؑ کا یہ کہنا کہ ہم کو کوئی علم نہیں، ان کی زندگی کے بعد سے تعلق رکھتا ہے جس کا ثبوت علام الغیوب کے لفظ سے ملتا ہے۔ یعنی ہمارے بعد جو کچھ ہماری اُمتوں نے کیا، اس کا ہم کو کچھ علم نہیں کیونکہ ہم غیب دان نہیں ہیں۔ غیب کی باتوں کو تو ہی خوب جانتا ہے۔ باقی ان کی موجودگی میں جو کچھ ہوا، اس کو وہ ضرور جانتے ہیں اور اس سے لاعلمی ظاہر نہیں کرسکتے۔ دراصل رسولوں کا یہ جواب بالکل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جواب سے مطابقت رکھتا ہے۔ جو اسی کے چند آیات کے بعد ہے۔

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ (۵/۱۱۷)

میں ان کو دیکھتا رہا جب تک کہ ان میں موجود تھا، مگر جب تونے مجھے وفات دی تو خود ان کا نگراں تھا۔

اب تعارض کا وہم جاتا رہا کیونکہ رسولؑ شہادت دیں گے اس زمانہ کی بابت جس میں وہ موجود تھے اور لاعلمی ظاہر کریں گے اس زمانہ سے جس میں وہ موجود نہیں تھے۔

(۷)

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ o اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ o (۷۵/۲۲-۲۳)

اس دن کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (۶/۱۰۳)

نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں۔

دوسری آیت میں دنیا کا بیان ہے کہ یہاں اس کو کوئی دیکھ نہیں سکتا اور پہلی میں قیامت کا کہ وہاں مسلمان کو اپنے رب کا دیدار نصیب ہو گا۔ اس لئے تعارض نہیں ہے۔ مجرم بے شک وہاں محروم رہیں گے۔

اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (۸۳/۱۵)

وہ اپنے رب سے اس دن آڑ میں رکھے جائیں گے

اگر اس دن مومن اور کافر دونوں دیدار سے محروم رہے تو پھر کیا فرق رہا۔

(۸)

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (۴/۳)

اگر تم کو ڈر ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی پر قناعت کرو۔

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ (۴/۱۲۹)

اور تم ہرگز بیویوں میں عدل نہ کر سکو گے، اگرچہ حرص بھی کرو لہٰذا بالکل جھک نہ جاؤ

وہم تعارض کی صورت یہ ہے کہ پہلی آیت سے عدل کا امکان معلوم ہوتا ہے اور دوسری آیت اس کو ناممکن بتاتی ہے لیکن غور کرنے سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ پہلی آیت میں حقوق کا معاملہ ہے، جن کی ادائیگی میں عدل ممکن ہے اور دوسری آیت کا تعلق قلبی محبت سے ہے جس میں انسان بے بس ہے۔ اس کی شہادت "جھکاؤ" کے لفظ سے ملتی ہے۔ جس سے میلانِ طبع مراد ہے، جو اعمالِ قلب میں سے ہے۔

(۹)

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ (۸/۲۸)

اللہ بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دیتا۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا (۱۷/۱۶)

اور جب ہم کسی بستی کو تباہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش حالوں کو حکم دیتے ہیں وہ اس میں فسق پھیلاتے ہیں۔

پہلی آیت میں امر سے مراد امر تشریعی ہے اور دوسری میں امر تکوینی، اس لئے تعارض نہیں پیدا ہوتا

(۱۰)

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ ۝ (۳۲/۵)

وہ آسمان سے زمین تک امر کی تدبیر کرتا ہے پھر وہ (امر) اس کی طرف ایک دن میں چڑھتا ہے جس کی مقدار تمہارے شمار سے ہزار سال ہے۔

تَعْرُجُ الْمَلٰئِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ۔ (۷۰/۴)

ملائکہ اور روح چڑھیں گے اس کی طرف ایک دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی۔

دن کی مقدار ایک جگہ ہزار سال ہے ایک جگہ پچاس ہزار سال، مگر ان میں تعارض یوں نہیں ہے کہ یہ دو دن دو مختلف زمانوں کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ قرآن سے جہاں تک سمجھ میں آسکا ہے۔ عروج امر سے امر کا خاتمہ مراد ہوتا ہے۔ مہمات اور امر تدبیری کے ادوار ایک ہزار سال میں ختم ہو جاتے ہیں اور پچاس ہزار سال اس کل مدت کی مقدار ہے جس میں اس دنیا کے تمام تدبیری اوامر کا خاتمہ ہو جائے گا یعنی قیامت آجائے گی۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ اس پچاس ہزار سال والے دن کے متعلق ہے۔

يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْمُهْلِ ۝ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۝ (۷۰/۸-۹)

اس دن آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگا اور پہاڑ اون کی طرح۔

(۱۱)

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيعٍ (۸۸/۶)

ان کو کوئی خوراک نہ ملے گی سوائے کنٹیلی جھاڑی کے۔

وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ
اور ان کا کوئی کھانا نہ ہو گا سوائے جہنمیوں کے دھوون کے۔

لیکن ضریع ہو یا غسلین، غساق ہو (۳۸/۵۷ - ۷۸/۲۵) یا زقوم (۳۷/۶۵)، یہ جہنمیوں کے مختلف طبقات کی مختلف خوراکوں کے نام ہیں جن میں تعارض کا خیال ہی غلط ہے۔

(۱۲)

اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (۴۰/۴۶)
داخل کرو آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں
فَاِنِّیْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (۵/۱۱۵)
میں اس کو وہ عذاب دوں گا جو دنیا والوں میں سے کسی کو نہ دوں گا۔

ان میں بھی تعارض نہیں ہے، پہلی آیت میں عذاب کی کیفیت بیان کی گئی ہے اور دوسری میں نوعیت

(۱۳)

وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ط (۱۳/۲۸)
اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں۔
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (۸/۲)
مومن تو بس وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر ہو تو ان کے دل ڈر جائیں۔

ایک جگہ ذکر الٰہی سے اطمینان اور دوسری جگہ خوف بظاہر متعارض ہیں، لیکن یہ سبب اور نتیجہ ہیں جو حقیقتاً ایک دوسرے پر مترتب ہیں۔

تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ط (۳۹/۲۳)
اس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ان کی کھالوں کے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں پھر نرم پڑ جاتی ہیں اُن کی کھالیں اور اُن کے دل، اللہ کے ذکر سے۔

ذکر سے خشیۂ الٰہی اور اس سے اطمینان اور سکون قلب پیدا ہوتا ہے اور یہ ایک دوسرے سے

غیر منفک ہیں۔

(۱۴)

فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ (۷/۱۰۷ - ۲۶/۳۲)

ایک دم وہ نمایاں اژدہا ہو گیا

تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ (۲۷/۱۰ - ۲۸/۳۱)

پھنپھناتا ہوا جیسے سانپ

حضرت موسیٰ کا عصا اژدہا بن گیا جو موٹا اور سست ہوتا ہے اور سانپ بن گیا جو پتلا اور تیز ہوتا ہے۔ کیا ان میں تعارض نہیں ہے؟ نہیں، کیوں کہ اس کی جسامت اژدہے کی تھی کہ وہ چرواہے کا بڑا لٹھ تھا جس سے وہ اپنی بکریوں کے لئے اونچے اونچے پیڑوں کی پتیاں جھڑاتا اور ٹہنیاں توڑتا تھا مگر اس میں تیزی چھوٹے سانپوں کی سی تھی، اس نکتہ کو حرفِ تشبیہ "كَاَنَّهَا" ظاہر کر دیتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جسم کے لحاظ سے وہ اژدہا ہی تھا مگر صفت اس میں پتلے سانپوں کی تھی۔

(۱۵)

اَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (۴۷/۱۱)

کافر جو ہیں ان کا کوئی آقا نہیں

رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ط (۶/۶۲ - ۱۰/۳۰)

وہ اللہ کی طرف لوٹائے جائیں گے جو اُن کا حقیقی آقا ہے۔

ان میں تعارض یوں نہیں کہ اللہ حقیقتاً ان کا آقا ہے اور وہی ہر ایک کا آقا ہے لیکن کفر کی حمایت میں جب وہ لڑتے ہیں تو ان کی مدد نہیں کرتا ایک جگہ حقیقت مراد ہے، ایک جگہ مجاز۔

(۱۶)

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (۱۵/۴۲ - ۱۷/۶۵)

جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا تسلط نہ ہو گا۔

قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ (۲۸/۱۵)

موسیٰ نے کہا کہ یہ شیطانی عمل ہے۔

اللہ کے مخلص بندوں پر شیطان کا زور نہیں۔ پھر حضرت موسیٰؑ نے جب قبطی کو مار دیا تو کیسے کہا کہ یہ شیطان کا کام ہے۔ مانا کہ اس وقت وہ نبی نہ تھے لیکن مقبول بندہ ہونے میں کیا شک ہے۔ توجیہہ یہ ہے کہ شیطان کا تسلط نیک بندوں پر بندہ نہیں سکتا کھل جاتا ہے اور وہ استغفار سے پھر پاک ہو جاتے ہیں۔

(۱۷)

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ۝ (۱۸/۵۵)

اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آئی تو ان کو ایمان لانے اور اپنے رب سے استغفار کرنے سے کسی چیز نے نہیں روکا۔ بجز اس کے کہ ان کے اوپر اگلوں کا دستور آجائے یا رُو در رُو عذاب۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ (۱۷/۹۴)

اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آئی تو ان کو ایمان لانے سے کسی چیز نے نہیں روکا۔ بجز اس کے کہ انہوں نے کہا کہ کیا اللہ نے انسان کو رسول بنا کر بھیجا۔

دونوں آیتوں میں ایمان سے روکنے والی دو مختلف چیزیں حصر کے ساتھ بیان کی گئی ہیں اور حصر تو صرف ایک ہی پر ہونا چاہیئے۔ توجیہہ یہ ہے کہ پہلی آیت میں مانع حقیقی سبب ہے، یعنی مشیت الٰہی جس میں یہی تھا کہ ان کو دنیاوی یا اخروی عذاب ہوگا، جس کے باعث ایمان ان کو نصیب نہ ہوا۔ دوسری آیت میں مانع عادی ہے کہ وہ ایمان اس لئے نہیں لائے کہ انہوں نے انسان کے رسول ہونے کو بعید از قیاس خیال کیا اور یہ منکرین کی پرانی عادت ہے۔ یعنی ایک میں حصر مانع حقیقی کا ہے اور دوسری میں مانع مجازی کا۔ پھر تعارض کہاں رہا۔

(۱۸)

فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا (۷/۵۱)

آج ہم ان کو بھلا دیں گے جس طرح کہ وہ اپنے اس دن کی آمد کو بھلا بیٹھے تھے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا (۱۹/۶۴)

اور تیرا رب بھولنے والا نہیں

پہلی آیت میں رب کی طرف نسیان منسوب کرنے کے معنی ہیں نسیان کا بدلہ دینے کے، جیسے شاکر یا شکور، اللہ کے نام ہیں، جن کا مفہوم ہے شکر کرنے والوں کو جزا دینے والا اور دوسری آیت میں یہ حقیقت ہے کہ وہ نسیان سے بری ہے۔ لہٰذا دو مختلف معانی ہیں جن میں تعارض نہیں ہے۔

(۱۹)

قَالَ لِلْمَلَإِ حَوْلَهُ إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ (۲۶/۳۴)

فرعون نے اپنے سرداروں سے جو اس کے گرد تھے کہا کہ یہ بڑا واقف کار جادوگر ہے۔

قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ (۷/۱۰۹)

فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا کہ یہ بڑا واقف کار جادوگر ہے۔

ایک ہی بات ہے جو ایک جگہ فرعون کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ دوسری جگہ اس کے درباریوں کی طرف لیکن اس میں تعارض کیا ہے؟ پہلے بادشاہ نے یہ بات کہی پھر اس سے سن کر اس کے امراء نے اسی کو پھیلایا۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ مَا لَبِثُوا غَيْرَ سَاعَةٍ (۳۰/۵۵)

اور جس دن قیامت ہوگی مجرم قسم کھائیں گے کہ وہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔

يَتَخَافَتُونَ بَيْنَهُمْ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا عَشْرًا (۲۰/۱۰۳)

وہ آپس میں چپکے چپکے کہیں گے کہ تم نہیں رہے مگر دس دن۔

کیا ایک گھڑی اور دس دن میں تعارض نہیں ہے؟ اس کی توجیہ میں بڑے بڑے اماموں اور بزرگوں نے غوطے لگائے مگر اصلیت کا سراغ نہ پا سکے۔ قرآن میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی مگر اس پر رعایات کے جواب و دلائل دیئے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دو لفظ دو مختلف زمانوں کے لئے استعمال کئے گئے ہیں، اس لئے تعارض کا وہم باطل ہے۔

۱۔ لبث فی الارض۔ اس سے دنیاوی زندگی کی مدت مراد ہے جس کی بابت دس دن یا ان میں

سے جو زیادہ ہوش مند ہو گا ایک دن کا اندازہ کرے گا۔

اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا (۲۰/۱۰۴)

جب کہے گا وہ جوان میں زیادہ روبراہ ہو گا کہ تم نہیں رہے، مگر ایک دن۔

سورۂ مومن میں اسی قدر یا اس سے بھی کچھ کم اندازہ کرنے والوں کا ذکر ہے۔

قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ (۲۳/۱۱۲)

اللہ پوچھے گا کہ تم زمین میں کتنے سال رہے وہ کہیں گے کہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ

۲۔ لبث فی کتاب اللہ۔ اس سے برزخ کی مدت مراد ہے۔ چنانچہ آیت اول کے بعد ہے

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ۔

اور وہ لوگ جن کو علم اور ایمان دیا گیا ہے کہیں گے کہ تم اللہ کے نوشتہ میں قیامت تک رہے ہو (۳۰/۵۶)

یہ قیامت کا دن ہے۔

سورۂ طٰہ میں ہے۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۝ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتَابٍ (۲۰/۵۱-۵۲)

فرعون نے کہا کہ اگلی نسلوں کا کیا ہوا۔ موسیٰؑ نے کہا کہ ان کا علم میرے رب کے پاس کتاب میں ہے۔

آخری پارہ میں ہے۔

اِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ كِتَابٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ (۸۳/۷-۹)

بدکردار سجین میں لکھے ہوئے ہیں اور تجھے کیا خبر کہ سجین کیا ہے، ایک لکھی ہوئی کتاب

اِنَّ كِتَابَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۝ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۝ كِتَابٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ (۸۳/۱۸-۲۰)

نیکوکار علیین میں لکھے ہوئے ہیں اور تجھے کیا خبر علیین کیا ہے۔ ایک لکھی ہوئی کتاب۔

یہ لبث فی کتاب اللہ یعنی عالم برزخ مرنے والوں کے لئے غیر زمانی ہے، ان کے اوپر کوئی زمانہ

نہیں گزرتا ہے۔ جس وقت مرے ہیں قیامت کے دن سمجھیں گے کہ اسی وقت اٹھے ہیں اور گھبرا کر کہیں گے۔

يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا

ہماری شامت! کس نے ہم کو ہماری خواب گاہ سے اٹھا دیا۔

گویا وہ اپنے آپ کو ابھی تک اپنی خواب گاہ میں جہاں مرض الموت میں تھے، خیال کریں گے۔ تبدیلیٔ حالت سے ان کا اندازہ صرف ایک گھڑی کا ہوگا، وہ بھی شبہ کے ساتھ۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ

اور جس دن اللہ اُن کو اٹھائے گا (وہ سمجھیں گے) کہ گویا وہ نہیں رہے مگر دن کی ایک گھڑی

جس دن ان دھمکیوں کو وہ دیکھیں گے (سمجھیں گے) کہ گویا وہ نہیں رہے مگر دن کی ایک گھڑی

اس مسئلہ کی پوری توضیح میں اپنے مقالہ "عالم برزخ" میں لکھ چکا ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وقف کی دینی حیثیت

از رسالہ جامعہ دسمبر ۱۹۴۵ء

دولت مند مسلمانوں نے جو اوقاف مختلف اغراض مثلاً مدرسوں، مسجدوں، خانقاہوں یا امام باڑوں وغیرہ کے لئے کئے ہیں، ان کی دینی حیثیت کیا ہے؟ یہ سوال کئی مخلص اصحاب نے مجھ سے کیا، اس لئے میں نے اس مسئلہ کی تحقیق اور چھان بین کی۔ میں نے دیکھا کہ عام طور پر ائمہ حدیث و فقہ کے نزدیک وقف کی شرعی حیثیت مسلّم چلی آرہی ہے۔ ان کے بیانات سے وقف کی جو حقیقت میں سمجھ سکا، وہ مختصر لفظوں میں یہ ہے۔

۱. کسی مال یا جائیداد کو مالک اپنی ملکیت سے نکال کر ایک خاص غرض کے لئے روک دے کہ اس کی آمدنی یا پیداوار اسی مخصوص غرض میں صرف کی جائے۔
۲. بہت سے فقہا نے تصریح کی ہے کہ اس میں ابد تک کی شرط لگانی ضروری ہے، یعنی وقف ہمیشہ کے لئے ہونا چاہیئے ورنہ صحیح نہ ہوگا۔
۳. وقف کرنے والے کا فرض ہے کہ وہ کسی کو اس کا متولی بنادے اور اس سلسلۂ ولایت کا ہمیشہ کے لئے سامان کر جائے۔
۴. موقوفہ مال کی آمدنی یا موقوفہ جائیداد کی پیداوار ابدالآباد تک واقف کی معینہ غرض کے سوا بشرطیکہ وہ دین کے خلاف ثابت نہ ہو، کسی دوسرے کام میں صرف نہ ہو سکے گی۔
۵. اَلْوَقْفُ لَا یُمْلَکُ وَلَا یُبَاعُ وَلَا یُوْھَبُ وَلَا یُوْرَثُ۔ یعنی وقف نہ کسی کی ملکیت ہوتا ہے نہ بیچا جاتا ہے، نہ ہبہ کیا جاتا ہے، نہ اس میں وراثت جاری ہوتی ہے۔

یہ وقف میرے نزدیک قرآن اور عقل دونوں کے خلاف ہے۔

قرآن کے خلاف اس وجہ سے ہے کہ اس میں جتنی صورتیں مال کے انتقال یعنی ایک کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے ہاتھ میں جانے کی بیان کی گئی ہیں، مثلاً خرید و فروخت، وصیت و وراثت؛

ہبہ، صدقہ، زکوٰۃ و خیرات، چندہ و قرض وغیرہ اُن میں کہیں اشارۃً یا کنایۃً بھی ایسے وقف کا ذکر نہیں ہے جو کسی کی ملکیت میں نہ آئے۔

بعض فقہاء نے اس کو وصیت میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ وصیت اور وقف میں دو نمایاں فرق ہیں۔

۱۔ وقف میں فقہاء کے بیان کے مطابق وقف کرتے ہی مال واقف کی ملکیت سے خارج ہو جاتا ہے، بخلاف وصیت کے کہ اس میں موصی کے مر جانے کے بعد وصیت کا مال دوسرے کے ہاتھ میں جاتا ہے۔

۲۔ وقف میں مال واقف کی ملکیت سے نکل کر کسی کی ملک نہیں ہوتا، بخلاف اس کے وصیت میں موصی کے مرنے کے بعد موصیٰ لہٗ اس کا مالک ہو جاتا ہے۔ اور اپنی خواہش کے مطابق اس کو صرف کرتا ہے۔

ایسی کوئی وصیت قرآن سے ثابت نہیں کی جا سکتی جس پر موصی کے مرنے کے بعد کسی کی ملکیت قائم نہ ہو۔ اور وقف، عقل کے خلاف حسب ذیل وجوہ سے ہے۔

۱۔ مال و جائیداد فطرۃً مملوک ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی کی ملکیت میں نہ ہوں۔

یہی دشواری تھی جس کی وجہ سے بعض فقہاء کو یہ کہنا پڑا کہ مال موقوفہ کا مالک اللہ ہوتا ہے۔ اگر صورت یہ ہے تو اس پر تصرف بھی اللہ ہی کا ہوگا اور امام وقت جو حکومت الٰہی کا نائب ہوتا ہے۔ اپنی صوابدید کے مطابق اس کو صرف کرے گا نہ کہ مردہ کی خواہش کے مطابق۔

۲۔ وقف کرنے میں مال جب واقف کی ملکیت سے نکل گیا تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اب اس پر اس کا تصرف نہیں رہا۔ یہ بیک وقت اجتماع نقیضین ہے کہ وہ مال کا مالک بھی نہیں ہے، مگر وہ خرچ ہو رہا ہے اس کی خواہش اور ارادہ کے مطابق۔

۳۔ مال یا جائیداد سے جو آمدنی یا پیداوار ہوتی ہے وہ زندوں کی محنت سے ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے اوپر زندوں ہی کو متصرف بھی ہونا چاہئے۔ مردہ کی خواہش کا اس کے اوپر مسلط رہنا کسی صورت سے جائز نہیں قرار پا سکتا۔ کیونکہ اس سے اکثر حالات میں نقصان ہوتا ہے۔ وقف کرنے والے کو کیا خبر کہ کل زمانہ کی ضروریات کا تقاضا کیا ہوگا؟ یہ تو زندہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔

چنانچہ ایک مضحکہ خیز معاملہ خود میرے شہر میں درپیش ہے۔ وہاں ایک وقف تعزیہ اور امام باڑہ کے اخراجات کے لئے ہے جو لوگ اس کے متولی ہیں وہ اہل سنت ہیں اور اب اہل حدیث ہو گئے ہیں جو ان امور کو شرک سمجھتے ہیں۔ مگر واقف کے شرائط کے مطابق ان کو یہ سب مشرکانہ رسوم ادا کرنے پڑتے ہیں۔ وہ ہر چند چاہتے ہیں کہ ہم اس امام باڑہ کو مدرسہ بنالیں اور وقف کی آمدنی کو تعلیم پر صرف کریں لیکن نہیں کر سکتے۔ اگر مقدمہ بھی دائر کریں کہ یہ امور شریعت کے خلاف ہیں لہٰذا فقہاء کے فتوؤں کے مطابق ہم کو اجازت دی جائے کہ ہم اس آمدنی کو دوسری جائز مد میں صرف کریں، تو واقف کی ذریت جو شیعہ ہے، اس کو عین مذہب کے مطابق ثابت کر دے گی۔

علاوہ بریں یہ سلسلۂ وقف اگر جائز قرار دیا جائے اور اسی طرح جاری رہے تو نہ معلوم دولتمند کس قدر جائیدادیں وقف کر ڈالیں گے جن سے آئندہ نسلوں پر دنیا تنگ ہو جائے گی۔ آج بھی اگر اسلامی ممالک میں اوقاف کا شمار کیا جائے تو ان کی آمدنی سالانہ کروڑوں روپوں تک پہنچتی ہے۔ جس کا بڑا حصہ بے کار مصارف میں ضائع ہو جاتا ہے۔ بعض سادہ دل بزرگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اوقاف ملت کا سرمایہ ہیں جن سے بڑے بڑے قومی کام چل سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ملت کا سرمایہ نہیں بلکہ مردوں کا سرمایہ ہیں جو اُن کے مخصوص اغراض سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے کچھ تو مفید لیکن زیادہ تر غیر مفید کاموں میں صرف ہو رہے ہیں۔

۴۔ وقف کر دینے سے مال جب واقف کی ملکیت سے خارج ہو گیا تو اس کو اس پر تولیت کا حق کہاں رہا؟ اگر اس نے اس وقت کسی کو متولی بنایا تھا، جب وہ اس کا مالک تھا تو اس کی ملکیت ختم ہوتے ہی متولی کی ولایت بھی ختم ہو گئی، کیونکہ حق تولیت کی بنیاد حق ملکیت پر تھی جب یہ نہیں رہا تو وہ بھی نہیں رہا۔

الغرض عقلاً وقف میں اس قدر قباحتیں ہیں کہ وہ جائز ہی نہیں سکتا۔

میرا خیال ہے کہ اس وقت جبکہ اسلامی خلافت استبدادی حکومت بن گئی اور مسلمانوں میں سرمایہ داری آ گئی، دولت مندوں نے جہاں مال سے دنیاوی آسائشیں حاصل کیں، وہاں یہ بھی چاہا کہ اسی سے ایک مستقل جائیداد آخرت کے لئے بھی بنالیں۔ جس کا ثواب ابد تک ملتا رہے، اس لئے وقف کا طریقہ اختیار کیا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جن کی نگاہ قانونی امور میں بہت باریک بین تھی وقف کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ امام ابو یوسفؒ بھی ان کے شاگرد اور بغداد کے قاضی القضاۃ تھے۔ اس مسئلہ میں اپنے استاذ کے تابع تھے۔ مگر بعد میں ان کی رائے بدل گئی۔ امام سرخسیؒ لکھتے ہیں۔

وَكَانَ أَبُو يُوسُفَ يَقُولُ أَوَّلًا بِقَوْلِ أَبِي حَنِيفَةَ وَلٰكِنَّهُ لَمَّا حَجَّ مَعَ الرَّشِيدِ فَرَأَى وُقُوفَ الصَّحَابَةِ بِالْمَدِينَةِ وَنَوَاحِيهَا رَجَعَ فَأَفْتَى بِلُزُومِ الْوَقْفِ (کتاب المبسوط ۲ / ۲۸)

امام ابو یوسف پہلے ابو حنیفہ کے قول پر تھے لیکن جب انہوں نے ہارون الرشید کے ساتھ حج کیا اور مدینہ اور اس کے اطراف میں صحابہ کرام کے اوقاف دیکھے تو ان کے قول سے رجوع کر لیا اور وقف کے جواز کے فتوے دینے لگے۔

امام سرخسی کے بیان کے مطابق امام ابو حنیفہ کے نزدیک "وقف" یا "حبس" کا مفہوم صرف یہ تھا کہ وقف کرنے والا مال کو اپنی ملکیت میں روک لیں اور اس کے منافع کو صدقہ کر دے۔ یقیناً اس صورت کے جواز میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس کی مثال عاریت کی ہے جو دینے والے کی ملکیت میں رہتی ہے مگر نفع اٹھانے کا حق وہ دوسرے کو دے دیتا ہے، لیکن اس صورت میں ظاہر ہے کہ واقف کے مرنے کے بعد مال موقوفہ ورثہ میں تقسیم ہوگا، کیونکہ وہ مورث کی ملکیت میں ہے۔

وقف کے جواز پر فقہا کا استدلال قرآن سے مطلق نہیں ہے بلکہ صرف اس صورت سے ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر میں ایک اچھا نخلستان ملا تھا۔ جس کا نام ثمغ تھا۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں اس کو صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔ جس طرح حکم ہو عمل کروں۔ سرور عالم نے فرمایا۔

ان شئت حبست اصلها وتصدقت بها

اگر تمہاری خواہش ہے تو اصل مال کو روک لو اور اس کو صدقہ کر دو۔

ائمہ ستہ حدیث کے متفق علیہ الفاظ روایت کے یہی ہیں۔ ان سے واضح طور پر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حضور کا فرمان یہ تھا کہ نخلستان کو اپنی ہی ملکیت میں روکے رکھو اور اس کے پھل کو صدقہ کر دو، کیونکہ اس وقت "حبس" یا "وقف" کا لفظ ان اصطلاحی معنوں میں نہیں بولا جاتا تھا، جن میں بعد کے فقہاء ان کو استعمال کرنے لگے۔ غالباً امام ابو حنیفہ کا یہ خیال کہ مال موقوفہ واقف ہی کی ملکیت میں رہتا ہے اسی روایت کی بناء پر تھا۔

بعد میں اس روایت پر اضافے ہوئے اور اس کے الفاظ میں تبدیلیاں کی گئیں، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ اس وقف کا ثبوت بنالی گئی جو فقہاء نے تجویز کیا تھا، حالانکہ ایسی روایتیں بھی ہیں جو وقف کے خلاف ہیں۔

امام طحاویؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ سورہ نساء میں فرائض میراث نازل ہو جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حبس کی ممانعت فرمادی جو میں نے خود سنی۔

ابن ابی شیبہؒ نے اپنی کتاب مصنف میں حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ وراثت سے کوئی چیز روکی نہیں جا سکتی، بجز اسلحہ اور سواری کے یعنی جنگ کے ہتھیار یا سواریاں جو جہاد کے لئے دی جائیں، ان کے سوا اور کوئی شے کا کسی مخصوص غرض کے لئے روکنا جائز نہیں ہے، وہ ورثہ میں تقسیم ہوگی۔[1]

حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا کوئی جواب نہیں دیا گیا ہے، لیکن حضرت علیؓ کے قول کے متعلق بعض فقیہوں نے کہا ہے کہ وہ حجت نہیں ہے، اس لئے کہ ان کا عمل اس کے خلاف تھا کیونکہ مصر میں انہوں نے اپنا ایک گھر اپنی اولاد کے لئے خود وقف کیا تھا۔ مگر مصر میں حضرت علیؓ کب گئے؟ یا وہاں کون سا مکان بنایا یا خرید کیا؟ اور وہ کون سی ان کی اولاد وہاں تھی، جس کے لئے وقف کیا؟ ان میں سے کسی بات کا بھی جواب تاریخ سے نہیں ملتا۔

---

[1] اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت علیؓ ان ہتھیاروں اور سواریوں کو جو خود جہاد کے لئے دے دی جائیں ہبہ قرار دیتے تھے نہ کہ وقف۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ملکِ یمین

مولانا تمنا صاحب پھلواری عمادی کا مضمون مارچ ۱۹۴۳ء کے البیان میں دیکھنے میں آیا، انھوں نے ملکِ یمین کی ایک طویل و عریض فقہ مرتب کر ڈالی ہے۔ ان کے پیش نظر یہ امر تو ہوگا کہ جب اسلام میں جہاد ہے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ صرف کفار ہی مسلمانوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوں۔ بلکہ مسلمان مرد و زن بھی غنیم کے ہاتھوں میں پڑ سکتے ہیں تو کیا وہ بھی اپنے یہاں ملکِ یمین کی ایسی ہی لمبی چوڑی فقہ مرتب نہیں کریں گے؟ میرے خیال میں نہیں۔ کیونکہ وہ معاملہ فہم ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ حکومت کے قیدی ہیں ملکیت نہیں ہیں، اس لئے وہ اپنی قوم کے کسی فرد کی غلامی میں ان کو نہیں دیں گے، نہ سپاہیوں میں تقسیم کریں گے، نہ کسی کو ان کی کمائی کھانے یا ان کو جانوروں کی طرح بیچنے کا حق دیں گے۔ اور نہ گرفتار شدہ عورتوں کو کسی کی منکوحہ، وہ بھی بلا مہر بننے کی، نہ کسی کو منکوحہ بنانے کی اجازت دیں گے۔ یہ سب کچھ اس لئے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی قوم کے جو افراد مسلمانوں کے ہاتھوں میں اسیر ہیں، ان کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جاتے اور ان کی عزت نہ لٹائی جائے نہ وہ غلام بنائے جائیں۔ بلکہ شاہی قیدی بنا کر رکھے جائیں۔

مولانا تمنا صاحب اٹھے ہیں قرآن کی تقدیس و تطہیر اور اس کے ماتھے سے غلامی کی اباحت کا داغ مٹانے کے لئے وہ ان علماء و فقہاء کو دشمن قرآن قرار دینے میں ذرا بھی نہیں جھجکتے جنہوں نے بقول ان کے عہدِ عباسی میں دینِ اسلام کو مسخ کر کے رکھ دیا مگر خود کیا فرماتے ہیں:۔

(۱) اسلامی حکومت اسیرانِ جنگ کو ان کے فدیوں کے انعام کے طور پر فوج میں تقسیم کرے گی۔

(۲) وہ سپاہی ان سے کام کرائیں گے اور ان کی کمائی کا کچھ حصہ کھائیں گے۔

(۳) چونکہ ان کا فدیہ ان کو انعام میں ملا ہے اس لئے وہ ان کو فروخت کر دینے کا حق رکھتے ہیں۔

(۴) اگر وہ عورتیں ہیں تو بلا مہر اُن سے نکاح کر سکتے ہیں۔

(۵) اس کے لئے تعداد کی بھی کوئی حد نہیں، ایک ہو یا ایک درجن۔

حقیقت یہ ہے کہ دورِ جاہلیت میں غلامی کا صرف ایک ہی راستہ تھا، یعنی اسیرانِ جنگ، جو لوگ لڑائیوں میں پکڑے جاتے تھے وہ لونڈی غلام بنا لئے جاتے تھے۔ قرآن نے ان اسیروں کے متعلق یہ حکم دے کر "فاما منا بعد واما فداء" گرفتار کرنے کے بعد یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دو، یا فدیہ لے کر، غلامی کا راستہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ ان اسیرانِ جنگ کو ملی مصلحت یا جنگی ضرورت سے امام وقت جب تک مناسب سمجھے، قید یا نظر بند رکھ سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس ان کے رکھنے کے وسائل نہ ہوں تو ملت کے ایسے افراد کی حفاظت میں بھی ان کو نظر بند کر سکتا ہے جو اسی طرح ان کو رکھ سکیں، جس طرح حکومت چاہتی ہے لیکن وہ ہر وقت امام ہی کے اختیار میں رہیں گے۔ نہ کسی کو ان پر ملکیت کا حق ہے، نہ ان کو غلام بنانے کا۔ نہ اسیر عورتوں سے بلا مہر نکاح کرنے کا۔ اور آخر میں ان کو چھوڑنا ہی پڑے گا، فدیہ لے کر یا احسان رکھ کر۔ ان کے علاوہ قرآن میں اسیرانِ جنگ کے بارے میں کہیں کوئی دوسرا حکم نہیں ہے۔

ملک یمین کے متعلق جو احکام قرآن میں ہیں وہ ان غلاموں اور لونڈیوں کے بارے میں ہیں جو پہلے سے مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھے۔ اسی لئے جہاں بھی ان کا ذکر ہے بصیغہ ماضی یعنی ملکت ہے نہ کہ بصیغہ مضارع۔ کیوں کہ ان کی آمد کا راستہ ہی آئندہ کے لئے بند کر دیا گیا ہے۔ یہ ملک یمین عربوں کی معاشی زندگی میں اس قدر دخیل تھے کہ اگر قرآن ایک دم ان کو آزادی کا پروانہ دے دیتا تو نہ صرف آقاؤں بلکہ اکثر حالتوں میں ان غلاموں کو بھی مصیبت کا سامنا ہوتا اور قوم کی اقتصادی حالت میں ابتری پیدا ہو جاتی۔ اس لئے قرآن نے جس کا طریقہ تدریجی اصلاح ہے، رفتہ رفتہ ان کی آزادی کا سامان کیا۔ قتل خطا، نقضِ یمین، ظہار وغیرہ کا کفارہ یہی رکھا کہ غلام آزاد کرو، نیز فکِّ رقبہ کی فضیلت جتا کر عام نعمتوں کے شکریہ اور گناہوں سے استغفار میں اس کی رغبت دلائی اور مکاتب کرنے کا بھی حکم دیا۔ تاکہ جلد از جلد انسانی غلامی کی لعنت ملتِ اسلام سے نکل جائے۔ لیکن غلطی یا غلط فہمی سے ہمارے خلفاء وامراء، علماء و فقہاء نے اس کو جاری رکھا یہاں تک کہ آج جب کہ دنیا کے سارے کفرستانوں میں غلامی ناجائز قرار پا چکی ہے، ملتِ اسلام کے مرکز مکۂ مکرمہ میں بردہ فروشی کی دکان موجود ہے۔

مولانا تمنا صاحب نے شروع ہی میں بنیاد غلط رکھی، یعنی "فاما منا بعد واما فداء" جیسی واضح آیت کی تاویل میں اپنے مفروضات پر چل پڑے۔ جس سے ثریا تک ان کی دیوار کج رہی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جغرافیہ اور مسلمان

(نوشتہ ۱۹۲۰ء)

فنِ جغرافیہ کی بنیاد اصل میں تجارت اور فتح کی ضرورت سے پڑی۔

دُنیا کے سب سے پہلے تاجر اہلِ فینیشیا تھے۔ ان کی تجارت ایشیا، افریقہ اور نیز یورپ کے ساتھ تھی، ان کے ملک کے دو مشہور بازار صور اور صیدا اُس وقت تجارتِ عالم کا مرکز تھے۔ اس لئے انہوں نے تجارتی ضرورت سے اکثر ملکوں کے سفر کئے۔ بحیرۂ روم کے سواحل تک پہنچ کر اپنی آبادیاں قائم کیں اور جن ملکوں سے تعلقات تھے، ان کے شہروں اور ان کے باہمی فاصلوں اور راستوں کے حالات سے واقفیت بہم پہنچائی۔

پھر جب سکندر یونانی نے اپنے فتوحات کے دائرہ کو یورپ سے لے کر افریقہ اور ایشیا تک وسیع کیا تو یونانیوں نے ملکوں اور شہروں وغیرہ کے حالات قلمبند کرنا شروع کئے۔ لیکن یہ پراگندہ صیغے تھے ارا طستن یونانی نے جس کی وفات ۱۹۶ء ق م میں ہوئی، ان معلومات کو جمع کر کے بحیثیت ایک فن کے مدون کیا۔ اس کے بعد یونانیوں کے متعدد سیاحوں اور اہلِ علم نے اس فن میں کتابیں لکھیں۔ منجملہ ان کے بطلیموس کی کتاب مجسطی ہے جس کے چوتھے حصے میں روئے زمین کا جغرافیہ بیان ہے۔

بنی عباس کے زمانہ میں جو یونانی کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں، ان میں مجسطی بھی تھی۔ پہلے یحییٰ بن خالد برمکی وزیر نے کسی شامی سے اس کا ترجمہ عربی میں کرایا تھا وہ غلط نکلا اس لئے دوبارہ ثابت بن قرہ نے صحیح ترجمہ کیا۔

لیکن مسلمان اس کتاب کے ترجمہ ہونے سے پہلے ہی جغرافیہ کی ابتدا کر چکے تھے۔ کیونکہ وہ ملکوں ملکوں طلبِ علم کے لئے سفر کرتے تھے۔ علاوہ بریں تمام دنیائے اسلام سے فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے ان کو بیت اللہ کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے نہ صرف تجارت اور فتح کی غرض سے بلکہ علمی اور مذہبی ضرورت سے بھی جغرافیہ دانی ان کے لئے لازمی تھی۔

چنانچہ سب سے پہلے مقامات، راستے اور فاصلے وغیرہ کی تفصیل میں جو کتابیں اسلام میں لکھی گئیں

وہ ان علماء کی تھیں جن کے کجاوے طلب علم میں ہر وقت کسے رہتے تھے۔ مثلاً اصمعی اور سکونی وغیرہ۔

مجسطی کے ترجمہ سے یہ فائدہ البتہ ہوا کہ مسلمانوں نے بھی جغرافیہ کو بحیثیت فن کے اختیار کیا اور اس میں کتابیں لکھنے لگے۔

ذیل میں اختصار کے ساتھ ہم مسلمان مصنفین اور ان کی کتابوں کا حال بیان کرتے ہیں۔

خوارزمی ابو موسیٰ خوارزمی مامون اور واثق باللہ کے عہد میں تھے۔ انہوں نے بطلیموس کی کتاب کے طرز پر ایک نئی کتاب "صورۃ الارض" لکھی۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے اس کتاب کا صرف ایک نسخہ دنیا میں موجود ہے جو پہلے مصر میں کسی کے پاس تھا۔ لیکن ایک جرمن اس کو خرید کر لے گیا اور اب وہ جرمنی میں ہے۔

ابن خرداذبہ امام ابوالقاسم عبداللہ محمد بن خرداذبہ کا دادا مجوسی تھا۔ برامکہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔ انہیں کی تربیت سے امام موصوف کوہستانی برید (ڈاک) کے محکمہ کے منتظم ہو گئے۔ اس سلسلہ میں چونکہ ان کو اکثر مقامات کا سفر کرنا پڑتا تھا اس لئے شہروں، آبادیوں اور راستوں کے حالات سے بہت واقفیت ہو گئی چنانچہ "کتاب المسالک والممالک" ۲۳۰ھ کے بعد انہوں نے تصنیف کی۔ یہ کتاب مشہور ہے اور لیڈن میں ۱۳۰۶ھ میں مع ترجمہ کے طبع ہو چکی ہے (ل۔ م[1])

ابن فقیہ ابوبکر احمد بن محمد الہمدانی معروف بہ ابن فقیہ۔ انہوں نے بھی تقریباً ۲۹۰ھ میں "کتاب البلدان" لکھی۔ لیکن غالباً یہ کتاب مفقود ہو گئی۔ علی ابن جعفر شیرازی نے اس کا ایک اختصار لکھ لیا تھا وہ ۱۳۰۲ھ میں لیڈن میں طبع ہوا ہے۔ (ل م)

ابن رستہ ابو علی احمد بن عمر بن رستہ نے تیسری صدی ہجری کے آخر میں متعدد علوم میں ایک مبسوط کتاب لکھی جس کی سات جلدیں ہیں۔ آخری جلد جغرافیہ میں ہے۔ اس کا نام اعلاق النفیسہ ہے۔ (لیڈن میں ۱۸۹۱ء میں طبع ہوئی۔ (ل م)

ابن فضلان علی ابن فضلان کو مقتدر باللہ نے ۳۰۹ھ میں بلغاریہ میں سفیر بنا کر بھیجا تھا وہاں سے واپس آکر انہوں نے ایک کتاب "احوال الامم الشمالیہ" لکھی۔

---

[1] ل۔م سے مراد یہ ہے کہ یہ کتاب لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے

ابن جعفر

قدامہ بن جعفر مصنف "کتاب الخراج" اس میں عرب اور اس کے سرحدی ممالک کے جغرافیہ کا بھی بیان ہے۔

الجیہانی

انہوں نے بھی ابن جعفر کی طرح کتاب الخراج لکھی۔ لیکن اب یہ کتاب غالباً ناپید ہے۔

ابودلف

مشعر ابودلف مصنف کتاب "عجائب البلدان" اس میں اقصائے مشرق، چین، ہند اور جزائر ہند وغیرہ کے حالات ہیں۔

ابوزید

علامہ ابوزید بلخی، جغرافیہ میں خاص طور پر مشہور ہوئے۔ انہوں نے کتاب "صور الاقالیم" تصنیف کی تھی۔ مصنفین اسلام اس کتاب کی خوبی کے بہت معترف ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ باوجود تلاش اب تک اس کا پتہ کہیں نہیں لگا۔ سنہ ۳۴۰ھ میں ابو اسحاق فارسی اصطخری نے اس کا خلاصہ کرکے اس کا نام "مسالک الممالک" رکھا تھا۔ وہ کولمبیا یونیورسٹی سے شائع ہوا ہے۔ (ل، م)

پھر ابن حوقل نے سنہ ۳۸۰ھ میں اس خلاصہ کو نئے طرح سے ترتیب دے کر کسی قدر کمی بیشی کرکے درست کیا۔ ابن حوقل کا مجموعہ بھی "کتاب المسالک والممالک" کے نام سے شائع ہوگیا ہے (ل، م)

التقاسیم

ابو عبداللہ شمس الدین محمد بن احمد بن ابی بکر المقدسی البشاری، ان کی تصنیف احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم ہے۔ اس میں صرف اسلامی ممالک کا جغرافیہ ہے جن میں مصنف نے کامل بیس برس تک سیاحی کی تھی۔ لیڈن سے ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی۔ (ل، م)

مسعودی

ابوالحسن علی بن حسین بن علی مسعودی نے جو بقول علامہ ابن خلدون تاریخ کے امام ہیں۔ سیاحت اور جغرافیہ میں بہت شہرت پائی۔ انہوں نے مغربی اور مشرقی ممالک کے سفر کئے اور متعدد کتابوں سے جو فن جغرافیہ میں لکھی گئی تھیں، مدد لے کر اپنی مشہور کتاب "مروج الذہب و معادن الجوہر" لکھی جو مع فرنچ ترجمہ کے نو جلدوں میں پیرس سے شائع کی گئی۔ (ل، م)

ان کی دوسری تصنیف تاریخ اور جغرافیہ میں "کتاب التنبیہ والاشراف" ہے۔ یہ لیڈن میں ۱۸۹۳ء میں چھپی۔ (ل، م)

مسعودی نے جغرافیہ کی جن کتابوں کے حوالے اپنی کتاب میں دیئے ہیں، ان میں سے اکثروں کا اب نشان نہیں ملتا۔ من جملہ ان کے حکیم کندی کی بھی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے۔ "رسم المعمور من الارض" اس نام سے

سمجھ میں آتا ہے کہ غالباً اس میں دنیا کا نقشہ ہوگا۔

جغرافیہ کا لفظ یونانی ہے اور یہ دو لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ جی جس کے معنی زمین کے ہیں اور گرافی یعنی صورت۔ اس لئے جغرافیہ کے اصلی معنی "نقشۂ زمین" کے ہیں چنانچہ مجسطی میں بطلیموس نے ہر ہر شہر کا نقشہ دے کر پھر اس کا حال لکھا ہے۔

متقدمین مسلمانوں کی تصنیف میں نقشہ کے لئے صورت، رسم اور مثال۔ تینوں الفاظ مستعمل ہوئے ہیں۔

متاخرین نے "خارطہ" کا لفظ استعمال کیا ہے جو غالباً یونانی لفظ "چارٹہ" سے معرب کیا گیا ہے۔ اب بعض بعض اہل قلم "خریطہ" بھی لکھتے ہیں۔

ممالک کے نقشے دراصل تاجروں اور ان سے زیادہ فرمانرواؤں کے لئے ضروری ہیں کیونکہ ان کے وسیلے سے ممالک کے فاصلوں اور حالتوں کا اندازہ لگا کر ان کے انتظام میں سہولت ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے بھی ابتداء ہی میں ممالک کے نقشوں کی طرف خاص توجہ رکھی۔ چنانچہ ابو زید بلخی کی کتاب تمام تر نقشوں پر مشتمل تھی۔ اسی طرح خوارزمی کی تصنیف "صورۃ الارض" بھی شہروں اور ملکوں کے نقشہ کا مجموعہ تھی۔

خلفائے اسلام کو نقشوں کی طرف جو توجہ تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مامون نے علماء عراق کی ایک بہت بڑی جماعت کو عالم کا نقشہ مرتب کرنے کا حکم دیا تھا۔ ان لوگوں نے نہایت محنت اور تحقیق کے ساتھ جہاں تک اس زمانہ کے علوم سے مدد مل سکتی تھی امداد لے کر ایک ایسا نقشہ تیار کیا کہ اس سے پہلے دنیا میں نہیں بنا تھا۔ اس میں آسمان، تارے، زمین، خشکی، تری اور پھر پہاڑوں دریاؤں، ملکوں، شہروں، قوموں اور ان کے مقاموں کو تفصیل سے دکھایا تھا۔

برلن کے کتب خانہ میں ایک قلمی نسخہ ہے جس میں اس قسم کے نقشے ہیں۔ بعض لوگ اس کو ابوزید بلخی کی کتاب قرار دیتے ہیں۔ لیکن سوائے قیاس کے کوئی ثبوت نہیں ہے۔

مسلمانوں میں نقشوں کے رواج کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ المقدسی نے لکھا ہے کہ میں نے چین اور بحر ہند کے نقشے کاغذات کے صفحات پر امیر خراساں کے کتب خانہ میں دیکھے۔ پھر لکھتا ہے کہ یہی نقشے کپڑے کے پارچوں پر نیشاپور میں میری نظر سے گزرے۔ بعد ازاں عضد الدولہ کے کتب خانہ میں بھی میں نے ان کو موجود پایا۔ یہ تینوں نقشے ایک ہی چیز کو ظاہر کرتے تھے لیکن باہم کسی قدر مختلف معلوم ہوتے تھے۔

البیرونی

ابوریحان بیرونی متوفی ۴۴۰ھ نے اپنی تصنیف "کتاب الہند" میں ہندوستان کے شہروں ان کے فاصلوں راستوں اور اس ملک کے باشندوں کے مفصل حالات لکھے ہیں یہ کتاب لندن میں ۱۸۸۷ء میں چھپی ہے۔ (ل۔م)

البکری

ابوعبید البکری وزیر متوفی ۴۸۷ھ مصنف کتاب "المسالک والممالک" یہ کتاب اب تک نہیں چھپی ہے لیکن وزیر موصوف کی دوسری کتاب "معجم ما استعجم" گوٹنگن سے ۱۸۷۶ء میں شائع ہو گئی ہے۔ (ل۔م) اس میں ان شہروں اور مقاموں کے نام اور حال لکھے گئے ہیں جو اس زمانہ تک عربی شعراء کے اشعار میں واقع ہوئے تھے۔

اس سے پہلے اسی عنوان پر ابوعبید سرافی نے کتاب "جزیرۃ العرب" زمخشری نے "الامکنۃ والجبال والمیاہ" اور محمد بن احمد الہمدانی متوفی ۳۳۴ھ نے کتاب "صفۃ جزیرۃ العرب" لکھی تھی۔ آخر الذکر کتاب ہمدانی کی ۱۸۸۴ء میں لیڈن میں چھاپی گئی ہے۔ (ل۔م)

الزہری

محمد بن ابوبکر الزہری باشندۂ غرناطہ نے چھٹی صدی ہجری کے آغاز میں "کتاب الجغرافیہ" تصنیف کی۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس کتاب کو انہوں نے "الفزاری" کی کتاب سے اقتباس کیا تھا جس کا مرجع دراصل نقشۂ مامونی تھا۔

ادریسی

ابوعبداللہ محمد بن ادریس جو شریف ادریسی کے نام سے مشہور ہیں۔ ادارسہ کے خاندان سے ہیں جن کے ہاتھوں میں ۱۷۲ھ سے ۳۷۵ھ تک مراکش کے سلطنت کی باگ رہی۔ ان کی سب سے مشہور کتاب "نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق" ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ اور وہ حصہ جو اٹلی اور سسلی کے حالات سے متعلق ہے۔ روم سے مع ترجمہ کے ۱۸۷۸ء میں شائع کیا گیا (ل۔م) اور وہ ٹکڑا جس میں مغرب۔ ۔ ارمن۔ سوڈان اور مصر کا بیان ہے ۱۸۶۶ء میں لیڈن میں چھپا۔ (ل۔م)

مؤرخین کہتے ہیں کہ شریف موصوف نے یہ کتاب "شاہ رجار" ثانی فرمانروائے سسلی و جنوب اٹلی کی درخواست پر ۵۴۸ھ میں لکھی تھی۔

ان کی دوسری کتاب "انس المہج وروض الفرج" ہے ان دونوں کتابوں میں بخلاف دیگر اسلامی جغرافیہ دانوں کے شریف موصوف نے یورپ کے ممالک کے حالات زیادہ لکھے۔ خاص کر اٹلی کے چنانچہ اس کے بعد سے مسلمانوں نے جو کچھ یورپ کے متعلق لکھا ہے ان کا مرجع یہی دونوں کتابیں ہیں۔

المازنی محمد بن عبدالرحیم المازنی متوفی ۵۶۵ھ کی تحفۃ الالباب ونخبۃ الاعجاب" ونخبۃ الاذہان فی عجائب البلدان" و" عجائب المخلوقات ہیں۔ یہ تینوں کتابیں کتب خانوں میں قلمی موجود ہیں لیکن اب تک ان میں سے کوئی چھاپی نہیں گئی۔

اسی ذیل میں ہم اُن سفرناموں کا ذکر بھی ضروری سمجھتے ہیں جو اسلامی سیاحوں نے لکھے۔ اور جن میں بہت کچھ ملکوں اور شہروں کے بیانات اور مختلف اقوام کے حالات ہیں۔

ابنِ علی محمد بن علی الموصلی مشہور سیاح ہیں۔ انہوں نے چھٹی صدی ہجری کے آخر میں شام اور مصر کا سفر مدتوں تک کیا۔ ان ملکوں کے حالات کو اپنی کتاب "عیون الاخبار" میں لکھا ہے۔

ابنِ جبیر محمد ابن جبیر الکنانی متوفی ۶۱۴ھ نے بھی اپنا مبسوط سفرنامہ لکھا۔ یہ پہلی بار لیڈن سے ۱۸۵۲ء میں شائع کیا گیا۔ (ل۔م) دوبارہ پھر "گب میموریل" کے سلسلہ میں وہیں ۱۹۰۷ء میں دو جلدوں میں چھپا۔ (ل۔م)

یاقوت ابو عبداللہ یاقوت رومی حموی بغدادی متوفی ۶۲۶ھ سب سے مشہور سیاح اور جغرافیہ کے ماہر گزرے ہیں۔ یہ بچپن میں کسی لڑائی میں گرفتار ہو کر غلامی میں آگئے تھے۔ ان کے آقا نے جوہر قابل دیکھ کر آزاد کر دیا۔ طلب علم میں ملکوں ملکوں پھرے اور ایک مدت سیاحی میں گزاری۔ آخر میں مرو شاہجہاں میں مقیم ہوئے۔ وہاں بڑے بڑے کئی کتب خانے تھے۔ ان کو پڑھا اور متعدد تصنیفیں کیں، لیکن تاتاریوں کی یورش میں سب کچھ چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ اس میں وہ تصنیفات بھی غارت ہو گئیں۔

بعد ازاں انھوں نے کتاب "معجم البلدان" تصنیف کی۔ جغرافیہ میں عربی زبان میں کوئی دوسری کتاب اس سے بہتر اور مفصل نہیں ہے۔ اسلامی شہروں اور ان کے مشاہیر کے حالات جس قدر بھی ہو سکے ان کے فراہم کرنے میں کوتاہی نہیں کی اور حروف تہجی پر مرتب کر دیا۔ ۱۸۶۶ء میں یہ کتاب چار جلدوں میں لیپزگ سے شائع ہوئی۔ (ل۔م) اس کے بعد مصر والوں نے ۱۹۰۶ء میں اس کو آٹھ جلدوں میں شائع کیا اور جغرافیہ کی موجودہ معلومات کا کئی جلدوں میں اضافہ کر کے اس کا تکملہ کر دیا۔ (ل۔م)

علامہ ابو الفضائل صفی الدین عبدالمومن بن عبدالحق متوفی ۷۳۹ھ نے اس کا خلاصہ کر کے اس کا نام "مراصد الاطلاع علی اسماء الامکنۃ والبقاع" رکھا۔ یہ خلاصہ لیڈن میں چھ جلدوں میں مع فہرست وغیرہ کے طبع ہوا ہے۔ (ل۔م)

یاقوت حموی کی دوسری کتاب "المشترک وضعاً والمختلف صقعاً" ہے۔ اس میں صرف ہم نام مقامات

کے مولف اور حالات ہیں۔ گوطنجن سے ۱۸۴۶ء میں شائع ہوئی۔ (ل۔م)

ابن شداد ابوعبداللہ بن شداد متوفی ۶۸۴ھ میں ایک مشہور سیاح گذرے ہیں۔ انہوں نے شام اور عرب دونوں ملکوں کا تفصیلی سفر کیا۔ اور اپنے سفرنامہ "الاعلاق الخطیرہ فی امرار الشام و الجزیرہ میں ان کے حالات لکھے۔

قزوینی زکریا بن محمد قزوینی متوفی ۶۸۶ھ کی کتاب "عجائب المخلوقات و آثار البلاد" بہت مشہور ہے مصر سے علامہ دمیری کی کتاب الحیوان کے حاشیہ پر اور گوطنجن سے ۱۸۴۸ء میں جداگانہ طور پر شائع ہو چکی ہے۔ (ل۔م)

مغربی علی بن موسیٰ بن سعید مغربی، مصر، شام اور عراق کے ملکوں میں سیاحت کرتے رہے۔ ان کی کتاب "بسط الارض فی طولہا والعرض" ہے یہ جغرافیا کے نام سے مشہور ہے کیونکہ بطلیموس کی کتاب کی روشنی پر لکھی گئی ہے۔ جہاں تک معلوم ہے اس کا صرف ایک قلمی نسخہ پیرس کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

دمشقی ابوعبداللہ شمس الدین دمشقی متوفی ۷۲۷ھ مشہور جغرافیہ داں تھے۔ ان کی کتاب "نخبۃ الدہر فی عجائب البر والبحر" ہے۔ آسٹریا میں چھاپی گئی ہے۔

ابوالفدار اسماعیل عماد الدین ابوالفدا بادشاہ حماۃ۔ فن تاریخ کے امام اور جغرافیہ کے ماہر تھے، ان کی کتاب "المختصر فی احوال البشر" پہلی تاریخ ہے جو سلاطین اور خلفائے عرب کے حالات میں لکھی گئی۔ جغرافیہ میں ان کی ایک کتاب "تقویم البلدان" ہے۔ اس میں انہوں نے زیادہ تر ابن سعید مغربی کی کتاب سے اخذ کیا ہے۔ پہلی بار یہ کتاب مع لاطینی ترجمہ کے پیرس میں ۱۸۴۰ء میں چھپی۔ (ل۔م)، پھر دوبارہ ڈریسڈن (جرمنی) سے ۱۸۴۶ء میں شائع ہوئی۔

دوسری کتاب ابوالفدا کی جغرافیہ میں "ادضح المسالک الی معرفۃ البلدان والممالک" ہے۔ اس میں قدماء کی جہاں تک کتابیں ان کو مل سکیں۔ ان سب کا خلاصہ بترتیب حروف تہجی لکھا ہے۔

العمری شہاب الدین العمری مصنف کتاب "مسالک الابصار فی ممالک الامصار" ابوالفدار کے ہمعصر اور سلطان مصر ناصر بن قلادوں کے دربار میں ملازم تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں یورپ کے حالات زیادہ تر شریف ادریسی کی کتاب سے نقل کئے ہیں۔

الحرانی نجم الدین الحرانی متوفی ۷۳۲ھ جغرافیہ میں ان کی کتاب "جامع الفنون وسلوۃ المحزون" علما میں مقبول تھی۔

ابن بطوطہ محمد بن عبداللہ طنجی متوفی ۷۷۹ھ جو ابن بطوطہ کے نام سے مشہور ہیں۔ سیاحت میں بہت نامور ہیں۔ ۲۲ سال کی عمر میں اپنے وطن طنجہ (مراکش) سے نکلے اور پچاس سال سے زیادہ سیاحی میں گزار کر پھر وطن کو واپس آ گئے۔ اور وہیں اپنا سفرنامہ لکھا۔ اس میں مشرقی ممالک کے حالات زیادہ ہیں۔ یہ سفرنامہ مع ترجمہ کے پیرس سے دو جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ (ل۔م) ۱۲۸۸ھ میں مصر میں چھپا۔ (ل۔م) اس کا اردو میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے۔

ابن خلدون علامہ ابن خلدون مغربی امام تاریخ نے فن جغرافیہ میں کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔ لیکن اپنی مشہور تاریخ کے مقدمہ میں ہفت اقلیم کے مختصر حالات اور بعض شہروں کے تفصیلی بیانات لکھ دیئے ہیں۔

ابن الوردی عمر سراج الدین بن الوردی متوفی ۸۵۰ھ انہوں نے ایک کتاب "خریدۃ العجائب وفریدۃ الغرائب" تصنیف کی۔ اس کا وہ حصہ جو مصر سے متعلق ہے فرنچ میں ترجمہ کر کے پیرس سے شائع کیا گیا ہے۔ (ل۔م) مکمل کتاب مصر میں چھپی ہے۔ (ل۔م) یہ کتاب نجم الدین حرانی کی کتاب سے ماخوذ ہے بلکہ لوگ کہتے ہیں کہ وہی ہے

ابن ایاس مصر کے مشہور مؤرخ متوفی ۹۳۰ھ علامہ سیوطی کے شاگرد ہیں۔ جغرافیہ میں ان کی کتاب "نشر الازہار فی عجائب الاقطار" مشہور کتابوں میں سے ہے۔

اس کے بعد سے جو کتابیں لوگوں نے لکھی ہیں وہ بیشتر یا تو کتب سابقہ میں سے کسی کا خلاصہ ہیں یا محدود اقطاع کے حالات ہیں اور جغرافیہ کے لحاظ سے زیادہ وقعت کے قابل نہیں۔ اس لئے ہم ان کا ذکر چھوڑتے ہیں۔

یہ اُن اہم کتابوں کا بقیہ ہیں جو دسویں صدی ہجری تک مسلمانوں نے فن جغرافیہ میں لکھی تھیں۔ اندلس اور بغداد کے کتب خانوں کے ساتھ جغرافیہ کی جس قدر کتابیں فنا ہو گئیں اور جن کی کوئی خبر ہم تک نہیں پہنچی ان کا حساب زمانہ کی گردن پر ہے۔

عربی خط

(نوشتہ ۱۹۲۰ء)

دنیا کی ہر قوم اپنے آبائی خط سے بالطبع مالوف اور مانوس ہوتی ہے اور خاص کر جبکہ وہ دینی اور مذہبی خط ہو تو اور بھی اس کو متبرک اور مقدس سمجھ کر اس کی حفاظت اور اشاعت میں کوشش کرتی ہے۔
یہودیوں کا ابتدائے عہد سے یہ حال ہے کہ جس ملک میں جاتے ہیں وہاں کی زبان کو عبرانی ہی خط میں لکھتے ہیں عربی، فارسی، ترکی، جرمنی، نیز اسپینش وغیرہ زبانوں کو وہ اسی خط میں لکھتے ہیں۔ اور ان زبانوں میں اخبارات و رسالے اسی خط میں نکالتے ہیں۔ اسپین کے یہودی قسطنطنیہ سے ایک اخبار اسپینش زبان اور عبرانی خط میں شائع کرتے ہیں۔ نیویارک سے جرمن زبان کا ایک اخبار عبرانی خط میں نکلتا ہے۔ نیز تونس سے عربی زبان کے کئی اخبار عبرانی خط میں چھپ کر شائع ہوتے ہیں۔
مصر اور شام میں عربی زبان کو زمانۂ قدیم سے یہود عبرانی حروف میں لکھتے چلے آتے ہیں۔ سعید فیومی جس نے سب سے پہلے توریت کا عربی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ اس نے اس کو عبرانی ہی خط میں لکھا تھا۔ موسیٰ بن میمون یہودی جو سلطان صلاح الدین کا طبیب خاص تھا اپنی تمام تصانیف عربیہ کو عبرانی ہی خط میں لکھتا تھا۔
یہی کیفیت نصاریٰ کی تھی کہ ملک شام میں جب اسلام کا غلبہ ہوا اور وہاں عربی زبان رائج ہوئی تو اس زبان کو سریانی خط میں لکھتے تھے اور اس کو خطِ کرشونی کہتے تھے۔ اسی خط میں پیرس سے ۱۸۲۷ء میں انجیل شائع کی گئی۔

ارمنی اور یونانی جو بلادِ عثمانیہ میں بستے ہیں وہ اپنے اخباروں کو ترکی زبان اور یونانی یا ارمنی خط میں شائع کرتے ہیں۔ اسی طرح بلغاریہ کے کیتھولک بلغاری زبان کو لاطینی خط میں لکھتے ہیں۔ ان قوموں نے اپنی زبان کی تو حفاظت نہ کی لیکن اپنے خط کو محفوظ رکھا۔

مگر ملتِ اسلامیہ نے عربی زبان اور عربی خط دونوں کی حفاظت اور اشاعت میں جو کوشش کی ہے وہ دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ عربی زبان کے متعلق مسلمانوں کے کارناموں کو میں اپنے مضمون "فضائل زبان عربی"

میں مفصل طور پر لکھ چکا ہوں۔ اب اس موقع پر عربی خط کی اشاعت کی کیفیت دکھلانی چاہتا ہوں کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں کس طرح اس نے متمدن قوموں کے خطوط کو مٹا کر ان کی جگہ خود لے لی اور کس قدر عظیم الشان غلبہ اقصائے عالم میں اس کو حاصل ہوا۔ تاکہ مسلمانوں کو اپنے اس ملی اور مذہبی خط کی قدر معلوم ہو اور وہ بھی اس کی خوبیوں کو دیکھکر اس کی حفاظت اور اشاعت میں اسی طرح کوشش کریں جس طرح ان کے اسلاف کرام نے کی۔

دنیا کی تمام زبانیں چار مختلف اقسام میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔

(۱) سامی زبانیں، یعنی عبرانی، سریانی، نبطی، ارامی، کلدانی، عربی وغیرہ۔ جن کی زندہ قائم مقام اب صرف عربی ہے۔

(۲) ایرانی زبانیں۔ فارسی، کردی، پشتو، سنسکرت، ملائی، جاوی وغیرہ نیز یورپ اور امریکہ کی تمام زبانیں اس میں داخل ہیں۔

(۳) تورانی زبانیں۔ مثلاً ترکی، تاتاری، چینی، جاپانی وغیرہ

(۴) حامی زبانیں، جو جغرافیہ میں بولی جاتی ہیں مثلاً بربری، نوبی، حبشی وغیرہ

جس طرح ان زبانوں میں اصول لسانیہ کے لحاظ سے باہمی فرق ہے۔ اسی طرح ان کے خطوط میں بھی تفاوت ہے۔ سامی خطوط کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دائیں طرف سے لکھے جاتے ہیں۔ ایرانی خطوط تمام تر بائیں طرف سے اور تورانی خطوط بھی متصل حرف میں بائیں طرف سے بہ شکل عمود قائمہ لکھے جاتے ہیں۔

عربی خط کی ایجاد اور اس کا مأخذ

بعض نازک خیال مؤرخ عربی خط کا سلسلہ مصر کے قدیم خط ہیروغلیفی سے لے جا کر ملاتے ہیں، ان کے نزدیک ہیروغلیفی سے خط فینیقی اور اس سے خط ارامی مشتق ہوا جو سامی زبانوں کے خطوط کا مأخذ ہے لیکن عام طور پر مؤرخین کا بیان یہ ہے کہ عربی خط سریانی خط سے نکلا ہے جس کو خط سطرنجیلی کہتے ہیں۔ اس اشتقاق کی دلیل یہ ہے کہ عربی خط اور خط سطرنجیلی اس قدر باہم مشابہ ہیں کہ بادی النظر میں ان کی ایک ہی شکل اور ایک ہی نوعیت معلوم ہوتی ہے۔ علاوہ بریں سریانی حروف کی ترتیب ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت پر ہے۔ ابتدا میں عربوں نے بھی حروف تہجی کو اسی نہج پر رکھا تھا اور چونکہ عربی میں چھ حرف نئے نکالے گئے جو سریانی میں نہیں تھے، اس لئے دو لفظ ثخذ اور ضظغ اور بڑھا دیئے گئے۔

ان چھ زائد حروف یعنی ث، خ، ذ، ض، ظ، غ، کے لئے عربوں نے نئی صورتیں نہیں اختراع کیں، بلکہ

انھیں کے ہم مخرج حروف کی شکلیں اُن کے لئے مستعار لے لیں۔ مثلاً جن عربی لفظوں میں ث ہے وہ لفظ سریانی زبان میں جب جاتے ہیں تو ث کا تلفظ ت کا ہوجاتا ہے۔ جن میں خا ہے اس کو حا اور جن میں ذال ہے اس کو دال پڑھتے ہیں۔ اس لئے انھیں حروف کو جو سریانی میں موجود ہیں، ایک ایک نقطہ لگاکر عربی حروف بنالیا۔ صرف ضؔ کی شکل عبرانی سے لی گئی۔ کیونکہ جن لفظوں میں ض ہے۔ سریانی میں اس عین سے ادا کرتے ہیں اور عبرانی میں ص سے۔ مثلاً ارض کو سریانی میں ارع اور عبرانی میں ارص پڑھیں گے۔ اور چونکہ ص اور ض قریب المخرج ہیں۔ علاوہ بریں ع کی شکل ح کے لئے کی جاچکی تھی، اس لئے عبرانی سے ص کو لے کر اس پر ایک نقطہ لگاکر ض بنالیا۔ اس طرح پر عربی حروف کی تعداد ۲۸ ہوگئی اور ان کی شکلیں صرف ۱۷ رہیں۔ باہمی امتیاز کے لئے نقطے مقرر کئے گئے۔

اعراب یعنی حرکت اور وقف

بعض زبانیں ایسی ہیں کہ ان کے خط میں حرکات مطلق نہیں ہیں جیسے سامری زبان اور بعض زبانوں میں ان کے لئے حروف مقرر کئے گئے ہیں جو حروف تہجی میں شمار ہوتے ہیں اور سطروں میں لکھے جاتے ہیں ان خطوط کے لکھنے میں محنت اور وقت دونوں زیادہ صرف ہوتے ہیں اور جگہ بھی زیادہ گھیرتے ہیں۔ آریائی زبانوں کے خطوط کا بالعموم یہی حال ہے۔ بعض خطوط اس قسم کے ہیں کہ حرکتوں کے اختلاف سے ان میں حروف کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں مثلاً خط حبشی کہ اس کا ہر حرف مختلف حرکت کی حالت میں مختلف صورت رکھتا ہے۔ ایسے خطوط کی کتابت میں وقت اور غلطی واقع ہوتی ہے۔

ان سب کے خلاف سامی خطوط میں حرکات کے لئے علامتیں ہیں جو اوپر نیچے لگائی جاتی ہیں۔ اس میں آسانی یہ ہے کہ جہاں ضرورت سمجھیں ان کو استعمال کریں ورنہ چھوڑ دیں۔ اسی وجہ سے عربی کتابت ایک قسم کی مختصر نویسی ہوگئی دنیا کا کوئی خط اس قدر آسانی اور سُرعت کے ساتھ اور تھوڑی جگہ میں نہیں لکھا جاسکتا جس قدر کہ عربی خط لکھا جا سکتا ہے۔

عربی خط پر اعتراض

بعض ناواقف اور متعصب لوگوں کی زبان سے عربی خط پر یہ اعتراض سننے میں آیا کہ اس میں حروف اور الفاظ کی باہمی مشابہت کی وجہ سے پڑھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ نیز حرکات کے لئے چونکہ حروف متعین نہیں ہیں اور صرف علامتوں سے کام لیا جاتا ہے اس لئے ان میں سہل انگاری ہوجانے کی وجہ سے عبارت صحیح نہیں پڑھی جاسکتی۔ اندلس میں بھی بعض لوگوں نے اس قسم کے اعتراضات عربی خط پر کئے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی وزنی اعتراض نہیں ہے۔ حروف کے باہمی امتیاز کے لئے نقطے مقرر ہیں۔ حرکات کے لئے علامتیں ہیں، علاوہ بریں یہ معترضین نقطوں اور حرکتوں کو جس قدر ضروری سمجھتے

ہیں اسی قدر واقع میں ان کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کتابوں، اخباروں، نیز خطوط اور نوشتوں کی اردو صحیح صحیح پڑھ لیتا ہے۔ حالانکہ ان میں نقاط اور اعراب کی کہاں پابندی کی جاتی ہے۔ خط مسلسل یا اور اس قسم کے خطوط جن کے لکھنے والوں کا منشا یہ ہوتا ہے کہ سوائے ان کے خاص احباب کے اور کوئی ان کو سمجھ سکے ان پر اعتراض کرنا فضول ہے۔ آج ہزار ہزار برس کی کتابیں عربی خط میں لکھی ہوئی ہیں کتب خانوں میں موجود ہیں اور لوگ ان کو شروع سے آخر تک صحیح پڑھ لیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر کسی خط کے مکمل ہونے کی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ وہ ہر زمانہ میں بلا کم و کاست صحیح صحیح پڑھا جاسکے۔

ایک غلطی کا ازالہ

بعض لوگوں نے ایک یہ روایت مشہور کر رکھی ہے کہ عربی خط میں نہ پہلے نقطے تھے نہ حرکتیں۔ قرآن شریف کے مدوّن ہونے کے نصف صدی کے بعد نصر بن عاصم نے نقطے اور ابوالاسود دوئلی نے اعراب ایجاد کئے، یہ روایت غلط ہے عربی خط میں کئی کئی حرفوں کا ہم شکل ہونا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ ایجاد ہی کے وقت ان میں باہمی امتیاز کیلئے نقطے مقرر کئے گئے ہوں گے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کا قول ہے کہ عربی خط کے موجد تین شخص ہیں۔ مرآر نے شکلیں وضع کیں۔ اسلم نے جوڑ ملانے کا طریقہ نکالا اور عامر نے نقطے اور اعراب ایجاد کئے۔

ابوالاسود دوئلی نے اعراب نہیں ایجاد کئے بلکہ علم الاعراب یعنی نحو کے چند اصول ترتیب دیئے ہیں۔ عربی خط عہد اسلام سے پہلے ہی تکمیل کی حد کو پہنچ چکا تھا۔ علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ

> دولت تبابعہ کے عہد میں ملک یمن میں عربی خط ضبط استحکام اور خوبی کے لحاظ سے مکمل ہوچکا تھا۔ اس لئے کہ ان میں تمدن اور شائستگی تھی اس خط کا نام خط حمیری ہے۔ وہاں سے یہ خط منتقل ہو کر حیرہ میں آیا اور حیرہ سے مکہ اور طائف کے تاجروں نے سیکھا۔

حرکات کا عربوں کو اس قدر خیال تھا کہ معمولی اعراب کے علاوہ انہوں نے مد کی ایک خاص علامت اختراع کی اور مزید براں اس کے اظہار کے لئے حرف علت کو بھی ضروری سمجھا۔

عربی خط حجاز میں

اسلام سے پہلے ملک عرب میں اہل حجاز خاص طور پر فن کتابت سے ناآشنا تھے۔ کیونکہ ان کی سادہ زندگی میں لکھنے پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی، البتہ ان کے ارد گرد جو عربی قومیں آباد تھیں ان میں فی الجملہ تمدن تھا، اسی وجہ سے ان میں کتابت رائج تھی۔ چنانچہ شمال میں نبطی قومیں خط نبطی میں اور یمن میں حمیر خط مسند میں کتابت کرتے تھے۔ اہل حجاز چونکہ ملک

شام، عراق اور یمن میں تجارت کی غرض سے آتے جاتے تھے، انہوں نے بھی تجارتی حساب رکھنے والے کے لئے ان قوموں سے لکھنا سیکھ لیا۔

مورخین کا بیان ہے کہ حجاز میں سب سے پہلے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے جو مکہ کے ملک التجار تھے کتابت سیکھی، لیکن اس زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے ہاتھ کا ایک نوشتہ ملا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی لکھنا جانتے تھے۔

عربی خط کی قدیم ترین شکلیں خطِ نسخی اور خطِ کوفی ہیں۔ خطِ نسخی حجاز کے سوداگروں نے تجارت گاہ شام میں حوران کے نبطیوں سے سیکھا اور خطِ کوفی عراقِ عرب کے پایۂ تخت شہر حیرہ سے حجاز میں آیا۔ اس کو پہلے خطِ حیری کہتے تھے، لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حیرہ کے متصل عراقِ عرب کے صدر مقام کوفہ کو آباد کیا تو یہی خط خطِ کوفی کے نام سے مشہور ہو گیا۔

عربی خط اور اسلام حجاز میں اگرچہ چند افراد کتابت سے آشنا ہو گئے تھے لیکن ان کی تعداد اس قدر کم تھی کہ بالعموم عرب کو "اُمیّین" (ناخواندہ) کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسی لفظ کے ساتھ ان کو خطاب فرمایا ہے۔ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا (۶۲/۲)، ظہورِ اسلام کے بعد عربی خط کا منارہ بلند ہونا شروع ہوا جس کا اصل باعث قرآن شریف ہے۔ کیونکہ پہلی وحی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی یہ تھی۔

اقراء باسم ربك الذی خلق ۔ خلق الانسان من علق ۔ اقرأ و ربك الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم ($\frac{96}{1\text{-}5}$)

دوسری سورت میں اللہ تعالیٰ قلم اور نوشتوں کی قسم کھاتا ہے۔

ن والقلم وما یسطرون ($\frac{68}{1}$)

اسلام کے ساتھ ہی ساتھ عربی خط کی بھی اشاعت شروع ہوئی۔ کیونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی آسمانی اور ان خطوط کے لکھنے کے لئے جو غیر ملکوں کے بادشاہوں کو بھیجے جاتے تھے کاتبوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ عرب میں سب سے پہلے جس نے عام طریقہ پر خط کی اشاعت کی کوشش شروع کی وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ آپ کی یہ خواہش تھی کہ اُمّت عربیہ میں بالعموم کتابت کو رائج کر دیں۔ اس کی شہادت اس واقعہ سے بھی ملتی ہے کہ جنگ بدر میں جو کفار اسیر ہوئے تھے، ان میں سے جن کو لکھنا آتا تھا ان کا فدیہ آپ نے یہ مقرر فرما

دیا تھا کہ وہ مدینہ کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں اور آزاد ہو جائیں۔

خلفاء راشدین اور بعض دیگر صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کتابت جانتے تھے اور وہی لوگ آیات قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط لکھتے تھے۔ اکثر صحابہؓ نے آپ کا رجحان طبع دیکھ کر زمانۂ اسلام میں کتابت سیکھ لی اور مسلمانوں میں بتدریج اس کا رواج ہو چلا یہاں تک کہ مدینہ شریف میں بعض بعض عورتیں بھی کتابت کرتی تھیں۔ خود اُم المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا لکھ پڑھ سکتی تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے بھی نشر خط کی تحریک جاری رکھی، یہاں تک کہ لوگوں کی نظروں میں کتابت ایک شریف فن ہو گیا۔ اور اہل عرب جو صرف شجاعت اور فیاضی کو انسان کا قابل فخر جوہر سمجھتے تھے اور کتابت کو خیاکت اور خیاطت کی طرح ایک معمولی پیشہ خیال کرتے تھے، اب اس کو بھی انسانی کمالات کی فہرست میں داخل کرنے لگے، چنانچہ "کامل" اسی شخص کو کہنے لگے جو تیر اندازی، تیراکی اور کتابت تینوں فن جانتا ہو۔

یہ تو معلوم ہے کہ اس زمانے میں سوائے قرآن شریف کے عربی زبان میں کوئی دوسری کتاب نہیں تھی جب حضرت عثمانؓ نے مصاحف لکھوا کر مختلف صوبوں میں بھجوائے تو اہل قلم اسی کی کتابت میں منہمک ہو گئے۔ اس کی نقل میں باہم مقابلہ کی وجہ سے عربی خط کو فروغ ہو چلا۔

خطِ کوفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین و نیز بنی اُمیہ کے عہد تک چونکہ اہل اسلام کو زیادہ تر جنگ و فتوحات میں مشغول رہنا پڑا۔ اس وجہ سے سوائے قرآن شریف کے دوسری چیزوں کی کتابت کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں مل سکی۔

اس زمانہ میں کتابت خطِ کوفی میں ہوتی تھی۔ بنی اُمیہ کے آخر عہد میں قطبہ کاتب نے جو اپنے زمانہ کا رئیس الکتابت تھا، خط کوفی کی چار مختلف ترتیبیں قائم کیں۔ پھر ابتدائے دولت عباسیہ میں ضحاک بن عجلان نے جو خلیفہ سفاح کے زمانہ میں تھا، قطبہ کے حدود سے بھی آگے قدم بڑھایا اور منصور اور مہدی کے عہد میں اسحٰق بن حماد نے اس خط کی اور بھی شاخیں نکالیں۔ چنانچہ خطِ کوفی کی بارہ قسمیں ہو گئیں جن کے نام حسب ذیل ہیں۔

قلم الجلیل۔ یہ خط مسجدوں کی محرابوں اور متبرک مقاموں کے در و دیوار پر کتبہ لکھنے میں کام آتا تھا۔ اب اس کو خط جلی کہتے ہیں۔

قلم السجلاتؔ، قلم الدیباجؔ، قلم اسطوماز الکبیرؔ، قلم الثلثینؔ، قلم الزنبورؔ، قلم المفتحؔ، قلم الحرم سلاطین اور ملوک کی حرم سراؤں میں مستعمل تھا۔ قلم المؤامراتؔ، اُمراء باہمی مشورہ لینے میں اس خط کو کام میں لاتے تھے۔ قلم العہودؔ

دستاویزیں اور بیعنامے وغیرہ اس میں لکھے جاتے تھے۔ قلم القصص، قلم الخرفاج

مامون عباسی کے عہد میں جب دوسری زبانوں سے علوم وفنون کے ترجمے ہونے لگے تو کتابت کو اور بھی ترقی ہوئی اور خط کوفی کی چند نئی شکلیں مخترع ہوئیں۔ قلم المرصع، قلم الریاسی، قلم النساخ، قلم الرقاع، قلم غبار الحلبہ وغیرہ۔ سلطنت کے مختلف کاروبار میں مختلف شکل کے خطوط مستعمل ہونے لگے اور خط کوفی کی تقریباً بیس قسمیں استعمال میں آنے لگیں۔

خطِ نسخی یہ خط عباسیوں کے ابتدائی عہد میں محض رسمی خط و کتابت میں کام آتا تھا اور قرآن شریف اور سلطنت کے دفاتر میں اب تک تمام تر خط کوفی مستعمل تھا لیکن وزیر ابن مقلہ متوفی ۳۲۸ھ نے خط نسخی کو نہایت آراستہ و پیراستہ کیا اور اس کو اس قابل بنادیا کہ بے تکلف وہ دین و دولت دونوں جگہ باریاب ہوگیا۔ یعنی دواوین سلطنت اور کتابت قرآن دونوں میں اس کا استعمال ہونے لگا۔

ابن مقلہ کے بعد متعدد کاتبوں نے اور بھی اس کو خوشنما بنایا۔ ابن البواب متوفی ۴۱۳ھ نے اس کی مختلف قسمیں اختراع کیں اور پھر یاقوت بن عبداللہ رومی مستعصمی متوفی ۶۹۸ھ نے اس کو درجۂ کمال پر پہنچا دیا۔ اس کی قبولیت یہاں تک بڑھ گئی کہ رفتہ رفتہ خط کوفی کی جگہ اس نے لے لی۔

متاخرین خطاطوں میں خط کی چھ قسمیں زیادہ تر مشہور اور مستعمل تھیں۔ خط ثلث، ریحانی، نسخ رقاع، محقق اور تعلیق۔ انہیں قسموں سے قلم دیوانی، قلم دشتی اور قلم فارسی وغیرہ دوسری شاخیں نکلیں۔

جب بغداد تباہ ہوگیا اور خلافت عباسیہ وہاں سے منتقل ہو کر مصر میں آگئی تو یہاں بھی عربی خط کی ترقی کا سلسلہ جاری رہا۔ قلقشندی نے صبح الاعشیٰ میں ممالیک کے حالات بیان کرتے ہوئے آٹھویں صدی ہجری کے آخر میں عربی خط کی اقسام ذیل کا ذکر لکھا ہے۔

الطومار الکامل۔ سلاطین کے مراسلات اور فرامین کے لئے۔

مختصر الطومار۔ اس کی دو قسمیں تھیں۔ ثلث اور محقق۔ اس میں عہد نامے اور امراء اور ملوک کے نام خطوط لکھے جاتے تھے۔

ثلث : اس کی بھی دو قسمیں تھیں۔ ثقیل اور خفیف

توقیع : وزرا اور حکام اس خط میں مسلوں پر توقیع لکھا کرتے تھے۔

رقاع : چھوٹے چھوٹے رقعوں کے لکھنے میں مستعمل تھا۔

غبار : نقوش اور کتبوں کے لئے۔

ممالیک کے زمانہ کی عمارتوں پر جو کتبے ہیں ان کا خط بغداد کی عمارتوں کے کتبوں سے زیادہ خوشنما اور دلکش معلوم ہوتا ہے۔

سلطنتِ ممالیک کے زوال کے بعد اسلامی تمدن کے وارث ترک قرار پائے۔ انہوں نے بھی خط کی ترقی میں اپنی توجہ معروف رکھی۔ اور قرونِ وسطیٰ کے مختلف قسم کے خطوط کی نگہداشت کی۔ گیارہویں صدی ہجری میں عربی خط کی تین قسمیں ان کے ہاں رائج تھیں۔ خطِ رقعہ اور خطِ ہمایونی خود ترکوں کی ایجاد ہے۔ ترکوں میں حمد اللہ متوفی ۹۲۶ھ اور حافظ عثمان متوفی ۱۱۱۰ھ بے مثل خطاط گزرے ہیں۔

سامانِ کتابت

بنی اُمیہ کے عہد تک چمڑے اور ہرن کی کھال وغیرہ مختلف چیزوں پر کتابت کی جاتی تھی۔ سلطنت کے دفاتر چمڑے اور کھال کے پلندوں کے مجموعے ہوتے تھے۔ عباسیوں کے عہد میں خالد بن برمک خلیفہ سفاح کے وزیر نے انہیں پلندوں کو کتابوں کی شکل میں مرتب کیا۔ ہارون الرشید کے زمانہ میں جعفر بن یحییٰ برمکی نے کاغذ ایجاد کیا۔ اس وقت سے عربی خط کی نمایاں ترقی شروع ہوئی۔

عربی خط کی مقبولیت

یہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ظہورِ اسلام کے وقت عربی خط صرف عرب میں محدود تھا۔ اور وہاں بھی بہت کم لوگ تھے جو لکھنا جانتے تھے۔ جب اسلام نے جزیرۂ نمائے عرب سے باہر قدم رکھا اور اہلِ عرب، عراق، ایران، شام اور افریقہ میں پھیل گئے تو عربی زبان کے ساتھ ساتھ ان ملکوں میں عربی خط بھی رائج ہونے لگا۔ دنیا کی جن جن قوموں میں اسلام کی روشنی پہنچی عربی خط بھی ان میں مقبول ہوگیا۔ مشرق میں ملایا اور جاوا سے لے کر مغرب میں بحرِ اوقیانوس تک اور شمال میں حدودِ ترکستان اور وسطِ روس سے لے کر جنوب میں انتہائے زنجبار تک، جن میں ملائی، تاتاری، ہندی، سندھی، ترک، افغان، کُرد، حبشی وغیرہ متعدد قومیں مختلف زبانیں بولنے والی بستی ہیں۔ عربی خط پھیل گیا اور ان تمام قوموں نے اپنی اپنی زبانوں کو اسی خط میں لکھنا شروع کیا اور تقریباً ۲۰ کروڑ نفوس عربی خط کے قلم رو میں آگئے۔

اسلامی تمدن کی دوسری یادگاروں سے اگر قطع نظر بھی کرلیں تو عربی خط اس کی ایک ایسی دائمی یادگار ہے کہ اُس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ جو قومیں اسلامی تمدن میں داخل ہوئیں ان میں سے بعض بعض قوموں نے عربی دین کے ساتھ عربی زبان اور عربی خط کو بھی اختیار کرلیا۔ مثلاً شام، عراق، اور اکثر ممالک افریقہ کے باشندے۔

بعض بعض قوموں میں صرف دو ہی باتیں آئیں یعنی عربی دین اور عربی خط، جیسے ترک، ایرانی، افغانی، ہندی سندھی وغیرہ۔ کسی قوم نے صرف عربی زبان اور عربی خط کرلیا۔ مثلاً ممالک اسلامیہ کی ذمی رعایا اور کسی نے صرف دین پر قناعت کی۔ عربی زبان اور عربی خط نہ اختیار کرسکی۔ جیسے چین کی مسلمان، لیکن باوجود اس کے عربی زبان اور عربی خط کی وہ لوگ دل سے عزت کرتے ہیں اور اس کو متبرک اور مقدس سمجھتے ہیں۔ قرآن شریف اور دعائیں اسی زبان اور اسی خط میں لکھتے ہیں۔

الغرض جس طرح عربی زبان تمام دنیا کے مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے اسی طرح عربی خط تمام اسلامی زبانوں کا مشترکہ خط ہے۔

مردم شماری یورپ میں ترک اور تاتاری قوموں کی تعداد جن کی زبان عربی خط میں لکھی جاتی ہیں، دس ملین سے کم نہیں۔ ایشیا میں عربی خط میں کتابت کرنے والوں کی تعداد ۱۶۳ ملین سے زیادہ ہے۔ اور افریقہ میں تخمیناً ۷۰ ملین ہے۔ دنیا کے دیگر ممالک میں اور بھی لاکھوں آدمی ہیں جو اس مردم شماری میں نہیں آئے لیکن وہ عربی میں کتابت کرتے ہیں۔ اب ان تینوں براعظموں میں ان قوموں کی مجموعی تعداد جن کی زبانیں عربی خط میں لکھی جاتی ہیں، ۲۴۳ ملین سے زیادہ ہے۔ یعنی تقریباً ۲۵ کروڑ۔ خلاصہ یہ ہے کہ عربی خط افریقہ میں غالب، ایشیا میں شائع، یورپ میں مستعمل اور امریکہ اور آسٹریلیا میں مشہور اور معروف ہے۔

زبانوں کے لحاظ سے دیکھیے تو سامی زبانوں کی تمام انواع پر خود عربی اس قدر غالب آگئی کہ اس نے ان کو یا تو فنا کردیا یا تقریباً مردہ بنادیا اور ان کی جگہ خود لے لی۔

حامی زبانوں میں بھی اکثر زبانوں کو عربی نے فنا کردیا۔ اب جو چند شاخیں اس کی باقی رہ گئیں ہیں، ان میں سے سات زبانیں عربی خط میں لکھی جاتی ہیں۔

تورانی زبان کی اہم ترین شاخ ترکی ہے، اس کی تمام قسمیں عربی میں آگئیں۔

ایرانی زبانوں کی دو قسمیں ہیں۔ جنوبی اور شمالی، جنوبی میں سوائے سنسکرت کے کہ وہ برہمنوں کی مذہبی زبان ہے باقی سب عربی خط میں آگئیں۔ البتہ شمالی ایران جن میں یورپ اور امریکہ کی زبانیں داخل ہیں یورپین خطوط میں لکھی جاتی ہیں۔

اب ہم ان زبانوں کو تفصیل وار لکھتے ہیں جو عربی خط میں لکھی جاتی ہیں۔

ترکی زبانیں ترکی زبان کی مختلف قسمیں ہیں جن میں باہم تھوڑا تھوڑا سا اختلاف ہے۔ چینی ترکستان سے

یوروپین روس اور یوروپین ٹرکی تک یہ زبانیں مستعمل ہیں۔ تاتاری، مغل، ازبک، ترکمان، اور عثمانی ترک ان کو بولتے ہیں۔ یہ قومیں تقریباً کُل کی کُل مسلمان ہیں اور ان کی مجموعی تعداد چار کروڑ سے کم نہیں ہے۔

کاشغری ترکی : چینی ترکستان یعنی تاتار میں مستعمل ہے۔ ایک کروڑ سے زیادہ مسلمانوں کی یہ زبان ہے۔

ازبجی ترکی : وسطی شمال روسی ترکستان میں جس کا مرکز سمرقند ہے۔ یہ زبان بولی جاتی ہے۔ بولنے والوں کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ ہے۔

چغتائی ترکی : خیوہ اور بخارا کے ترکمان اور وسط ایشیا کے قبائل کی زبان ہے پہلے یہ زبان چینی خط میں لکھی جاتی تھی۔ جس کو خطاویگوری کہتے ہیں اور جاب تک منچو قوموں میں مستعمل ہے۔ اس زبان کی سب سے پہلی کتاب جو عربی خط میں لکھی گئی وہ امیر علی شیر متخلص بہ نوائی متوفی ۹۰۶ھ کا ترکی دیوان ہے۔ امیر موصوف سلطان حسین والیٔ ہرات کے وزیر تھے۔ دوسری کتاب توزک بابری ہے جو بادشاہ بابر متوفی ۹۳۷ھ کی لکھی ہوئی ہے۔

اورنبرگی ترکی : یوروپین روس میں سائبیریا کے مغرب میں اور نبرگ دراس کے قرب وجوار کے قبائل قوزاق (کاسک) کی زبان ہے۔ اس قوم میں مسلمان، عیسائی اور کچھ بدھ مذہب کے پیرو بھی ہیں۔

چرکسی ترکی : چرکس تمام تر مسلمان ہیں۔ بحر اسود کے شمال مغرب میں دریائے قوبان اور ترک کے کناروں پر پہاڑی علاقوں میں آباد ہیں۔ ان کی تعلیمی زبان عربی ہے۔ خط وکتابت بھی اسی میں کرتے ہیں۔ چرکسی زبان لکھی نہیں جاتی۔ حال میں محمد کمال بک چرکس نے اس زبان کے حروف تہجی ترتیب دیئے ہیں جن کی تعداد ۵۵ تک پہنچ گئی ہے۔

داغستانی ترکی : بحر خضر کے مغربی سواحل پر داغستان اور اس کے گرد ونواح میں بولی جاتی ہے۔ امام شامیل متوفی ۱۸۸۱ء مشہور سپہ سالار جو داغستان کی مدافعت میں تیس سال تک روس سے لڑتے رہے ان کے زمانہ میں اس زبان نے ترقی حاصل کی۔ اس کے بولنے والے تقریباً دس لاکھ آدمی ہیں۔ اسطراخان میں متعدد مطابع قائم ہیں جو اس زبان اور نیز عربی کی کتابیں شائع کرتے ہیں۔

داغستانی قوم آٹھویں صدی عیسوی میں اسلام لائی۔ اسی وقت سے یہاں کی زبان عربی میں لکھی جانے لگی داغستان کی دوسری زبان کومکی جو اس سے مختلف ہے عربی خط میں لکھی جاتی ہے۔

آذربیجانی ترکی : ایشیائی قفقاز کے شمالی حصہ یعنی باکو، تفلیس، باطوم وغیرہ اور آذربیجان کے جنوبی حصہ میں مستعمل ہے، اس زبان میں بہت سی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں۔ کئی اخبار نکلتے ہیں۔ شعر گوئی بھی ہوتی ہے۔ لیکن سترھویں صدی عیسوی سے پہلے کا کوئی شعر اس میں نہیں پایا جاتا۔

نوجائی ترکی : بحیرہ اسود کے شرقی سواحل پر قفقاز کے علاقہ میں بولی جاتی ہے۔

کرمی ترکی : ویں صدی عیسوی میں جزیرہ نمائے کریمیا اور جنوبی روس میں جو تاتاری مسلمان داخل ہوئے ان کی زبان ہے۔ اس میں عربی اور فارسی کے الفاظ بہت شامل ہیں۔

تاتاری یا قازانی ترکی : یوروپین روس قازان اور اس کے گرد و نواح میں بولی جاتی ہے۔ یہ ان تاتاری مسلمانوں کی زبان ہے جو یہاں آباد ہیں اور جن کی تعداد پندرہ لاکھ تخمینہ کی جاتی ہے۔ دسویں صدی عیسوی کے قبل یہی تاتاری روس پر حکمراں تھے اور روسیوں میں سب سے زیادہ خوش نصیب وہ شخص سمجھا جاتا تھا جس کی لڑکی کسی مسلمان امیر کے گھر بیاہی ہو، لیکن اب صدیوں سے یہ روس کے محکوم ہیں۔ ان میں سے سوائے ایک فرقہ یا قونیہ کے باقی سب مسلمان ہیں۔

اس زبان میں عربی یا فارسی آداب کی چربہ کشی نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ خود اس کے اصلی قدیمی ادبیات نظم و نثر موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں عربی فارسی کے الفاظ کم پائے جاتے ہیں۔ تاتاری لوگ خالص ترکی کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس زبان میں متعدد اخبار نکلتے ہیں اور سیکڑوں کتابیں ہر سال شائع ہوتی ہیں۔

انیسویں صدی کے وسط میں روس کے مشہور مستشرق پروفیسر مینسکی نے یہ کوشش کی کہ یہ زبان روسی حروف میں لکھی جائے۔ اس کی وجہ یہ ظاہر کی کہ اس تبدیلی سے تاتاریوں کی ابتدائی تعلیم آسان ہو جائے گی اور درپردہ غرض یہ تھی کہ ادبیات اسلامیہ سے ناواقف ہو کر وہ ارتھوڈکس مذہب میں شامل ہو جائیں۔ لیکن تاتاریوں نے عربی خط کا چھوڑنا گوارا نہ کیا اور عرصہ دراز تک سخت مقابلہ کرتے رہے۔ کسی طرح پر حریفوں کو اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ یہاں تک کہ جب روس میں شاہی فرمان کی رو سے دستوری حکومت قائم ہوئی اور قوموں کے حقوق کسی قدر محفوظ ہوئے تو اس کشمکش سے نجات ملی۔

عثمانی ترکی : حکومتِ عثمانیہ کی شاہی زبان ہے جو اس کے تمام قلمرو میں مستعمل ہے۔ ترک، ارمن، کرد وغیرہ یہی زبان بولتے ہیں۔ تمام ترکی زبانوں میں یہ زیادہ وسیع اور مہذب ہے۔

یہ اگرچہ ترکی زبان کی ایک شاخ ہے لیکن اب اس قدر ترقی پا گئی ہے کہ قدیمی ترکی سے اس کو کوئی مناسبت

باقی نہیں رہی۔ ترکی زبان کی کوئی پرانی کتاب کسی عثمانی ادیب کو دی جائے تو وہ بہت کم اس کو سمجھ سکے گا۔

عثمانی ترکی دراصل چغتائی ترکی ہے۔ لیکن اس میں پچاس فی صدی عربی اور پندرہ فیصدی فارسی کے الفاظ شامل ہوگئے ہیں۔ عربی الفاظ کی کثرت سے شامل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ سلطنت عثمانیہ کے قیام سے پیشتر یہ زبان تصنیف وتالیف کی زبان نہ تھی۔ چونکہ ترک، سلجوقی سلطنت کے وارث ہیں جن کا علم ادب فارسی تھا۔ اس لئے ترکی ادب کی بھی بنیاد فارسی ہی ادب پر رکھی گئی اور مذہبی علوم براہ راست عربی سے اخذ کئے گئے۔ اس لئے کچھ عربی کے الفاظ بتوسط فارسی کے اور کچھ براہ راست خود عربی سے اس میں آگئے۔ اس زبان کی کتابت ابتدا ہی سے عربی خط میں ہوئی۔ عربی کے حروف تہجی سے اس میں چند حروف زائد ہیں ایک (کٹ) جس پر تین نقطے ہوتے ہیں۔ اور تقریبا نون کی آواز دیتا ہے۔ دوسرا کاف یائی جو پڑھا نہیں جاتا۔ فارسی کے چاروں حروف پ، چ، ژ، گ بھی اس کے حروف تہجی میں شامل ہیں۔

مذکورہ بالا زبانوں کے علاوہ ترکی زبان کی چند اور شاخیں بھی ہیں۔ مثلاً سائبری، باشکیری، کاؤنشی، وباندی وغیرہ جن کی تفصیلی کیفیت نہیں معلوم ہوسکی۔ لیکن یہ سب کی سب بھی عربی خط میں لکھی جاتی ہیں۔

فارسی

فارس اگرچہ ایران کے ایک چھوٹے سے صوبہ کا نام ہے جو خوزستان اور کرمان کے مابین واقع ہے۔ اور جس کا مرکز پہلے اصفہان اور پھر شیراز رہا ہے لیکن اب تمام ایران کو فارس اور ایرانی زبان کو فارسی زبان کہتے ہیں۔ یہ زبان ایران اور افغانستان کی شاہی زبان ہے۔ ہندوستان میں بھی ۱۸۳۱ء تک سرکاری دفاتر کی زبان یہی تھی اور اب تک بھی ادبار ہندوستان اس زبان کو حاصل کرتے ہیں۔ بلوچستان نیز کردستان میں بھی یہی زبان بولی جاتی ہے۔ اس کے بولنے والوں کی تخمینی تعداد (۱۲) ملین ہے۔

ایران کی قدیمی زبان جو تمام ایرانی زبانوں کی اصل ہے۔ خط بابلی میں جس کو میخی یا مسماری یا پیکانی کہتے ہیں۔ لکھی جاتی تھی۔ آج بھی ایرانی زبانوں مثلاً روسی، جرمنی، فرنچ، انگلش، لاطینی، یونانی، نیز سنسکرت اور ہندی وغیرہ کے خطوط کی اگر تحلیل کی جائے تو ان کے تمام حروف کی شکلوں کی ساخت پیکان یا کیل سے مشابہ ملتی ہے یا ایک سے چار کیلوں تک خاص خاص طریقوں سے ترکیب دے کر ان کی جداگانہ شکلیں ملتی ہیں۔ تمام قدیم فارسی زبانیں دساتیری، زندی، پہلوی وغیرہ اسی خط میں لکھی جاتی تھیں۔

اسلام لانے کے بعد اہل فارس نے اپنی زبان کو عربی خط میں لکھنا شروع کیا اور خط تعلیق کو جو عوام میں رائج تھا اختیار کر لیا۔ فارسی کی سب سے پہلی تحریر جو عربی خط میں ملی ہے وہ ایک بیعنامہ ہے جو ۱۱ھ میں لکھا گیا تھا۔

اس کے بعد پیش کی تاریخ ہے جو خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نیشاپور میں دستیاب ہوئی ہے۔ اس کی کتابت کا زمانہ تقریباً ۴۲۱ھ ہے۔

ایرانیوں نے خطِ تعلیق کو بتدریج ترقی دینی شروع کی اور خطِ نسخ اور تعلیق دونوں کو باہم ملاکر خطِ نستعلیق نکالا، ہزاروں خطاط اور خوشنویس پیدا ہوئے اور ایرانیوں کی لطافتِ طبع نے اس خط کو اس قدر دیدہ زیب اور دلفریب بنایا کہ اس سے بڑھ کر خوشنما کوئی خط روئے زمین پر نہیں ہے۔ تمام کتابیں اسی میں لکھی جاتی ہیں۔ مذہبی کتابوں کے لئے خطِ نسخ اور روزمرہ کے کاموں میں خطِ شکستہ مستعمل ہے۔ نقوش میں خطِ گلزار بھی کام میں لایا جاتا ہے۔ اسی ایرانی خط نے افغانستان اور ہندوستان میں رواج پایا اور ان ممالک میں بھی بے نظیر خوشنویس پیدا ہوئے۔

فارسی حروفِ تہجی میں عربی کے حروفِ تہجی پر چار حرف اور اضافہ کئے گئے یعنی پ، چ، ژ اور گ۔

بلوچی: بلوچستان اور مکران میں بولی جاتی ہے۔ فارسی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ مذہبی زبان میں عربی کے الفاظ اور تجارتی زبان میں اردو کے الفاظ زیادہ شامل ہوگئے ہیں۔ حروفِ تہجی وہی ہیں جو اردو میں ہیں۔

پشتو: افغانستان اور اس کے متصل پہاڑی علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ فارسی اور عربی کے الفاظ کثرت سے ملے ہوئے ہیں۔ پندرہویں صدی عیسوی سے قبل کی کوئی تصنیف اس زبان میں نہیں ملتی۔ لیکن اس کے بعد بہت سی کتابیں نظم و نثر میں لکھی گئی ہیں۔ عربی حروفِ تہجی سے ۱۲ حروف اس میں زائد ہیں۔

کردی: کردوں کی زبان ہے جن میں سے سلطان صلاح الدین ایوبی فاتح جنگ صلیبی جیسا فخر روزگار پیدا ہوا۔ یہ زبان کردستان اور آرمینیا وغیرہ میں بولی جاتی ہے۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد پندرہ لاکھ کے قریب ہے۔ عربی، فارسی اور ترکی تینوں زبانوں کے الفاظ اس میں کثرت سے شامل ہیں۔ فارسی حروفِ تہجی سے ایک حرف ث جس پر تین نقطے لگائے جاتے ہیں، اور جس کی آواز واو کے مشابہ ہے اس میں زیادہ ہے۔ کردی زبان غالباً جب سے کتابت میں آئی ہے۔ عربی ہی خط میں لکھی جاتی ہے۔

ہندی زبانیں

ہندوستان میں متعدد زبانیں مستعمل ہیں۔ لیکن اس ملک کی عام زبان اُردو ہے جو تقریباً تمام ہندوستان میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ ہندی، ترکی، فارسی اور

عربی الفاظ اس کے اجزاء ترکیبی ہیں۔ اب انگریزی کے رواج سے بہت سے یورپین الفاظ بھی اس میں داخل ہو گئے ہیں۔

یہ زبان جب سے عالم وجود میں آئی ہے اسی وقت سے عربی خط میں لکھی جاتی ہے۔ اس کے حروف تہجی میں فارسی کے حروف تہجی سے تین حرف ٹ، ڈ، ڑ، زیادہ ہیں۔

اس زبان میں مسلم اور غیر مسلم قوموں کے اخبارات اور رسالے حد شمار سے زیادہ شائع ہوتے ہیں اور ہر سال ہزاروں کتابیں نظم و نثر میں تصنیف و تالیف ہوتی رہتی ہیں۔ حیدرآباد دکن میں اعلیحضرت نظام خلد اللہ ملکہ نے حال میں اُردو کلیۃ قائم کر کے اس کی ترقی کا عظیم الشان سامان مہیا کر دیا ہے۔ جدید علوم و فنون کے ترجمہ کے لئے وہاں ایک دار الترجمہ بھی کھولا گیا ہے۔

کشمیری: خطۂ کشمیر کے باشندے بولتے ہیں جن کی تعداد تیس لاکھ ہے۔ پانچویں صدی ہجری کے آغاز ہی سے کشمیر میں اسلام آگیا تھا۔ اسی وقت یہاں کی زبان عربی خط میں لکھی جانے لگی۔

ان زبانوں کے علاوہ پنجابی، سندھی، ملتانی وغیرہ بھی ہندوستان کی زبانیں عربی خط میں لکھی جاتی ہیں۔ سندھی زبان میں حروف تہجی کی تعداد ۵۲ تک پہنچتی ہے۔

جزائر بحر ہند کی زبانیں: جاوا، سماٹرا، نیز ریاست ہائے ملایا کی تمام زبانیں عربی خط میں لکھی جاتی ہیں۔ کسی زمانے میں جنوبی عرب کے تاجر یہاں آئے تھے۔ ان کے اثر سے یہاں کے لوگ اسلام لائے اور عربی خط کو اختیار کر لیا۔

ملائی زبان میں سنسکرت کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ اس زمانہ کے بقایا ہیں جب ہندوستان اور ملایا میں تجارت کا سلسلہ تھا۔ نیز پرتگالی الفاظ بھی اس میں ملتے ہیں جو پرتگالیوں کے تسلط کی یادگار ہیں۔ عربی حروف تہجی سے حرف اس میں زیادہ ہیں۔ اعداد کی رقمیں بھی عربی میں لکھی جاتی ہیں۔

جاوی زبان: دراصل ملائی زبان کی ایک شاخ ہے۔ اس کی متعدد قسمیں ہیں اور سوائے صولو کے سب عربی ہی خط میں لکھی جاتی ہیں۔ البتہ حروف کی آواز میں عربی تلفظ سے بہت کچھ مغائرت ہے۔

صولو زبان کی الف، ب، قدیم ہندی سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن اب ہالینڈ کی حکومت اس کو مٹا کر ہالینڈی حروف میں لکھوانے کی کوشش کر رہی ہے۔

سماٹرا میں بھی عربی ہی خط میں کتابت ہوتی ہے۔ صرف مینغ کے باشندے ہندسی کا خط میں لکھتے ہیں۔

جزیرہ فلپائن: فلپائن میں اسلام کی اشاعت سنہ ۱۴۸۰ء سے شروع ہوئی۔ اب وہاں کی آبادی کا خاصا حصہ اہل اسلام کا ہے۔ وہ لوگ اپنی تمام کتابیں وہاں کی ملکی زبان مجندناؤ میں عربی خط میں لکھتے ہیں۔

چینی زبان: چین میں اسلام اگرچہ بہت زمانہ سے شائع ہے اور وہاں مسلمانوں کی آبادی بھی زیادہ ہے۔ لیکن علوم اسلامیہ سے ناآشنا رہنے کی وجہ سے وہاں عربی کا رواج بہت کم ہوا۔ سب سے پرانی عربی تحریر جو چین میں پائی گئی ہے وہ کینٹن کی مسجد کا کتبہ ہے جو سنہ [illegible] میں لکھا گیا ہے۔ چینی ساخت کے بعض قدیم مسی ظروف پر بھی عربی نقوش ملے ہیں لیکن ان کے زمانہ کی تعیین نہیں ہو سکی۔ غالباً نویں صدی ہجری سے پہلے کے وہ نہیں ہیں۔

چینی مسلمان قرآن شریف، دعاؤں اور بعض مذہبی کتابوں کو عربی خط میں لکھتے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں ایک کتاب "مختصر احکام الاسلامیہ" قلمی دستیاب ہوئی ہے جو چینی زبان اور عربی خط میں ہے۔

افریقی زبانیں

افریقہ میں اسلام کے ساتھ ساتھ عربی زبان پھیلی اور وہاں کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد اسی زبان کو بولنے اور لکھنے لگی۔ لیکن اس کے علاوہ افریقہ کے مختلف حصوں میں اور زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ مثلاً اقصائے مغرب میں بربری، نوبہ اور سوڈان مصری میں نوبی۔ وسط افریقہ اور مغربی سوڈان میں زنگی۔ مشرق اور جنوب میں بانتو وغیرہ اور یہ سب عربی خط میں لکھی جاتی ہیں۔

ہم مختصراً یہاں کی چند مشہور زبانوں کا حال ذیل میں درج کرتے ہیں۔

بربری شلحی

حامی زبان کی شاخ ہے۔ مراکش کے اصلی باشندے یہی زبان بولتے ہیں۔

بربری زبان اپنے الفاظ اور تراکیب کے لحاظ سے بذات خود ایک مستقل زبان ہے۔ اس کی دو شاخیں ہیں جو رسم الخط اور تلفظ میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں ایک ریفی جو شمال میں بولی جاتی ہے۔ دوسری سوکا جو جنوب میں مستعمل ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی کئی کئی شاخیں ہیں اور سوائے ان صحرائی قبائل کی زبان کے جو توارک کہے جاتے ہیں سب کی سب عربی خط میں لکھی جاتی ہے۔ توارک کا طرز تحریر حمیری خط سے مشابہ ہے جو زمانۂ قدیم میں جنوبی عرب میں مستعمل تھا۔ اس خط کا وجود انیسویں صدی عیسوی سے قبل نہیں تھا اور یہ مکمل بھی نہیں ہے کیونکہ اس میں اعراب بالکل نہیں۔ زیادہ زمانہ نہ گزرنے پائے گا کہ یہ زبان بھی عربی خط میں آجائے گی۔

بربری قبائلی : یہ بھی حامی زبان کی شاخ ہے اور ان غیر عربی قبائل کی زبان ہے جو الجزائر کے نواح میں آباد ہیں۔ ان میں عربی الفاظ کثرت سے ہیں۔
الجزائر میں چونکہ عربی زبان مستعمل ہے اس لئے اسی میں کتابت ہوتی ہے۔ یہ زبان بہت کم لکھنے میں آتی ہے۔ موحدین کے عہد میں جن کا تسلط الجزائر سے اندلس تک ۵۲۴ھ سے ۶۶۷ھ تک رہا اور قرآن شریف اور بعض کتب حدیث و فقہ کے ترجمے اس زبان میں کئے گئے تھے۔ لیکن علماء وقت نے ان علوم کی تعلیم غیر عربی زبان میں ناجائز قرار دے دی اس وجہ سے وہ ترجمے فنا کر دیئے گئے۔
ان بربری قبیلوں نے اسلام کی ابتدائی فتوحات میں مسلمانوں کو بہت پریشان رکھا۔ بارہ مرتبہ مسلمان ہو ہو کر مرتد ہوتے رہے۔ آخری مرتبہ پہلی صدی ہجری کے خاتمہ پر جب موسیٰ بن نصیر کے تسلط میں آئے تو پختہ مسلمان ہو گئے۔ پھر انہیں کے ذریعہ سے وسط افریقہ میں مذہب اسلام کی اشاعت ہوئی اور انھیں لوگوں نے ماوراء بحر مغربی ملکوں کو فتح کیا۔

نوبی : وادئ نیل کے باشندوں کی زبان ہے۔ اس کی بھی مختلف قسمیں ہیں اور سب عربی ہی خط میں لکھی جاتی ہیں۔

حوسی : زنجی زبان کی شاخ ہے اور ملک حوسہ میں مستعمل ہے جس کا مرکز سقطو (سکوٹو) ہے اس لئے اس زبان کو بھی سقطو کہتے ہیں۔ عام طور پر تمام افریقہ میں یہ زبان سمجھی جاتی ہے۔
بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ الحاق و اتصال کی وجہ سے جب افریقہ کی کمزور زبانیں مٹ جائیں گی اور قوی زبانیں ان کی جگہ لے لیں گی تو تمام افریقہ میں صرف چار زبانیں رہ جائیں گی۔ شمال میں عربی، مغرب میں حوسی، جنوب میں انگریزی اور مشرق میں سواحلی۔

سواحلی : بانتو زبان کی شاخ ہے۔ مشرقی افریقہ اور زنجبار میں بولی جاتی ہے اور افریقہ کے اکثر حصوں میں سمجھی جاتی ہے۔ اہل سواحل و زنجبار ۸۹ھ سے اسلام سے آشنا ہو گئے تھے، اور اسی زمانہ میں عربی دین، عربی اخلاق و آداب اور عربی خط کو اختیار کر لیا۔

ملجاشی : جزیرۂ مدغاسکر میں بولی جاتی ہے۔ اس کے بولنے والے تقریباً بیس لاکھ آدمی ہیں۔ اس جزیرہ کے باشندوں میں اسلام قبول کرنے کے بعد کتابت کا رواج ہوا اور چونکہ قرآن سے آشنا ہو چکے تھے، اس لئے اسی کے خط کو اپنی زبان کے لئے اختیار کر لیا۔ اب اس تمام جزیرہ میں یہی خط رائج ہے۔

عربی حروف تہجی میں چند حرف اور بڑھا دیئے ہیں۔ بعض حروف کے تلفظ میں بھی اصل سے اختلاف کرتے ہیں

حبشی :۔ بلادِ حبشہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی سے اسلام معروف و مشہور ہو گیا تھا اب وہاں اسلامی آبادی اسی لاکھ ہے۔ گو وہاں کے مسلمان مسیحی سلطنت کے ماتحت ہیں لیکن تمدن و ادب میں اپنے ہمسایوں سے ممتاز ہیں۔ حبشی زبان کی جس قدر شاخیں ہیں سب کی کتابت عربی خط میں ہوتی ہے۔

ان کے علاوہ افریقی زبانوں کی اور بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخیں ہیں۔ مثلاً کوشی، ہوسہ، دنقلی، آغز صومالی اور الغالا قبائل کی زبانیں اور یہ سب عربی خط میں لکھی جاتی ہیں۔

مغربی خط : تمام افریقہ میں عربی اور نیز غیر عربی زبانوں کی کتابت میں عربی خط کی جو قسم مستعمل ہو وہ مغربی کہی جاتی ہے یہ حاصل خط کوفی کی ایک شاخ ہے جو پہلے قیروان میں شائع ہوا تھا پھر وہاں سے اندلس میں پہنچا۔ ان کا نام خطِ اندلسی یا قرطبی رکھا گیا۔ لیکن قیروانی خط مستطیل تھا اور اندلسی خط نے مدور شکل اختیار کی یہی خط شمالی افریقہ میں شائع ہوا۔

ساتویں صدی ہجری سے وسطِ افریقہ میں متعدد اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں جن کا مرکز ٹمبکٹو قرار پایا جو سنہ ۱۱۰۰ء میں آباد ہوا تھا۔ یہاں اس خط کی ایک دوسری نوعیت پیدا ہوئی، جس کا نام خطِ سودانی رکھا گیا۔

اب افریقہ میں چار مختلف قسم کے عربی خط رائج ہیں جو مغربی خط بولے جاتے ہیں۔

خطِ تونسی : یہ خط مشرقی ممالک کے عربی خط سے مشابہ ہے۔

خطِ الجزائری : یہ بالعموم کج اور گوشہ دار لکھا جاتا ہے جس کا پڑھنا مشکل ہے۔

خطِ فاسی : مراکش کے پایہ تخت کے نام سے منسوب ہے۔ اس کی شکل مدور ہوتی ہے اور چوتھا خط یہی سودانی ہے۔

عربی خط اور یورپ

یورپ میں مسلمانوں کی فتوحات صرف اندلس اور پرتگال تک محدود نہیں رہیں۔ بلکہ فرانس میں وہ دریائے لوار اور شہر تور تک پہنچ گئے تھے۔ اس مقام سے فرانس کا موجودہ پایۂ تخت پیرس صرف ۲۲۴ کیلو میٹر کے فاصلہ پر تھا اس نقطہ پر سے جو خط گذرتا ہے وہ فرانس کو شمالی اور جنوبی دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے جن میں سے جنوبی حصہ تمام تر دارالاسلام تھا۔

۷۳۲ء کی مشہور جنگ کے بعد جس میں چارلس مارٹل نے مسلمانوں کی پیشقدمی کو روک دیا۔ وہ اس مقام سے طولوز اور قرقون کی طرف واپس آ گئے اور ایک عرصہ دراز تک فرانس کے اس حصہ میں قرآن شریف

اور عربی کی تعلیم ہوتی رہی۔ ۹۲۵ء میں وائس کی سمت سے سوئٹزرلینڈ کی طرف بڑھے اور فرانس سے بحیرۂ روم کے سواحل تک عربی تسلط قائم ہو گیا۔

ادھر دوسری طرف سے سسلی اور جزبی اٹلی پر قبضہ کرتے ہوئے رومۃ الکبریٰ کا محاصرہ کیا اور اس کے بندرگاہ اوستیہ پر قبضہ کر لیا۔ نیز بیتیا اور جنوا وغیرہ اسلامی علم کے نیچے آگئے اور پوپ کی مقدس تخت گاہ کے اردگرد عربی دین کی تعلیم اور عربی خط کی کتابت ہونے لگی۔

یورپین قومیں جن کو اسلام سے واسطہ پڑا عربی خط میں کتابت کرنے لگیں۔ اندلسی اور پرتگالی زبانیں عربی خط میں لکھی جاتی تھیں۔ اور ان کو الخمیادو کہتے تھے۔ عمارات کے اوپر نقوش اور کتبے عربی خط میں لکھے جاتے تھے۔ چنانچہ سسلی کے شہر پلرمو میں امپرر فریڈرک دوم کی قبر پر جو کتبہ ہے وہ عربی خط میں ہے۔ اس زمانہ کے بلغاریہ، جرمنی، نارمنڈی وغیرہ کے سکے ملے ہیں۔ جن پر عربی نقوش ہیں۔

عربی خط کا رواج اندلس، پرتگال، فرانس اور اٹلی ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ تمام جزائر بحیرۂ روم میں بھی یہ خط شائع تھا مثلاً جزائر مالیار بارکا، منارکا، ایوبقا نیز کارسیکا اور مالطہ میں بھی۔

مشرقی سمت سے پندرہویں صدی عیسوی میں عثمانی سلاطین نے جب قسطنطنیہ کو جو یورپ کی کنجی ہے فتح کر لیا تو ریاست ہائے بلقان پر اُن کا پورا تسلط ہو گیا۔ سترہویں صدی کے وسط میں سلطنت عثمانیہ کے حدود آسٹریا کے پایہ تخت ویانا کی دیواروں تک پہنچ گئے تھے اور اس کے رقبۂ حکومت میں بحیرۂ ایجین کے جزائر سے لے کر یونان، روملیا، بوسنیا، ہرزی گو نیا، سرویا، مانٹی نیگرو، بلغاریہ، ہنگری، رومانیا، شرقی مالدیویا وغیرہ سب داخل تھے۔ ان تمام ملکوں میں ترکی زبان کے ساتھ عربی خط رائج تھا۔ اب بھی ان ممالک میں لاکھوں آدمی ترکی لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ بوسینیا اور ہرزی گو نیا کے مسلمان جو سلافی النسل ہیں اور جن کی تعداد ۵۰۰،۱۲۰۰ ہے۔ وہ اپنی سلافی زبان کو بھی اسی خط میں لکھتے ہیں اور وہاں کا اخبار معلّم سلافی زبان اور عربی خط میں نکلتا ہے۔

ان تمام حالات کو پڑھ کر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح دنیا کے مذاہب میں اسلام کو اور زبانوں میں عربی زبان کو غلبہ حاصل ہوا، اسی طرح خطوط میں عربی خط کو مقبولیت نصیب ہوئی اور چونکہ اصول کتابت کے لحاظ سے یہ خط دنیا بھر کے خطوط سے زیادہ آسان اور مکمل ہے اس لئے مختلف ملکوں کی مختلف قوموں نے جن کے لب و لہجہ بالکل باہم متضاد تھے اپنی اپنی زبانوں کے لئے بلا دقت اس خط کو اختیار کر لیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نابینائی

(نومبر ۱۹۲۷ء)

اس عالم کون و فساد میں ناتواں اور بے بس انسان کے لئے جو ابتلائیں اور آزمائشیں رکھی گئی ہیں ان میں سے بے بصری بھی ایک سخت مصیبت ہے۔ اللہ محفوظ رکھے۔ اندھا تندرست مگر درگور۔ دنیا میں ہے لیکن دنیا سے دور اور اقربا و احباب کی دید سے مہجور۔ اسی وجہ سے اس مصیبت عظمیٰ میں صبر کرنے پر بعض روایات میں جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ قرآن حکیم نے بھی اس کو معذورین میں داخل کیا اور فرمایا۔ لیس علی الاعمی حرج چنانچہ فریضۂ جہاد اس سے ساقط ہے اور جمعہ و عیدین وغیرہ کی حاضری اس کے لئے لازم نہیں۔

بعض علماء نے اندھوں کو ناقص الدین قرار دیا ہے کیونکہ طہارت جو اصل الاصول ہے اس کی پوری رعایت کرنے سے وہ قاصر ہیں۔ اسی بنا پر بعضوں کے نزدیک ان کی امامت بھی مکروہ ہے۔ ان لوگوں کا استدلال اس آیت سے ہے۔

لا یستوی الاعمیٰ والبصیر ولا الظلمٰت ولا النور ولا الظل ولا الحرور (۳۵/۱۹-۲۱)

نابینا اور بینا برابر نہیں۔ اور نہ ظلمت اور نور اور نہ سایہ اور دھوپ

لیکن حقیقت میں اس آیت میں نہ اعمیٰ سے مراد اندھا ہے نہ بصیر سے بینا۔ بلکہ کافر اور مومن ہیں اور یہیں نہیں بلکہ قرآن میں دوسرے مواقع پر بھی انہیں معنوں میں یہ الفاظ مستعمل ہوئے ہیں۔ سورۂ ہود میں ہے۔

مثل الفریقین کالاعمیٰ والاصم والبصیر والسمیع (۱۱/۲۴)

دونوں فریقوں (کافروں اور مومنوں) کی مثال ایسی ہے جیسے اندھا اور بہرا اور بینا و شنوا

سورۂ حج میں بھی فرمایا۔

فانھا لاتعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔ (۲۲/۴۶) حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں نہیں اندھی ہوتی بلکہ وہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

اس لئے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ ایک غیر اختیاری معذوری کی وجہ سے کیوں انسان کا رتبہ رب شکور و غفور کے نزدیک فروتر ہوجائے گا۔

جن لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اندھا نبی نہیں ہوسکتا ان کا نقطۂ نظر اور ہے یعنی وہ اس معذوری کو نبوت کے فرائض میں حارج سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک جہاں اور بہت سی باتیں ہیں مثلاً بدشکل یا بدخاندان ہونا جن سے ساحتِ نبوت پاک رہنا چاہیئے وہاں نابینائی بھی ہے۔ معہذا سارے اہل علم ان کے ہم خیال نہیں ہیں۔ علامہ ابوالعبّاس احمد بن علی نے اپنی کتاب راس مال الندیم میں لکھا ہے کہ حضرت شعیب اور اسحاق علیہم السلام کی بینائی چلی گئی تھی۔ امام ابن جوزی نے تلقیح[1] میں ان دونوں ناموں کے ساتھ حضرت یعقوب کا نام بھی اضافہ کیا ہے جن کی آنکھوں کے سفید ہوجانے کا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے۔ (۱۲/۸۴)

گو اس کا جواب مخالفین کی طرف سے یہ ہے کہ پہلے دو نبیوں کے متعلق کوئی قطعی شہادت موجود نہیں ہے اور حضرت یعقوبؑ کی نابینائی عارضی تھی لیکن تاہم ان کے بیان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ نابینائی کو ایک نقص سمجھتے ہیں۔ نہ کہ عیب۔ تعجب ان لوگوں پر ہے جو اس کو نہ صرف عیب بلکہ عذاب قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے دعوے کی تائید میں یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

ومن کان فی ھذہٖ اعمیٰ فھو فی الاخرۃ اعمیٰ (۱۷/۷۲) اور جو یہاں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔

لہذا جب آخرت میں نابینائی عذاب ہے تو دنیا میں کیوں نہیں۔

مگر حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ اور مقاتل وغیرہ اکثر علماء تفسیر نے اس کے معنی بیان کئے ہیں کہ اعمیٰ

---

[1] یہ نادر و نایاب کتاب جس سے دنیا کے سامنے بڑے بڑے شاہی کتب خانے خالی تھے۔ حال میں ہمارے دوست مولوی محمد یوسف صاحب ٹونکی کی کوشش سے دہلی میں طبع ہوئی ہے۔

عن الحجت یعنی قیامت کے دن اس کو کوئی جواب نہ سوجھے گا۔ یہ مفہوم دوسری آیت سے جو سورۂ طٰہٰ میں ہے زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔

ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا ونحشرہ یوم القیامۃ اعمی۔ قال رب لما حشرتنی اعمی وقد کنت بصیرا قال کذالک اتتک ایاتنا فنسیتہا وکذالک الیوم تنسی۔ ($\frac{۲۰}{۱۲۴،۱۲۶}$)

جو کوئی میرے ذکر (قرآن) سے رو گردانی کرے گا اس کے لئے معیشت تنگ ہوگی۔ اور ہم قیامت کے دن اس کو اندھا اٹھائیں گے وہ کہے گا اے میرے رب مجھے اندھا کیوں اٹھایا میں تو بینا تھا۔ وہ جواب دے گا کہ ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا میری آیتیں تیرے پاس آئیں تھیں تو نے ان کو بھلا دیا اسی طرح آج تو بھلا دیا جائے گا۔

یعنی اس کے اندھا اٹھانے کا مطلب نسیان حجت ہے کہ وہ جواب دے کر اپنی برأت نہیں کر سکے گا اور نجات کی صورت نہیں دیکھ پائے گا جیسا کہ آیت کے آخری حصہ سے تشریح ہوتی ہے۔

اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اگر یہاں اعمیٰ کا مجازی مفہوم یعنی نسیان دلائل مراد ہے تو اس سے دنیا میں اس کو کیا مفر تھا جو آخرت میں یہ اس کے لئے تعزیر بن سکے۔

امام رازیؒ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ چونکہ اس کی روح سے جہالت میں دنیا سے مفارقت کی اس لئے یہی جہالت اس کی روح کیلئے الم کا باعث ہو گی۔

اس جواب سے افسوس ہے کہ امام صاحب کے روحانی معاد کے قائل ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

ہمارے نزدیک اس کا سیدھا جواب یہ ہے جو شخص دنیا میں قرآن سے رو گرداں ہو ا وہ قیامت میں اندھوں کی طرح سرگرداں پھرے گا اور کوئی سبیل نجات کی نہیں دیکھ پائے گا۔

گویہ آیت عمل بالقرآن کے متعلق ہے لیکن بعض علماء نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگر کوئی شخص حفظ کرنے کے بعد قرآن کو بھلا دے تو وہ قیامت کے دن اندھا اُٹھایا جائے گا۔

حاصل یہ ہے کہ نابینائی اگرچہ ایک دردناک مصیبت ہے لیکن وہ عذاب یا تعزیر کسی طرح پر نہیں کہی جا سکتی۔ ہزاروں بچے مادرزاد اندھے پیدا ہوتے ہیں آخر یہ کس جرم کی تعزیر ہیں؟

بے بصری سے ہر چند انسان میں بڑا نقص آجاتا ہے اور اس کی زندگی تقریباً بیکار سی ہو جاتی ہے لیکن اس میں کچھ فائدہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ توجہ ہٹانے والی چیزوں سے اس کو یکسوئی ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس کی بصیرت اور ذہانت بڑھ جاتی ہے۔ خاص کر قوت حافظہ۔ چنانچہ خود نابینا بزرگوں کے اقوال اس پر شاہد ہیں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔

ان یاخذ اللہ من عینی نورھما	ففی لسانی وسمعی منھما نور
قلبی ذکی وعقلی غیر ذی دخل	وفی فمی صارم کالسیف ماثور

یعنی اگر اللہ نے میری آنکھوں کا نور لے لیا تو ان کے بدلے میں میری طاقت اور سماعت میں نور آگیا میرا دل ذکی ہے اور عقل بے شائبہ۔ اور منہ میں ایسی زبان ہے جو تیغ کی طرح تیز ہے۔

وقالوا قد عمیت فقلت کلا	وانی الیوم ابصر من بصیر
سواد العین زار سواد قلبی۔	لیجتمعا علی فھم الامور

یعنی لوگوں نے کہا کہ تو اندھا ہو گیا، میں نے کہا ہرگز نہیں۔ اب تو میں بیناؤں سے بھی بڑھ کر بینا ہوں میری آنکھوں کی سیاہی و پتلی، سویدائے قلب میں آگئی ہے تاکہ دونوں مل کر باتیں سمجھیں۔

جودت طبع، سیلان ذہن اور حفظ و یادداشت کے متعلق نابیناؤں کی داستانیں حیرت انگیز ہیں۔ ایک حدیث بھی بیان کی جاتی ہے کہ۔

ما اخذ اللہ کریمتی مومن الا عوضہ خیرا منھما۔	اللہ جس مومن کی آنکھیں لے لیتا ہے ان کا بدلہ ان سے بہتر اس کو دیتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ ہمارے سلف اس جماعت کو حفظ قرآن و حدیث میں لگا دیتے تھے تاکہ ان کی زندگی نہ صرف ان کے بلکہ ملت کے لئے مفید اور کار آمد ہو جائے۔ چنانچہ علمائے اسلام یعنی محدثین، مفسرین، فقہا اور ادباء بالخصوص شعراء میں ان کی ایک جماعت کثیر نامور ہوئی۔ جن کی تصانیف اب تک بھی اُمت کیلئے سرمایۂ ناز ہیں۔

خود عرب کی گرمی اور اس کی صحاری آنکھوں کے حق میں کچھ اچھے واقع نہیں ہوئے ہیں۔ ہمیشہ سے وہاں ایک بڑی تعداد احولوں، کانوں اور اندھوں کی رہی ہے۔ لیکن اسلامی ممالک میں سب سے زیادہ آنکھوں کے لئے مضر دریائے نیل کا پانی ہے۔ ملک مصر میں تقریباً ۷۵ فی صدی آدمی آنکھوں کے بیمار رہتے

ہیں وہ بیمار نہیں جس کی بابت شاعر نے کہا ہے ؎

لقب کیا کیا تمہاری چشم عاشق کش نے پائے ہیں نشیلی، نرگسیں، بیمار، افسوں گر، بڑی۔ اچھی

بلکہ واقعی مریض۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کثرت سے اندھے سڑکوں پر گھومتے نظر آتے ہیں۔

ہر چند کہ بغداد کی تباہی کے بعد سے اسلامی علوم اور آداب کا مرکز قاہرہ رہا ہے اور آج تک بھی ہے لیکن وہاں کی حالت خراب ہوتے ہوتے اس درجہ پر پہنچ گئی ہے کہ ہر ہر محلہ میں ایک ایک قبر پرستش گاہ ہوتی ہے جس کے ارد گرد یہ اندھے بیٹھے ہوئے قرآن پڑھتے رہتے ہیں تاکہ زائرین سے کچھ خیرات وصول کریں۔ مردوں کے ایصالِ ثواب کی دعوتوں اور گورستانوں میں اکثر یہی جماعت قطار در قطار نظر آتی ہے اور اپنی دینی اور دنیاوی اور جسمانی و روحانی افسوسناک حالت سے ایسا پُرالم نظارہ پیش کرتی ہے جس پر انسانیت ماتم کرنے لگتی ہے۔ اور اس کے مقابل میں کافر یورپ جو سلوک اپنے یہاں کے اندھوں کے ساتھ کرتا ہے، اس کی ستائش کرنی پڑتی ہے۔

ہندوستان کے مفلس اور نادار مسلمان اس مصیبت زدہ جماعت کی تکلیف کا احساس بھی نہیں رکھتے[1] اور تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ انہوں نے اپنی دولت اور شوکت کے زمانہ میں بھی اس کی طرف زیادہ توجہ نہ کی اور ایک بیکار جزو سمجھا۔

اس آخری زمانہ میں نواب صدیق حسن خاں صاحب نے البتہ جا بجا سے اندھوں کو بھوپال میں جمع کر کے سلف کے دستور کے مطابق قرآن و حدیث یاد کرنے کے کام میں لگایا تھا۔ اور وظائف مقرر کر دیئے تھے۔ چنانچہ ان کے عہد میں وہاں اس جماعت کی بڑی تعداد تھی۔ بالعموم یہ لوگ قرآن حفظ کر لیتے تھے جس کا اثر یہ ہوا کہ وہاں اندھوں کو عام طور پر "حافظ جی" کہنے لگے۔ بعض بعض بلوغ المرام اور مشکوٰۃ ازبر کر لیتے تھے اور اس پر ان کو انعامات ملتے تھے۔ چند ایسے بھی تھے جو بخاری بلکہ صحاح ستہ یاد رکھتے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ صاحب درس بھی تھے جن کی ذہانت اور حافظہ کے متعلق عجیب و غریب روایتیں وہاں مشہور تھیں۔

---

[1] چند سال ہوئے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے اپنے والد ماجد کی یادگار میں علی گڑھ میں اندھوں کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ کھولا ہے۔ غالباً ہندوستان کے مسلمانوں میں وہ پہلی مثال ہے۔

اس ذیل میں اسلام کے مشہور نابیناؤں کا ایک اجمالی تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے
صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم میں سے جو حضرات مکفوف البصر تھے وہ یہ ہیں۔

(۱) حضرت سعد بن وقاصؓ۔ فاتح قادسیہ و مدائن یہ ساتویں مسلمان اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں نیز اُن چھ اصحاب شوریٰ میں سے جن کو حضرت عمرؓ آپنے آپ میں سے خلیفہ منتخب کرنے کے لئے نامزد فرما گئے تھے۔

یہ صحابۂ کرام میں خصوصیت کے ساتھ مستجاب الدعوات تھے۔ زمانۂ فتنہ میں سب سے الگ رہے آخری عمر میں بصارت جاتی رہی۔ حمراء الاسد کے متصل ان کی ایک زمین تھی وہیں مکان بنا کر سکونت اختیار کی۔ ۵۵ھ میں انتقال فرمایا نعش کو لوگ مدینہ میں اٹھا لائے۔

(۲) حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ۔ عم رسولؐ بڑھاپے میں نابینا ہو گئے تھے حضرت عمرؓ نے استسقاء میں جب اُن کو آگے بڑھایا تھا اس وقت بھی نابینا تھے۔ ۳۲ھ میں وفات پائی۔ عمر ۸۸ سال تھی۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عباس حبر امت وا اپنے باپ اور دادا کی طرح بڑھاپے میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ امیر معاویہؓ ان کی بہت عزت و توقیر کرتے تھے۔ ایک تو ان کے عقل وعلم کی وجہ سے دوسرے اس سبب سے کہ ان کے باپ ابوسفیان اور ان کے باپ حضرت عباسؓ میں باہم بہت محبت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عبداللہ بن عباسؓ اکثر ان سے ملنے کے لئے دمشق میں جایا کرتے تھے جب یہ نابینا ہو گئے تھے اسی زمانہ میں امیر معاویہؓ نے ایک دن کہا کہ بنی ہاشم کی بصارت پر اکثر آفت آجاتی ہے بولے کہ ہاں۔ اور بنی اُمیہ کی بصیرت پر۔ طائف میں رہتے تھے۔ وہیں ۶۸ھ میں گذر گئے۔

(۴) عقیل بن ابی طالبؓ۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بھائی اور انساب عرب کے بڑے واقف کار تھے۔ حضرت عمرؓ نے فوج کا دفتر جن لوگوں سے مرتب کرایا تھا ان میں یہ بھی تھے۔ جنگ صفین کے بعد اپنے بھائی کا ساتھ چھوڑ کر معاویہ کے پاس چلے گئے اور وہیں رہنے لگے۔ انہوں نے مشہور کرنا شروع کیا کہ دیکھو حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی جو انساب عرب کے سب سے بڑے عالم ہیں اگر ہم کو بہتر نہ سمجھتے تو کیوں اُن کو چھوڑ کر ہمارے پاس آتے۔ عقیل کو جب یہ خبر ملی تو کہا کہ ٹھیک لیکن صرف دنیاوی لحاظ سے۔

ایک روز امیر معاویہؓ نے اپنے درباریوں سے کہا کہ سورۂ تبت میں ابولہب کا نام جو آیا ہے اس کو تم لوگ جانتے ہو کہ کون تھا؟ شامیوں نے کہا کہ نہیں۔ عقیل کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ان کا چچا تھا۔ حضرت عقیل نے ان لوگوں سے کہا کہ اسی سورۃ میں ابولہب کی بیوی جس کو حمالۃ الحطب کا خطاب دیا گیا ہے جانتے ہو کہ کون تھی؟ لوگ بولے نہیں۔ کہا کہ وہ معاویہ کی پھوپھی ام جمیل بنتِ حرب تھی۔ [illegible] کے حدود میں وفات پائی۔

(۵) عبداللہ بن عمر بن خطابؓ۔ علماء اور فقیہ صحابہ میں سے ہیں۔ باپ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تھے۔ جنگِ بدر اور احد میں کمسنی کی وجہ سے شرکت کی اجازت نہ پائی اور راستہ سے واپس کر دیے گئے۔ بعد کے تمام مشاہد میں شریک رہے۔ فتح مصر میں بھی شامل تھے اور جنگِ ایران میں بھی۔ بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے بیعتِ رضوان میں انہوں نے ہی سبقت کی تھی لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ ابوسنان اسدی تھے۔
زمانۂ فتنہ میں بالکل الگ رہے۔ نہ حضرت علیؓ کا ساتھ دیا نہ معاویہؓ کا۔ بڑی عمر میں آنکھوں نے جواب دے دیا تھا۔ ۷۳ھ میں محاصرہ مکہ کے زمانہ میں حجاج بن یوسف ثقفی کے کسی سپاہی کا نیزہ ان کے پاؤں میں لگ گیا۔ اس زخم سے جانبر نہ ہو سکے۔ حجاج بھی عیادت کے لئے حاضر ہوا، اور پوچھا کہ کس نے مارا؟ بولے کہ جس نے حدودِ حرم میں لوگوں کو اسلحہ رکھنے کی اجازت دی۔

(۶) ابوسفیان صخر بن حربؓ۔ امیر معاویہؓ کے والد۔ فتح مکہ میں مسلمان ہوئے۔ طائف کے غزوہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھے۔ اسی میں ایک آنکھ تیر سے زخمی ہوئی۔ دوسری معرکۂ یرموک میں شہید ہوئی جبکہ یہ اپنے بیٹے یزید کے علم کے نیچے جہاد کر رہے تھے۔ مدینہ میں ۳۱ھ میں وفات پائی۔

(۷) ابوقحافہؓ حضرت ابوبکرؓ کے والد۔ فتح مکہ میں مسلمان ہوئے تھے۔ خلیفۂ اوّل کی یہ خصوصیت یہاں ذکر کے قابل ہے کہ ان کی چار پشتیں صحابی ہیں۔ وہ خود۔ اُن کے باپ۔ اور اُن کے بیٹے عبدالرحمٰن اور پوتے محمد بن عبدالرحمٰن۔
اسلام لانے کے وقت ابوقحافہ کی بصارت جا چکی تھی اور تمام بال سفید ہو چکے تھے۔ تاہم حضرت ابوبکرؓ کے انتقال کے وقت تک زندہ تھے۔ ان کے ترکہ میں سے ایک سدس ان کو بھی ملا تھا۔

جس کو ان کی اولاد پر مسترد کر دیا۔ ۵۴ھ میں انتقال کیا۔ عمر ۷۰ سال کی تھی۔

(۸) حسان بن ثابتؓ انصاری خزرجی۔ شاعر دربار نبوی۔ بڑی عمر پائی۔ ساٹھ سال جاہلیت میں گذارے اور اسی قدر اسلام میں۔ ۵۴ھ میں وفات ہوئی۔ یہی ان کی خاندانی عمر تھی۔ امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ ان کے باپ اور دادا ہر ایک نے اسی قدر طویل عمریں پائی تھیں۔

جب بڑھاپے میں بینائی سے معذور ہو گئے تھے، کبھی کبھی حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اشعار سناتے۔ کسی نے کہا کہ اُمّ المومنین! یہ تو ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے آپ پر تہمت تراشی تھی۔ اور جن کی نسبت قرآن میں ہے کہ ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔ ان کو کیوں یہاں آنے کی اجازت دیتی ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ نابینائی سے بڑھ کر کونسا عذاب ہوگا۔ لیکن اصل یہ ہے کہ قرآن میں عذاب کی وعید اس کے لئے ہے جو اس تہمت کا بانی تھا۔ (والذی تولیٰ کبرہٗ منھم لہٗ عذابٌ عظیم) اور یہ راس المنافقین عبداللہ بن سلول تھا۔ چنانچہ جو جو اس تہمت میں شریک تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے توبہ کی توفیق بخشی لیکن نہ بخشی تو ابن سلول کو جو نفاق میں مرا اور ایسا مغضوب و معتوب ہوا کہ اس کی قبر کے پاس کھڑے ہونے کی بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو اجازت نہ دی۔

(۹) کعب بن مالک انصاریؓ۔ دربار نبوی کے دوسرے شاعر۔ جنگ اُحد میں اُن کے گیارہ زخم آئے تھے اس کے بعد بھی تمام غزوات میں شریک رہے۔ بدر کی شرکت میں اختلاف ہے۔ قرآن کریم میں جن تین شخصوں کا ذکر ہے کہ غزوۂ تبوک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نہ گئے اور لیت و لعل میں رہ گئے ان میں سے ایک یہ بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بوجہ صدق کے اُن کی توبہ قبول کر لی۔ ۵۰ھ میں مدینہ میں انتقال فرمایا۔ اس سے کچھ زمانہ پہلے آنکھیں جاتی رہی تھیں۔

(۱۰) ابن اُم مکتومؓ۔ ان کا نام عمرو بن قیس ہے۔ اُمّ المومنین حضرت خدیجہؓ کے ماموں زاد بھائی ہوتے تھے بصارت سے معذوری کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کو مدینہ میں مؤذن مقرر فرمایا تھا عاقل و مدبر ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کہیں باہر کسی غزوہ وغیرہ کے لئے جاتے تو اکثر انہیں کو اپنا قائم مقام کر جاتے۔ جہاد کے شوق میں جنگ قادسیہ میں جا کر شرکت کی۔ کیونکہ عرب عجم کا سب سے بڑا مقابلہ وہی تھا۔ ایک طرف تمام عجمی شہزادے اُمرا اور رؤسا تھے۔ دوسری

طرف سے ملک عرب کے سارے بہترین لخت جگر حضرت سعدؓ نے ان کو علمبردار مقرر کر دیا۔ ایک بیان یہ بھی ہے کہ وہیں شہید ہو گئے۔ لیکن اکثر مورخ لکھتے ہیں کہ مدینہ میں آکر ۲۳ھ میں انتقال فرمایا۔

عبس وتولی ان جاءہ الاعمیٰ (۸۰-۱-۲) الخ انہی کے متعلق نازل ہوئی۔ شان نزول یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صنادید قریش۔ عتبہ، شیبہ، ابوجہل۔ امیہ بن خلف اور ولید بن مغیرہ وغیرہ کا مجمع تھا۔ اور آپ ان کو اسلام کی دعوت دے رہے تھے۔ اسی گفتگو میں تھے کہ ابن ام مکتوم وہاں پہنچ گئے اور کہا کہ یا محمدؐ علمنی مما علمک اللہ۔ ان کی یہ بات اُس وقت بے موقع معلوم ہوئی۔ اس لئے آپ نے ترش رُو ہو کر منہ پھیر لیا۔ اس پر یہ سورہ اتری جس میں پیغمبر پر عتاب کیا گیا۔[1]

مفسرین کا بیان یہی ہے امام رازیؒ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ ابن مکتوم اگرچہ نابینا تھے لیکن باتیں تو سن سکتے تھے۔ آنحضرتؐ کے اندازِ خطاب سے ان کو سمجھنا چاہیے تھا کہ کس توجہ کیساتھ تبلیغ میں مصروف ہیں۔ ایسی حالت میں دخل دینا مناسب نہ تھا۔ علاوہ بریں وہ اسلام لا چکے تھے اور ضروریات دین سے واقف تھے۔ بخلاف اس کے سرداران قریش کافر تھے۔ اس لئے اصولاً ان کو مسلمان بنانا زیادہ اہم تھا۔ خاص کر ایسی حالت میں جبکہ ان کے اسلام لانے سے تقریباً سارے قریش کے مسلمان ہو جانے کی توقع تھی۔ لہٰذا ابن ام مکتومؓ بیچ میں پھیر کر بہت بڑے کار خیر اور ادائے فرض نبوت میں خلل اندازی کے مرتکب ہوئے۔ پھر اگر پیغمبر نے ان کی اس حرکت پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو کیا بیجا کیا اور کیوں مورد عتاب ہوئے اس کا انہوں نے خود ہی جواب بھی دیا ہے جو حسب معمول اس قدر قوی نہیں جس قدر کہ اعتراض، کہتے ہیں کہ اگرچہ واقعہ کی ظاہری شکل کا مقتضا تو یہی تھا لیکن چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ سلوک سے فقرا پر اغنیاء کی ترجیح کا شبہ ہوتا تھا جس سے ان کی دل شکنی کا احتمال تھا۔ اس لئے عتاب نازل ہوا۔ کیونکہ نبیوں کا دستور العمل یہ ہے "ولا تطرد الذین یدعون ربھم" یہ بھی ممکن ہے کہ حضور انورؐ کے قلب میں اس وقت ابن ام مکتوم سے بوجہ بعد قرابت اور نابینائی کے نفرت اور ان کفار کی طرف سبب اُن کی ریاست اور قرابت قریبہ کے رغبت پیدا ہو گئی ہو، اس لئے عتاب ہوا۔ یعنی یہ عتاب تادیب د ترش روئی اور اعراض سے ابن ام مکتوم کی زجر و توبیخ، پر نہیں بلکہ تادب کے لئے تھا۔

---

[1] یہ قصہ ہی غلط ہے دیکھئے آیات (۸۰-۱/۲۲-۱۱) (طلوع اسلام)

(۱۱) ابو اسید ساعدی انصاریؓ۔ بدر و احد، ہر غزوہ میں حاضر رہے۔ بدریین میں سے سب سے آخر میں ۶۰ھ میں انتقال فرمایا۔ عمر ۷۵ سال تھی۔ بڑھاپے میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔

(۱۲) فُدیکؓ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دونوں آنکھیں سفید تھیں اور مطلق سوجھتا نہ تھا۔ حضورؐ نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ کہا سانپ کے انڈوں پر پاؤں پڑ گیا تھا۔ غالباً اسی کا اثر ہے آپ نے اپنے مبارک لبوں کی تری دونوں آنکھوں میں لگا دی اچھے ہو گئے اسی سال کی عمر تک سوئی میں تاگا ڈال لیتے تھے۔

اسی ذیل میں یہ واقعہ بھی ذکر کے قابل ہے کہ جنگِ اُحد میں حضرت قتادہ بن نعمانؓ کو ایک ایسا تیر لگا کہ ان کی آنکھ نکل پڑی۔ وہ اس کو ہاتھ میں لئے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ نے دعا کی اور آنکھ اپنے دستِ مبارک سے ان کے حلقہ چشم میں رکھ کر جما دی۔ وہ ایسی درست ہو گئی کہ زندگی بھر بہ نسبت دوسری آنکھ سے زیادہ خوش نظر اور خوش منظر رہی بلکہ بعض مورخ لکھتے ہیں کہ ان کی نسل میں بھی اس کا اثر باقی رہا۔

(۱۳) مخرمہ بن نوفلؓ۔ سردارانِ قریش میں سے تھے۔ فتح مکہ کے دن اسلام لائے۔ اور جنگِ حنین میں رسول اللہؐ کے ہم رکاب شریک ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے دفترِ فوج کی ترتیب میں ان سے بھی مدد لی۔ کیونکہ انساب اور قبائلِ عرب سے خوب واقف تھے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ ۵۴ھ میں مدینہ میں انتقال کیا۔

(۱۴) براء بن عازب انصاریؓ۔ جنگِ بدر میں جا رہے تھے لیکن کمسنی کی وجہ سے راستے سے واپس کئے گئے۔ پھر ۲۴ھ میں ملک رے انہیں کے ہاتھ سے فتح ہوا۔ جب آنکھیں جاتی رہیں تو کوفہ میں سکونت گزیں ہو گئے وہیں ۷۲ھ میں وفات پائی۔

(۱۵) عبد اللہ بن ارقمؓ۔ فتح مکہ میں اسلام لائے۔ آنحضرتؐ کے اور ان کے بعد شیخین کے کاتب رہے۔ حضرت عمرؓ اور عثمانؓ کے عہد میں ایک مدت تک بیت المال ان کے سپرد رہا۔ آخر میں نابینا ہو گئے تھے۔ ۴۴ھ کے حدود میں گذر گئے۔ حضرت عثمانؓ نے ایک بار ان کو تیس ہزار درہم انعام میں عطا کئے لیکن لینے سے انکار کیا۔

(۱۶) عبد اللہ بن علقمی خزاعیؓ بیعتِ رضوان نیز دیگر غزوات میں بھی شریک رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی وفات کے بعد مدینہ چھوڑ دیا۔ جب کوفہ آباد ہوا تو وہاں سکونت اختیار کرلی۔ بڑی عمر پائی بڑھاپے میں آنکھیں جاتی رہیں۔ کوفہ میں سب سے آخری صحابی یہی رہ گئے تھے۔ ۸۶ھ میں انتقال فرمایا۔

(۱۴) عتبہ بن مسعود ہذلیؓ: دونوں ہجرتوں میں شریک تھے۔ اور کسی غزوہ سے غیر حاضر نہ ہوئے تھے۔ مدینہ میں انتقال فرمایا۔ حضرت عمرؓ نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ گو عمر زیادہ نہ پائی لیکن آنکھوں نے جواب دے دیا تھا۔

(۱۵) امیہ بن الاسکر کنانیؓ: زمانہ جاہلیت میں اپنے قبیلہ بنی لیث کے سردار تھے۔ اسلام لاکر مدینہ میں رہ گئے۔ آنکھوں سے معذور تھے۔ ان کے ایک ہی بیٹا تھا کلاب۔ جہاد کے شوق میں اس نے ابوموسیٰ اشعری کی فوج میں اپنا نام لکھا لیا۔ اور عراق کو چلا گیا۔ وہ یہاں اور خاص کر بڑھے نابینا باپ کو فرمانبردار اور خدمت گزار بیٹے کے چلے جانے سے بڑی بے قراری ہوئی۔ خلیفۂ وقت حضرت عمرؓ کے پاس آکر روئے اور درخواست کی کہ کلاب کو واپس بلا دیجئے۔ چند اشعار بھی ان کو سنائے۔ جو اس قدر درد ناک تھے کہ حضرت عمرؓ آبدیدہ ہوگئے۔ آخر میں یہ دھمکی بھی تھی کہ اگر نہ بلایا تو بددعا کروں گا۔ حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰ کو فوراً حکم بھیجا کہ کلاب کو واپس کردو۔ جب وہ آئے تو پہلے خلیفہ ہی کے پاس حاضر ہوئے۔ انہوں نے پوچھا کہ تم اپنے باپ کی کیا خدمت کرتے تھے کہ وہ تمہارے لئے اس قدر بیتاب ہیں۔ کہا کہ میں ہی ان کے سارے کاموں کا کفیل تھا اور جب وہ پینے کے لئے دودھ مانگتے تھے تو سب سے بہتر اونٹنی کو منتخب کرکے اس کے تھن کو پانی سے دھوتا کہ دودھ ٹھنڈا ہو جائے پھر نکال کر لاتا اور پلاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے امیہ کو بلایا پوچھا کہ کیا حال ہے؟ بولے کہ بس آرزو یہی ہے کہ کلاب کو پاؤں سینہ سے لگاؤں اور سونگھوں[1]

حضرت عمرؓ نے کلاب کو اشارہ کیا۔ وہ اسی طریقہ سے اونٹنی کا دودھ نکال کر لائے جس طریقہ سے نکالا کرتے تھے۔ جس وقت اس کو امیہ کے ہاتھ میں دیا۔ اور انہوں نے منہ سے لگایا تو کہا کہ واللہ اس پیالے سے مجھے کلاب کے ہاتھوں کی مہک آتی ہے۔ فرط رقت سے حضرت عمرؓ اور حاضرین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ پھر انہوں نے کلاب کو ملا دیا وہ لپٹ گئے اور بیٹے کو لے کر گھر آئے۔ حضرت عمرؓ نے کلاب سے کہا کہ تم اپنے والدین کی خدمت ہی کو جہاد سمجھو۔ چنانچہ ان دونوں

[1] عرب اپنے بچوں کو سونگھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو اپنی ریحانہ فرمایا

کی زندگی تک وہ کسی جنگ میں شامل نہ ہو سکے۔

صحابہ کرام میں سے صرف انہیں حضرات کے حالات ملے۔ یقیناً اور لوگ بھی ہوں گے مگر ہم نے استیعاب کی کوشش بھی نہیں کی۔

زمانہ مابعد میں تاریخ اسلام میں نابیناؤں کی ایک کثیر تعداد ملتی ہے۔ مگر ان میں سے بادشاہوں شاہزادوں۔ اُمراء اور وزراء کے حالات میں کوئی خاص دل کشی نظر نہیں آتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اندھا ہونے یا کر دیئے جانے کے بعد اس گروہ کو اپنی گذشتہ عزت و شوکت اور دولت و راحت کا اس قدر رنج و غم رہتا تھا کہ ساری انسانی خوبیاں اور طبعی لطافتیں جاتی رہتی تھیں اور خوش مزاجی انکے پاس بھی نہیں پھٹکتی تھی۔ اس لئے ان کے خشک تذکرہ کو چھوڑ دینا پڑا۔

مفسرین و محدثین، علماء و فقہاء مصنفین و مؤلفین اور ادباء و شعراء کا بھی بڑا گروہ ہے۔ لیکن ان میں سے بھی ہم صرف اُن بعض کے حالات لکھتے ہیں جن کی زندگی میں کوئی تاریخی دلچسپی یا ادبی لطافت ہے۔

(۱) عبدالصمد بن علی۔ ان کے باپ، دادا، پردادا اور سکڑ دادا سب آخر میں نابینا ہو گئے تھے پھر یہ کیسے بچتے۔ ان کی تاریخ اعجوبہ روزگار ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ان کی ولادت اور ان کے بھائی محمد بن علی اوّلین خلیفہ عباسی سفاح کے باپ کی ولادت میں پورے ۴۴ سال کا فصل ہے یہ ۱۰۶ھ میں پیدا ہوئے تھے اور محمد مذکور ۶۲ھ میں۔ پھر محمد نے ۱۲۶ھ میں وفات پائی اور عبدالصمد نے ۱۸۵ھ میں۔ دونوں کی وفات میں ۵۹ سال کا فرق ہے اس قدر بعد زمانی ایک ہی باپ کی دو اولاد میں مشکل سے مل سکتا ہے۔

دوسرا امر یہ ہے کہ یزید بن معاویہ ۵۰ھ میں امیر الحج تھا اور عبدالصمد ۱۵۰ھ میں۔ حالانکہ دونوں عبد مناف سے ایک ہی درجہ میں پڑتے ہیں۔ یعنی یزید بن معاویہ بن ابی سفیان بن حرب بن امیہ بن عبد شمس بن مناف۔ اور عبدالصمد بن علی بن عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف۔

تیسری بات یہ ہے کہ پانچ عباسی خلفاء سفاح، منصور، مہدی، ہادی اور ہارون الرشید کے زمانے دیکھے چنانچہ ایک بار ہارون کے دربار میں عجیب اجتماع تھا۔ خلیفہ کا چچا سلیمان موجود تھا، اور سلیمان کا چچا عباس اور عباس کے چچا عبدالصمد تھے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ خلاف معمول ان کے دودھ ہی کے دانت آخر عمر تک رہے دوسرے دانت

نہیں نکلے۔

مہدی اور ہارون کے زمانوں میں دمشق اور مکہ وغیرہ مختلف امارتوں کے عہدوں پر رہے۔ بنی عباس میں ان کا خاص احترام تھا۔ بصرہ میں انتقال کیا۔

(۲) قتادہ بن دعامہ۔ حفظ میں ضرب المثل تھے، جو بات سن لی کبھی نہ بھولے۔ روایتِ حدیث میں کسی شیخ سے کبھی یہ نہ کہا کہ دوبارہ فرمایئے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے ان کی بہت مدح لکھی ہے اور تفسیر اور اختلافِ علماء کا عالم اور فقیہ و حافظِ حدیث تسلیم کیا ہے۔ ان کے حافظہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ میں نے ایک بار صحیفہ جابر اُن کے سامنے پڑھا وہ سارے کا سارا ان کو ازبر ہوگیا یہ ائمہ تابعین مثلاً سعید بن المسیب اور امام شعبی وغیرہ کے شاگرد تھے۔ ان سے کئی اربابِ صحاح ستہ نے روایت لی ہے ۔ ۱۱۷ھ میں انتقال فرمایا۔ آنکھیں ایام طفلی ہی میں جاچکی تھیں۔

(۳) محمد بن حازم ابو معاویہ ۱۱۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ چار سال کی عمر میں بینائی سے محروم ہو گئے۔ امام اعمشؒ کے پاس بیس سال رہے اور انہیں سے علم حدیث اخذ کیا۔ ہشام بن عروہ سے بھی روایت کرتے ہیں۔ ائمہ حدیث مثلاً امام احمد بن حنبلؒ اور یحییٰ بن معین وغیرہ نے ان سے روایت کی ہے۔ حافظِ حدیث اور ثقہ تھے۔ اور بغداد میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ۱۹۴ھ میں وفات پائی۔ ہارون الرشید نے علویہ کی طرف سے اپنی سلطنت کے لئے خطرہ دیکھ کر ایک بار حکم دیا کہ جو شخص حضرت علیؓ کی خلافت کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرے گا میں اس کو قتل کردوں گا۔ ابو معاویہ نے کہا کہ بنی تیم کے حضرت ابوبکرؓ، بنی عدی کے حضرت عمرؓ، بنی امیہ کے حضرت عثمانؓ پھر اگر حضرت علیؓ خلیفہ نہ تسلیم کئے گئے تو خلافتِ راشدہ میں بنی ہاشم کا کوئی حصہ نہ ہوا۔ یہ سُن کر ہارون سوچنے لگا۔ اس کے بعد کہا، بیشک ٹھیک ہے اب سے جو کوئی حضرت علیؓ کی خلافت کا منکر تھا اس کو قتل کی سزا دی جائے گی۔

(۴) ابو الحسن منصور بن اسماعیل ضریر۔ امام شافعی کے شاگردانِ خاص میں سے تھے۔ متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اہلِ مصر ان کا بہت احترام کرتے تھے۔

ایک بار وہاں سخت قحط پڑا۔ فاقہ سے تنگ آکر انہوں نے اپنی چھت پر کھڑے ہو کر پکارا کہ لوگو! میری امداد کرو۔ تھوڑی دیر میں ان کے دروازہ پر سیکڑوں اونٹ غلہ سے لدے ہوئے آگئے۔

شعر بھی کہتے تھے۔ نہایت لطیف اور حکیمانہ۔
پہلے فوج میں ملازم تھے۔ جب بصارت سے معذور ہوگئے تو تفقہ اختیار کیا۔ ۱۸۸ھ میں مصر میں گذر گئے۔

(۵) محمد بن ہذیل علاف بصری معتزلی جماعت متکلمین میں ممتاز اور ان کے گروہ کا جو اُسی کی نسبت سے ہُذلی بولے جاتے ہیں امام ہے۔
جہم بن صفوان امام فرقۂ جہمیہ جنت اور دوزخ کے فنا ہو جانے کا قائل ہے[1]۔ علاف اس حد تک تو نہیں پہنچا لیکن اُن کے ایک ہی حالت پر دوام کا وہ قائل نہیں ہے بلکہ کہتا ہے کہ آخر میں اہلِ جنت پر ایک سکون امن طاری ہو جائے گا جس میں تمام لذتیں مجتمع ہوں گی۔ اسی طرح اہلِ نار پر بھی ایک خمود ہوگا۔ جس میں ہر قسم کے آلام ہوں گے مگر یہ ایسی بات ہے کہ قرآن کہیں اس کی تائید نہیں کرتا بخلاف جہم بن صفوان کے قول کے۔
خلیفۂ مامون معتزلی اس کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ ایک دن جب وہ دربار میں گیا۔ تو اپنے حاجب سے پوچھا کہ دروازہ پر کون کون لوگ ہیں؟ اس نے کہا علاف معتزلی۔ عبداللہ بن اباض خارجی اور ہشام بن کلبی رافضی۔
مسکرا کر بولا تو پھر جہنم کے سارے سرغنے جمع ہیں۔

---

[1] یہ بحث بہت لطیف ہے اگرچہ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں تاہم ایک مختصر توضیح نامناسب نہ ہوگی۔ قرآن کریم میں جنت اور دوزخ کے لئے خلود اور ابدیت کا لفظ مستعمل ہوا ہے۔ اس وجہ سے اہلِ سنت تمام تر ان کے خالد و مخلد ہونے کے قائل ہیں لیکن جہم بن صفوان ان کے خلود کو اس قدر دائمی نہیں مانتا جس قدر کہ ان کے خلق کی سرمدیت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک وقت ان کا فنا ہو جانا لازمی ہے یعنی کل شیٔ ھالک الا وجھہ ($\frac{۲۸}{۸۸}$) میں وہ جنت و نار کو بھی منسلک سمجھتا ہے۔ سورۂ ہود میں جنت و نار کی مدتِ خلود میں دونوں جگہ۔ الا ما شاء ربک کا استثنا ہے جو اس کے قول کا موید ہے۔ ($\frac{۱۱}{۱۰۷،۱۰۸}$)

مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ آخر عمر میں اس کی بصارت اور اس کے ساتھ بصیرت بھی جاتی رہی۔ لوگ کہتے تھے کہ سٹھیا گیا ہے۔ ۳۴۶ھ میں مر گیا۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کے ہر طبقہ میں ایسے لوگ ملتے ہیں جن کی عقلیں کبرسنی میں ماری پڑیں۔ بجز محدثین کی جماعت کے۔ حالانکہ سب سے زیادہ طویل عمریں انہیں لوگوں نے پائیں۔ میرے خیال میں یہ اسی تقویٰ اور ورع کا اثر تھا جو حدیث کے علم و عمل سے ان میں پیدا ہو جاتا تھا۔

(۶) عبداللہ بن محمد شافعی سلطان نور الدین زنگی۔ الشہید نیز سلطان صلاح الدین ایوبی دونوں کے درباروں میں بڑی عزت رکھتے تھے اور چونکہ یہ دونوں شافعی تھے اس وجہ سے امام مذکور ان کے عہد میں صاحب فتویٰ اور قاضی القضاۃ تھے۔ متعدد تصانیف چھوڑی ہیں، جو شافعیہ میں مقبول ہیں ۵۸۵ھ میں مر گئے۔

آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ اس وقت ایک رسالہ اس امر کے اثبات میں لکھا کہ اندھا شخص قاضی ہو سکتا ہے چنانچہ سلطان صلاح الدین نے انہیں کے فتوے کے مطابق ان کو اُن کے منصب پر بحال رہنے دیا۔ لیکن دوسرے لوگوں نے اس مسئلہ میں ان سے اختلاف کیا ہے اور عام طور پر اہل علم اسی بات کے قائل ہیں کہ نابینا کو قاضی نہیں ہونا چاہیئے، کیونکہ وہ فریقین نیز گواہوں کی شناخت میں غلطی کر سکتا ہے۔

(۷) شافع بن علی بن عباس بن اسمٰعیل بن عساکر عسقلانی سیاہ مصریہ کے میر منشی اور علم و ادب میں صاحب کمال تھے۔ صلاح الدین صفدی نے تاریخ اور علوم عربیہ میں ان کی تقریباً ۲۰ تصنیفات نام بنام گنائی ہیں۔ ایک دیوان شعر بھی ہے۔

جنگِ حمص میں کان کی جڑ میں ایک تیر لگا تھا۔ اس سے آنکھیں جاتی رہیں۔ اس کے بعد سے خانہ نشین ہو گئے۔ کتابوں کے بڑے شائق تھے۔ ۸ الماریاں اُن سے بھری ہوئی رکھتے تھے اور اپنے مصاحبین اور شاگردوں سے پڑھوا کر سنا کرتے تھے جب ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ میں لیتے تو بتا دیتے کہ یہ فلاں کتاب ہے جو فلاں زمانے میں میں نے فلاں شخص سے اس قیمت پر خریدی تھی۔ ۷۳۰ھ میں انتقال کیا۔

(۸) علی بن احمد آمدی۔ یہ بھی بڑے ادیب۔ فاضل اور کتب کے عاشق تھے۔ اور فن تعبیر خواب کے امام۔ جواہر التبصیر فی علم التعبیر اُن کی مشہور تصنیف ہے، کتابوں کی تجارت کرتے تھے اور اپنے کتب خانہ کے ایک ایک نسخہ سے واقف تھے۔ جب ضرورت پڑتی تو نکال کر لاتے اگر کسی کتاب کی متعدد جلدیں ہوتیں اور ایک خاص جلد درکار ہوتی تو اسی پران کا ہاتھ پڑتا تھا۔

ہلاکو خان کا پڑپوتا سلطان غازان خان جو مسلمان ہو گیا تھا جب بغداد میں مدرسہ مستنصریہ کو دیکھنے کے لئے آنے والا تھا تو اس کی خوب آرائش کی گئی تھی۔ علماء اپنے اپنے مسندوں پر بیٹھے تھے اعیان واکابر بغداد بھی سلطان کے استقبال کے لئے بلائے گئے تھے جن میں علی آمدی بھی تھے۔

جب سلطان آیا تو اس کے ساتھ کے مغولی اُمراء سب ان سے مصافحہ کر کر کے گذرتے گئے۔ لیکن یہ کسی کے لئے تعظیماً کھڑے نہیں ہوئے مگر جس وقت سلطان نے ہاتھ ملایا تو بلا بتائے ہوئے سروقد کھڑے ہو گئے اور ترکی۔ فارسی اور عربی زبانوں میں اس کو دعائیں دیں۔ اس کو ان کی فراست اور لیاقت پر تعجب ہوا، اور یہ معلوم کر کے اور بھی خوش ہوا کہ یہ رومی زبان بھی بے تکلف بولتے ہیں۔ خلعت اور انعام عطا کیا اور تین سو درہم ماہانہ گزارہ کے لئے مقرر کر دیا۔ بغداد کے علماء اور رؤسا نیز خواتین مغول سب ان کی عزت کرتے تھے۔ باوجود فراغت کے بھی یہ دن رات اپنے تجارتی مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔ ۷۱۲ھ میں فوت ہوئے۔

(۹) یعقوب بن داؤد خلیفہ مہدی کا مشہور وزیر جو وزارت نہیں بلکہ خلافت کرتا تھا۔ دشمنوں نے مہدی کے کان میں پھونک دیا کہ یہ علویہ کی طرف میلان رکھتا ہے۔ اس نے اس کو ایک حسین و جمیل کنیز عطا کی۔ جس کو نہایت خوش ہو کر یہ اپنے گھر لے آیا۔ دوسرے دن جب دربار میں گیا تو مہدی نے تنہائی میں لے جا کر کہا کہ میرا ایک ضروری کام ہے وہ کر دو۔ اس نے کہا کہ میں تو حضور کا غلام ہوں۔ جو حکم ہو گا بجا لاؤں گا۔ کہا کہ نہیں میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ۔ اس نے قسم کھائی۔ فرمایا کہ فلاں علوی کی طرف سے مجھے خطرہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس کا خاتمہ کر دو۔ بولا کہ یہ کونسی بڑی بات ہے۔ اپنے گھر آ کر رات کو اس علوی کو بلایا اور کہا کہ میں تم کو قتل کر دوں گا۔ اس نے جواب دیا کہ میں بے بس ہوں اور آپ صاحب اختیار۔ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ سوچ

لیجئے کہ رسول اللہؐ کی اولاد کا خون کر کے قیامت میں اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے۔
یعقوب پر اس بات کا اثر ہوا۔ اس نے کہا کہ اچھا مناسب یہ ہے کہ تم راتوں رات یہاں سے غائب ہو جاؤ، تاکہ خلیفہ کو میں مطمئن کر سکوں۔ وہ علوی نکل گیا۔ اُدھر کنیز نے فوراً خلیفہ کو پرچہ بھیج کر اس کیفیت سے آگاہ کیا۔ اُس نے سوار دوڑائے جو علوی کو گرفتار کر لائے اور محل کے ایک حجرہ میں بند کر دیا۔

صبح کو حسبِ معمول جب وزیر یعقوب وہاں پہنچا تو خلیفہ نے اس سے پوچھا کہ تم نے کیا کیا؟ کہا حکم کی تعمیل کر دی۔ بولا کہ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ۔ اس نے یہ بھی کیا۔ مہدی نے اشارہ کیا۔ خدام نے علوی کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ یعقوب مبہوت رہ گیا۔ مہدی نے کہا کہ اب تمہارا خون میرے لئے حلال ہے۔ لیکن مجھے قتل کی عادت نہیں ہے اس لئے حکم دیتا ہوں کہ تم تہ خانے میں قید کر دیئے جاؤ۔

پندرہ سال تک یعقوب ایک تہ خانے میں بند رہا۔ بینائی جاتی رہی۔ اس کے بعد ہارون کے عہد میں اس کے حکم سے آزاد کیا گیا۔ جب دربار میں سلام کے لئے حاضر ہوا تو ہارون نے کہا کہ میں نے اپنے ایک بچہ کو کل گود میں اٹھا لیا تھا اُس وقت مجھ کو یاد آگیا کہ بچپن میں تم مجھ کو اسی طرح گود میں کھلایا کرتے تھے اس لئے میں نے تم کو رہا کیا۔ اب تمہارا گذارہ مقرر کرتا ہوں جہاں چاہو رہو۔ اس نے مکہ مکرمہ میں اقامت اختیار کی۔ وہیں ۱۸۲ھ میں گذر گیا۔

(۱۰) بشار بن برد۔ مادر زاد اندھا عربی کا نامور شاعر۔ ہزاروں قصیدے لکھے جن میں سے اکثر ہجو میں تھے کہا کرتا تھا کہ پہلے میں نے جریر کی ہجو لکھی تھی۔ مگر اس نے کم سن سمجھ کر میری طرف توجہ نہ کی ورنہ فرزدق کی جگہ میں لیتا۔

ایک بار مہدی کی تعریف میں قصیدہ کہا۔ اس نے التفات نہ فرمایا۔ اس پر اس کی ہجو کہی۔ وزیر یعقوب بن داؤد نے خلیفہ کو سنایا وہ سخت برہم ہوا۔ چنانچہ جب بصرہ میں آیا تو بشار کو گرفتار کر کے شراب خواری کے الزام میں اس قدر پٹوایا کہ وہ تلف ہو گیا۔ یہ واقعہ ۱۶۹ھ میں ہوا۔

بشار ایک بار گلی سے نکل کر جب سڑک پر پہنچا تو کسی نے کہا ذرا رک جاؤ بڑا اژدھام ہے۔ لوگ ایک جنازہ بڑی تیزی سے لئے جا رہے ہیں۔ بولا کہ کیا کہیں سے چرا کر بھاگے جاتے ہیں؟

اس کے غلام نے ایک بار حساب پیش کیا جس میں دس درہم آئینہ کی جلا کی اجرت بھی درج تھی۔ کہنے لگا کہ عجیب! اندھا اور آئینہ کی جلا کی اجرت! واللہ اگر سورج بھی زنگاری ہو جائے اور اس کی صیقل کی اجرت دس درہم مجھ سے مانگی جائے تو میں نہیں دوں گا۔

(۱۱) ابن علاف ضریر شاعر، خلیفہ معتضد کا ندیم تھا۔ اس نے ایک بلی پالی تھی جو ہمسایوں کے کبوتر کھا جاتی تھی۔ ایک دن کسی نے اُسے مار کر پھینک دیا۔ اس کا مرثیہ لکھا اور دلچسپ لکھا بعض لوگ کہتے ہیں کہ بلی کا نہیں بلکہ وزیر ابن فرات کا نوحہ ہے جو خلیفہ مقتدر کے حکم سے قید خانہ میں مارا گیا تھا۔ خوف کی وجہ سے اس نے بلی سے تعریض کی اور نام نہ لے سکا۔

(۱۲) ربیعہ بن ثابت۔ اندھا خوشگوار شاعر، خلیفہ مہدی کا مداح تھا۔
ایک بار عباس کی مدح میں جو خلیفہ سفاح کا بھائی تھا۔ نہایت بلیغ قصیدہ سنایا۔ اس نے صرف دو دینار انعام دیا۔ ربیعہ نے ناراض ہو کر ہجو کہی۔
عباس خلفاء عباسیہ کا بزرگ تھا اور دربار میں اس کی بڑی عزت تھی غضبناک ہو کر ہارون الرشید کے پاس جو اس وقت خلیفہ تھا پہنچا اور ربیعہ کی شکایت کی۔ اس نے فوراً ربیعہ کو بلوایا اور چاہا کہ قتل کر دے ربیعہ نے کہا کہ پہلے قصیدہ تو سُن لیا جائے۔ کہا کہ سناؤ جب سُنا تو بہت پسند کیا پھر پوچھا کہ اس کا تم کو کیا صلہ ملا۔ اس نے کہا کہ دو دینار۔ یہ سن کر وہ عباس کی طرف مخاطب ہوا اور کہا کہ اس کا نہیں بلکہ یہ آپ کا قصور تھا۔ پھر ربیعہ کو تیس ہزار درہم عطا کئے اور کہا کہ خبردار کبھی اپنے اشعار میں ان کا ذکر نہ تصریحاً کرنا نہ تعریضاً۔

(۱۳) علامہ ابوالبقاء عکبری۔ بچپن میں چیچک نکلی تھی۔ اسی میں آنکھیں جاتی رہیں۔ حافظہ نہایت قوی تھا تحصیلِ علوم کر کے مختلف فنون میں امامِ وقت ہو گئے، تفسیر، حدیث، فقہ، فرائض، حساب، منطق، ادب، نحو اور لغت میں متعدد کتابیں املا کرائیں۔ جس فن میں کچھ لکھنا ہوتا تھا پہلے اس فن کی کتابیں پڑھوا کر سُنتے پھر لکھتے۔ بیشتر اُن کی بیوی ان کے پڑھ کر سناتیں۔ دیوانِ حماسہ اور مقاماتِ حریری کی بھی شرحیں لکھوائی تھیں۔ مگر حماسہ کی شرح میں تبریزی، اور مقامات کی شرح میں شریشی ان سے بڑھ گئے۔ لیکن دیوانِ متنبی کی جو شرح کی تھی اس میں کوئی ان سے فوقیت نہ لے جا سکا۔ چنانچہ وہی آج تک متداول اور مقبول ہے۔ ۶۱۶ھ میں وفات پائی۔

(۱۴) عبد الرحمن سہیلی اندلسی متوفی ۵۸۱ھ سیرۃ ابن ہشام کی مشہور شرح۔ روض الانف کے مصنف سیرت اور عربیت میں امام وقت تھے۔ تفسیر، ادب اور تاریخ میں کئی تصنیفیں چھوڑی ہیں۔
روض الانف میں سوا سو کتابوں سے زیادہ سے مدد لی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بڑی معلومات فراہم کی ہیں۔ ۱۷ سال کی عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔
جب ان کے کمال کا شہرہ ہوا تو مراقش میں قضا کے عہدہ پر بلوائے گئے۔ وہاں عزت کے ساتھ زندگی گزاری۔

(۱۵) عکوک شاعر متوفی ۲۱۳ھ پیدائشی اندھا اور مبروص تھا۔ امیر ابو دلف کی شان میں ایک قصیدہ کہا جو اپنی خوبی کی وجہ سے بغداد میں بہت مقبول ہوا۔ مامون کا عہد تھا۔ اس کا استبداد یہ گوارا نہ کر سکا کہ اس کے ایک خادم کی ایسی بلند رتبہ مدح کی جائے عکوک کو گرفتار کرایا۔ اور اس الزام پر کہ اس نے اپنے قصیدہ میں بعض ان صفتوں کو جو خالق کے ساتھ مخصوص ہیں مثلاً دماد پر اختیار اور حکومت ایک مخلوق کی طرف منسوب کیا ہے حکم دیا کہ زبان گدی سے کھینچ لی جائے اسی میں مر گیا۔
بعضوں نے کہا ہے کہ اگر یہی قصیدہ اس نے خود مامون کے ستائش میں لکھا ہوتا تو کوئی سزا نہ پاتا بلکہ صلہ ملتا۔

(۱۶) موئل کوفی متوفی ۲۰۷ھ جوانی میں نابینا ہو گیا۔ طبیعت رسا رکھتا تھا۔ شعر گوئی شروع کی ایک بار خلیفہ ابو جعفر منصور کے ولی عہد مہدی کی مدح میں قصیدہ کہہ کر سنایا۔ اُس نے بیس ہزار درہم انعام عطا کیا۔ منصور نے جب سُنا تو کہا کہ اس قدر فضول خرچی! فوراً پکڑ کر اس سے وہ رقم واپس لے لی۔ اور کہا کہ اس بھولے لڑکے کو تو نے جا کر دھوکا دیا وہ تیرے دامِ فریب میں آگیا۔
لیکن جب وہ قصیدہ سُنا تو پسند کیا اور باوجود اپنی جزرسی کے حکم دیا۔ کہ ربع یا اس کو چار ہزار درہم دیدو بقیہ بیت المال میں جمع کر دو۔
جب مہدی کا دور خلافت آیا تو موئل نے یہ سارا واقعہ لکھوا کر بھیجا وہ بہت ہنسا اور اس کو رقم واپس کر دی۔

(۱۷) ابو العیناء مشہور ادیب اور مؤرخ۔ نہایت ظریف الطبع۔ خلیفہ متوکل کا ندیم تھا۔ اس کے بے شمار

لطائف کتبِ محاضرات میں منقول ہیں لیکن اکثر فحش ہیں اس وجہ سے ترک کرنے پڑے۔ بقیہ میں سے بڑا حصہ اس زمانہ کے اُمرا اور اعیان کی ذات سے متعلق ہے جن کو ناظرین کے سمجھانے کے لئے اس عہد کے ہنگامی حالات اور اُمراء کے باہمی تعلقات پر اس قدر حاشیہ لکھنا پڑتا کہ یہ مختصر مضمون ان کا متحمل نہ ہوسکتا۔ لہٰذا صرف چند نوادر پر اکتفا کرنا پڑا۔

ایک بار کسی رئیس نے اس سے وعدہ کیا کہ میں سواری کے لئے ایک خچر تم کو دوں گا۔ کئی روز گزر گئے لیکن خچر نہ آیا۔ ایک دن راستہ میں ملاقات ہوگئی۔ اس رئیس نے سلام کیا اور خیریت پوچھی جواب دیا کہ خیریت ہے مگر بغیر خچر کے۔ وہ ہنسا اور گھر پہنچ کر فوراً بھیج دیا۔

امیر صاعد اسلام لانے کے بعد وزیر مقرر ہوا۔ ابوالعیناء اس سے ملنے گیا معلوم ہوا کہ ابھی نماز میں مصروف ہے۔ تھوڑی دیر انتظار کیا پھر پوچھا حاجب نے کہا ابھی فارغ نہیں ہوئے۔ کہا کہ ہاں کل جدید لذیذ" نیا نیا مسلمان ہوا ہے نماز کی لذت لے رہا ہے۔

ابو محمد ادیب سے چشمک تھی۔ ایک دن اس کے دروازے پر سے گذرا۔ سرسری طور پر اس کا حال بھی پوچھ لیا۔ لوگوں نے کہا کہ آپ کے حسبِ منشا ہے۔ بولا کہ تو پھر میں رونے اور چیخنے کی آواز کیوں نہیں سنتا۔

نجاح بن سلمہ وزیرِ مال کو غبن کے جرم میں خلیفہ نے موسیٰ بن عبدالملک کے حوالہ کیا کہ اس سے رقم مطلوبہ وصول کرے۔ موسیٰ نے اس قدر سخت شکنجہ میں کھینچا کہ نجاح ہلاک ہوگیا۔ ابوالعیناء سے کسی نے نجاح کا حال پوچھا تو کہا فوکزہ موسیٰ فقضیٰ علیہ (۲۸/۱۵)۔ دوسرے دن موسیٰ نے اس سے تہدید آمیز لہجہ میں کہا کہ میرے بارے میں اگر کچھ کہو گے تو سیدھا کر دوں گا۔ ابوالعیناء نے جواب دیا۔ اتریدان تقتلنی کما قتلت نفسا بالامس۔ (۲۸/۱۹)

علی بن جہم معتزلی نے ایک دن مجلس بحث ومناظرہ میں اس کو مخنث کہہ دیا۔ اس نے یہ آیت پڑھی
وضرب لنا مثلاً ونسی خلقہ۔ (۳۶/۷۸)

متوکل کے دربار میں ایک دن امیر سعید بن عبدالملک ابوالعیناء کی طرف دیکھ کر کسی بات پر مسکرایا۔ خلیفہ نے کہا کہ ابوالعیناء یہ کیا بات ہے کہ لوگ تم کو دیکھ کر ہنستے ہیں فوراً کہا۔ انّ الذین اجرموا کانوا من الذین اٰمنوا یضحکون۔ (۸۳/۲۹)

ابن مکرم وزیر کے یہاں دعوت تھی۔ تین بار ابو العیناء کو پانی ٹھنڈا ملا۔ چوتھی بار گرم۔ بولا کہ شاید تمہاری صراحی کو چوتھیا کا بخار آیا کرتا ہے۔

ایک بار ایک گلی سے گذرا۔ غلام نے کہا کہ ایک بکری کا بچہ بڑا فربہ ہے۔ کہا دیکھو گلی میں کوئی ہے تو نہیں۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ حکم دیا کہ پکڑ لو۔ پھر چادر میں لپیٹ کر بغل میں دبا لیا۔ اور گھر لاکر ذبح کر کے کھا گیا۔

دوسرے دن اس محلے کے رئیس کا ایک رقعہ پہنچا کہ کل سے ہمارا بزغالہ غائب ہے۔ یہاں کے بچے کہتے ہیں کہ آپ پکڑ کر لے گئے۔ لہٰذا حامل عریضہ کے ہاتھ واپس بھیج دیجئے۔ جواب لکھوایا کہ میرے محلے کے بڑے بوڑھے آپ کے حق میں کہا کرتے ہیں کہ ماہون ہے اور کذاب مگر میں نے ہمیشہ ان کی تکذیب کی۔ تعجب ہے کہ ایک حقیر جانور کے متعلق آپ میرے بارے میں اپنی گلی کے بچوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ خفیف ہو کر چپکا بیٹھ رہا۔

ایک دن متوکل کے دستر خوان پر کھانا کھانے بیٹھا۔ کسی نے اس کے آگے سے شوربہ کا پیالہ اٹھا کر سرکہ کی پیالی رکھ دی۔ جب لقمہ کھایا تو ترشی کی وجہ سے چہرہ ایسا بگڑا جس کو دیکھ سب لوگ ہنس پڑے۔ کہنے لگا کہ امیر المومنین میں معذور ہوں۔ معاذ اللہ غضب کی ترشی ہے کہ قلب سے ایمان کی حلاوت تک مٹ گئی۔

باپ کی طرف التفات کم کرتا تھا۔ اس نے کہا کہ دیکھو اللہ تعالیٰ نے اپنے شکر کے ساتھ والدین کا شکر بھی انسان پر فرض کیا ہے اور فرمایا ہے ان اشکر لی ولوالدیك (۳۱/۱۴) کہا کہ بیشک مگر اولاد کے حق میں والدین کی امانت پر اعتماد نہیں کیا اس نے فرمایا "لاتقتلوا اولادکم (۶/۱۵۱) بخلاف اس کے اولاد پر والدین کے بارے میں پورا اطمینان تھا اس وجہ سے ان کو اس قسم کا حکم دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔

ابن طوق ایک متکبر مگر نہایت کم عقل رئیس تھا۔ کسی نے ابو العیناء سے اس کی بابت پوچھا کہا کہ اگر بنی اسرائیل میں یہ اس وقت ہوتا جب ان کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تو یقیناً وہ اسی کو ذبح کرتے۔

۲۸۳ھ میں بغداد میں مرا۔

(۱۸) ابوالعلاء معری۔ ذہن وذکاء اور حافظ میں اعجوبہ روزگار تھا۔ اور شعروادب اور عربیت میں یگانہ دہر شعراء میں متنبی کا بہت قائل تھا۔ اور اس کو بشار، ابونواس بلکہ ابوتمام پر بھی ترجیح دیتا تھا۔ شریف مرتضیٰ اس کے برخلاف متنبی کو ناپسند کرتے تھے۔ یہ ان کی محفل میں جایا کرتا تھا۔ ایک دن اس کے سامنے انہوں نے متنبی کے کلام کے عیوب چن چن کر بیان کرنے شروع کیے۔ ابوالعلاء نے کہا کہ اگر اس نے بجز اس قصیدہ کے جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے۔

لك یامنازل فی القلوب منازل

اور کچھ نہ کہا ہوتا تو یہی اس کی فضیلت کے لئے کافی ہوتا۔ شریف مرتضیٰ نے غضبناک ہوکر اسی وقت اس کو مجلس سے نکلوادیا۔ پھر لوگوں سے بولے کہ اندھے کا مطلب بھی تم سمجھے؟ متنبی کے اس قصیدہ میں ایک شعر یہ ہے ؎

فاذا أتتك مذمتی من ناقص فھی الشھادۃ لی بانی کامل

جب کوئی ناقص آدمی میرے مذمت کرے تو یہی میرے کامل ہونے کا ثبوت ہے۔ اُس کا اشارہ اُسی کی طرف تھا۔

ابوالعلاء نے آغاز جوانی میں طرابلس شام میں تحصیل علم کی۔ پھر لاذقیہ میں آیا۔ وہاں ایک راہب کی صحبت میں جو فلسفیانہ خیالات سے آشنا تھا۔ کچھ دن گذارے جس کے اثر سے عقائد اسلامیہ میں اس کو شکوک پڑ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام سے جابجا الحاد ٹپکتا ہے چنانچہ بہت سے لوگ ہیں جو اسے زندیق سمجھتے ہیں۔ اور کم ہیں جو اس کے الحاد میں شک کرتے ہیں۔ اور یہ مسئلہ ایک مابہ النزاع مسئلہ ہو گیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس کے مذہب کے متعلق ایک فیصلہ کن بحث لکھ دوں لیکن مجھے اس کی دینی منزلت اس قابل نہ معلوم ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے الحاد میں بحث کی گنجائش بھی کم ہے۔[1]

وہ اپنے اشعار میں اسلامی عقائد یا فقہی مسائل پر جو اعتراض کرتا ہے وہ نہایت سفیہانہ ہوتے

[1] ناصر خسرو علوی مشہور سیاح اس کے زمانہ میں معرۃ النعمان میں گیا تھا۔ اس کے بیان سے بھی جو اس نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ راہبانہ اور فلسفیانہ زندگی گذارتا تھا۔

ہیں۔ مثلاً۔

یدنجمس مئین عسجد ودیت ما بالھا قطعت فی نصف دینار

یعنی وہ ہاتھ جس کی دیت پانچ سو دینار زرسرخ ہے محض نصف دینار کی چوری میں کیوں کاٹ لیا جاتا ہے۔ یاقوت رومی نے لکھا ہے کہ یہ شخص فقاہت سے کس قدر نابلد ہے کہ اتنا نہیں سمجھتا کہ اگر پانسو دینار سے کم پر نہ قطع کیا جائے تو سرقہ کی وارداتیں بڑھ جائیں اور دیت اگر نصف دینار ہو تو لوگ کثرت سے اپنے دشمنوں کا ہاتھ کاٹ لیا کریں حال میں جامعہ مصریہ کے استاد ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے جو وہاں جمعیۃ الحاد وزندقہ کے روح رواں ہیں اس کو بطل الحاد قرار دے کر اس کے کارناموں کو چمکانے اور فروغ دینے کی کوشش کی ہے چنانچہ اس کے ایک رفیق کامل حسن گیلانی نے اس کے رسالۂ غفران کو جو شیخ ابن القارح کے جواب میں ہے اور اس میں جنت اور دوزخ کا مذاق اڑایا گیا ہے نہایت آب وتاب سے شائع کیا ہے اور اس کے ملحدانہ مضامین کی مدح سرائی کرتے ہوئے نعوذ باللہ اس کو قرآن کے ہمسر بنانا چاہا ہے۔ علماء نے برافروختہ ہو کر عدالت میں چارہ جوئی کر دی ہے اور مقدمہ چل رہا ہے۔

معری نے ۴۴۹ھ میں وفات پائی۔ تین سال کی عمر میں چیچک میں آنکھیں ضائع ہوئی تھیں۔ کہا کرتا تھا کہ مجھ کو سوائے سرخ رنگ کے اور کوئی رنگ یاد نہیں ہے۔ کیونکہ بیماری کے زمانہ میں اسی رنگ کا کپڑا میرے بدن پر ڈالا جاتا تھا۔

نادرشاہ اور اتحادِ سُنّی و شیعہ

(نوشتہ ۱۹۲۹ء)

ہر چند کہ نادر شاہ اپنی سفاکیوں کی بدولت چنگیز خاں، ہلاکو اور تیمور وغیرہ کی فہرست میں مندرج ہے۔ لیکن باوجود ان خونریزیوں کے اس کے دل میں مسلمانوں کا درد تھا اور چاہتا تھا کہ اسلامی فرقے باہم متحد ہو جائیں۔

ایران میں شاہانِ صفویہ نے اپنے اغراض کے لئے خلفائے ثلثہ اور صحابہ کرام کا سب و شتم رائج کر دیا تھا۔ نادر شاہ کو یہ دیکھ کر سخت رنج ہوتا تھا کہ اس قبیح فعل کی وجہ سے ایرانی تمام عالم اسلامی کی دشمنی مول لے رہے ہیں۔ اور ان میں اور دیگر ممالک کے مسلمانوں مثلاً ہندوستان، افغانیوں اور عثمانیوں میں عداوت کی خلیج زیادہ وسیع ہوتی جا رہی ہے جس کی وجہ سے ہر وقت مصادمت کا خطرہ ہے۔

چنانچہ دشمنوں کو مغلوب اور ممالک کو مفتوح کرنے کے بعد ۱۱۴۸ھ میں صحرائے مغان میں جہاں اُمرائے ایران کا عظیم الشان اجتماع اس لئے ہوا تھا کہ اس کے سر پر ایران کی شہنشاہیت کا تاج رکھا جائے اس نے کہا کہ:۔

شاہ طہماسپ و شاہ عباس در مہدہ سریر موجود اند۔ ایشاں را یا ہر کس را کہ برادنندو السر روئی دانند بریاست و سلطنت بردارند۔ ما آنچہ حق کوشش بود دریں چند سال بجا آوردیم و ولایات ایشا نرا یا اُمرائے ایشاں از دست افغان و روسی و رومی خلاص کردیم۔

(تاریخ جہاں کشائے نادری صـ ۱۹۹)

سب لوگوں نے بالاتفاق کہا کہ اب ایران کا ایک بچہ بھی سوائے تمہارے کسی کی بادشاہی پر رضامند نہیں ہے۔ لیکن وہ برابر انکار کرتا رہا اس انکار و اصرار میں تقریباً ایک مہینے کا عرصہ گزر گیا۔ اور جب لوگوں نے اس کا دامن نہ چھوڑنا چاہا تو اس نے کہا۔

از زمان رحلت حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم چہار خلیفہ بعد از یکدگر متکفل امر خلافت شدہ اند کہ ہند و روم و ترکستان ہمگی بخلافت ایشاں قائل اند و در ایران ہم سابقاً ہمیں مذہب رائج و متداول بود۔ شاہ اسمٰعیل صفوی در مبادی حال بنا بر صلاح دولت خود ایں مذہب را متروک و مذہب تشیع را مسلوک داشتہ بعلاوہ آں سب و رفض را کہ فعل بیہودہ و مایہ مفاسد است وبالسنہ وافواہ جرام و د باش دائر و جاری کردہ شرر شرارت بچقاق نزد و برہم زنی انگیخت و ملک ایران را بخون فتنہ و فساد آمیخت و مادام کہ ایں فعل مذموم انتشار داشتہ باشد ایں مفسدہ از میان اہل اسلام رفع نہ خواہد شد ہرگاہ اہالی ایران بسلطنت ما راغب و آسایش خود را طالب باشند باید کہ ایں ملت را کہ مخالف مذہب اسلاف کرام ماست تارک و بمذہب اہل سنت و جماعت سالک شوند۔ لیکن چون حضرت امام جعفر صادق خدیۂ رسول اکرم و ممدوح امم ہستند طریقۂ اہل ایران بمذہب آنحضرت آشناست او را سر مذہب خود ساختہ در فروعات مقلد طریقہ و اجتہاد آنحضرت باشند۔

(تاریخ جہاں کشائے نادری ص۲۶۹)

اہل ایران نے اس کی بات قبول کر لی۔ اور محضر لکھ کر سب نے اس پر مہر لگائی۔ اس وقت نادر نے ایران کا تخت قبول کیا۔ اور کہا کہ چونکہ بادشاہ روم خلیفۂ اسلام ہے اس لئے میں یہ تمام سرگذشت لکھ کر اس کے دربار میں بھیجتا ہوں تاکہ باہم مصالحت اور دوستی قائم ہو جائے اختلافات مٹ جائیں۔ نیز میں اس سے پانچ باتوں کی درخواست کروں گا۔

(۱) چونکہ اہل ایران اپنے سابقہ عقائد سے جو موجب عداوت تھے تائب ہو گئے اس لئے خلیفۂ علماء و قضاۃ عثمانی سے درخواست ہے کہ مذہب جعفری کو ایک پانچواں مذہب شمار کر کے اس کی صحت تسلیم کر لیں۔

(۲) کعبہ میں جہاں چار مصلّے قائم ہیں وہاں ایک مصلّے جعفری مذہب کا بھی قائم کر دیا جائے تاکہ ایران کے لوگ اس مصلے پر اپنے امام کے پیچھے نماز ادا کر سکیں۔

(۳) ایرانی قافلہ حجاج کسی ایرانی ہی میر حاج کی قیادت میں ہر سال مکہ جایا کرے اور عثمانی اُمراء اس کے ساتھ بھی وہی مراعات برتیں جو دوسرے ممالک مثلاً مصر یا شام کے قافلہ حجاج کے ساتھ مرعی

رکھتے ہیں۔

(۴) دونوں دولتوں ایران و روم میں سے ہر ایک دولت کے پاس دوسرے کے جو اسیران جنگ ہوں وہ آزاد رکھے جائیں غلام نہ بنائیں جائیں۔

(۵) دونوں دولتوں کی طرف سے متصل ایک دوسرے کے پایہ تخت میں رہا کریں تاکہ باہمی معاملات آسانی کے ساتھ طے ہوتے رہیں۔

نادر نے تخت نشین ہونے کے بعد بار بار سفیر عثمانی دربار میں بھیجے۔ مگر وہاں سے اس کے حسب منشاء جواب نہ ملا۔ ۱۱۵۵ھ میں اس نے تیسری بار بغداد پر لشکر کشی کی تو وہاں کے والی احمد پاشا کے پاس بار بار پیغام بھیجتا رہا۔ کہ اس کے مطالبات تسلیم کئے جائیں۔ اس درمیان میں اس نے کرکوک وغیرہ کے متعدد قلعے فتح کر لئے لیکن بغداد کو نہ لے سکا۔ آخر اس کے محاصرہ پر ایک کثیر فوج چھوڑ کر خود نجف اشرف کی زیارت کے لئے گیا اور وہاں ایک عرصہ تک مع لشکروں گاہ وخیمہ وخرگاہ کے قیام رکھا۔

چونکہ صحرائے مغان کے عہد کی پوری تعمیل ابھی تک نہیں ہوئی تھی اور ہندوستان، افغانستان، ترکستان اور ایران کے مختلف العناصر مسلمان ایک دوسرے کی تکفیر سے باز نہیں آتے تھے۔ اس لئے اس نے تمام قلمرو میں فرمان بھیجا کہ مفتیان، علماء، امراء اور رؤسا ہر ملک اور ہر طبقے کے دربار میں حاضر ہوں جب چہار سمت سے یہ لوگ نجف اشرف میں آگئے تو اس نے ان سب سے پھر صحرائے مغان کے عہد کی تجدید چاہی اور ہر فرقہ کے علماء سے کہا کہ تم آپس کے تفرقے مٹا دو۔ میں کسی طرح یہ جائز نہیں رکھ سکتا کہ میری سلطنت کے مسلمان باہم ایک دوسرے کو کافر بنائیں۔ اس نے احمد پاشا والئ بغداد کے پاس لکھا کہ کسی ایسے ممتاز اور معتبر عالم کو بھیج دے جو ہمارے ان علماء کو ایک مرکز پر لاکر متحد کر سکے اور ان کے اختلافات کو مٹانے میں بطور حکم عادل کے شاہد رہے۔

احمد پاشا نے علامہ عبداللہ سویدی کو جو اس زمانے میں بغداد کے سب سے نامور عالم تھے اس کام کے لئے منتخب کیا اور نادر شاہ کے پاس بھیجا۔

علامہ موصوف نے وہ تمام باتیں جو اس مرحلہ میں پیش آئیں یا جو بحثیں ان کو کرنی پڑیں خود قلمبند کی تھیں مصر کے ایک مطبع نے اس کو "الحجج القاطعہ فی اتفاق الفرق الاسلامیہ" کے نام سے شائع کیا ہے ہم اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

۲۱ر شوال ۱۱۵۶ھ یکشنبہ کے دن مغرب سے قبل میں اپنے گھر میں بیٹھا تھا کہ احمد پاشا والیٔ بغداد کا ایک آدمی میرے بلانے کو آیا۔ میں مغرب کی نماز پڑھ کر والیٔ موصوف کے دربار میں گیا۔ وہاں ان کا ندیم احمد آغا ملا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ پاشا نے آپ کو کیوں طلب کیا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں، بولا کہ پاشا آپ کو نادر شاہ کے حسب طلب ان کے دربار میں بھیجنا چاہتا ہے، جہاں ہر طرف سے علماء عجم اکٹھا جمع ہوئے ہیں۔ آپ کو ان کے ساتھ مذہب تشیع کے متعلق بحث کرنی ہوگی۔ اگر وہ غالب آ گئے تو پھر پانچویں مذہب جعفری کی صحت کو تسلیم کر لینا پڑے گا۔

میں نے جو یہ بات سنی تو میرا بدن کانپ اٹھا اور کہا کہ احمد آغا! تم کو خوب معلوم ہے کہ نادر سخت جابر اور بڑا سفاک ہے۔ اس کے دربار میں علماء عجم کے ساتھ جو اس کے ہم مذہب ہیں میں کس طرح بحث کر سکوں گا اور کیسے ان کے عقائد کے ابطال پر دلائل قائم کرنے کی جرأت کروں گا کیونکہ وہ نہ ہماری کسی حدیث کو مانتے ہیں نہ قرآن کی تاویل کو بموجب اصول موضوعہ اور علوم متعارفہ ہمارے اور ان کے ایک نہیں ہیں تو بحث کس بنیاد پر ہوگی؟ مثلاً فرض کرو کہ میں مسح علی الخفین (موزوں پر مسح) کے جواز میں یہ دلیل پیش کروں کہ اس کو ۷۰ صحابہ نے روایت کیا ہے جن میں سے حضرت علیؓ بھی ہیں۔ وہ کہیں گے کہ عدم جواز کی روایتیں ہمارے یہاں ۰۰ اصحابیوں سے مروی ہیں جن میں سے ابو بکرؓ بھی ہیں۔ علیٰ ہذا ایک آیت کی تاویل بیان کر کے میں کسی روایت کی سند دوں گا تو وہ اس کے خلاف تاویل بیان کر کے اس کی سند کسی دوسری روایت سے دیں گے۔ لہٰذا جس طرح ممکن ہو احمد پاشا سے کہو کہ مجھے اس کام کے لئے نہ بھیجیں بلکہ حنفی یا شافعی مفتیوں میں سے کسی کو روانہ کریں۔ آغا نے کہا کہ یہ ناممکن ہے اور بہتر یہ ہے کہ اس میں آپ مطلق لب کشائی نہ کریں کیونکہ پاشا نے آپ کو بھیجنے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ سن کر میں دم بخود رہ گیا۔ اس کے بعد خود احمد پاشا آ گیا۔ اس نے سارا حال سن کر مجھے شاہ کے پاس جانے کا حکم دیا اور کہا مجھے اللہ سے امید ہے کہ تمہاری حجت کو قوی کرے گا اور تم کو غلبہ عطا فرمائے گا۔ میں نے کہا لیکن نادر شاہ کی حالت تو آپ اچھی طرح سن چکے ہیں۔ پاشا نے کہا ہاں۔ میں تم کو اس بارے میں آزاد چھوڑتا ہوں، موقع دیکھنا تو مناظرہ کرنا ورنہ باز رہنا۔ لیکن گرید کلیۃً نہ ہونی چاہیئے بلکہ مناسب طریقہ سے ان کا ابطال کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ مغلوب ہو کر ان کے مذہب کی صحت تسلیم کر لو۔ پھر کہا کہ کل دوشنبہ ہے چہارشنبہ کی صبح کو تم کو شاہ کے پاس ہونا چاہیئے۔ اس لئے کل صبح ہی روانہ ہو جاؤ۔ اس کے

بعد اس نے میرے لئے ایک خلعت کا حکم دیا اور سواری و خدام وغیرہ کا بندوبست کر دیا۔
دوسرے دن سویرے میں ان عجمیوں کے ساتھ جو بادشاہ کے یہاں سے آئے تھے روانہ ہو گیا۔
راستہ بھر اسی خیال میں غرق رہا۔ دلائل سوچتا تھا اور اس کے جواب۔ پھر جواب الجواب یہاں تک کہ ہجوم افکار سے میرا سر چکرانے لگا اور شام کو جو مجھے پیشاب آیا تو سرخ خون کی طرح۔ اب ہم ملا ابن مزید میں پہنچے۔ یہ آبادی اس وقت ایرانیوں کے قبضے میں آچکی ہے۔ یہاں چند اہل سنت والجماعت سے ملاقات ہوئی جن کی زبانی معلوم ہوا کہ شاہ نے ایران کے ۷ مفتی جمع کئے ہیں جو سب سے سب شیعہ ہیں اور مذہب جعفری کی صحت پر دلائل پیش کریں گے۔ یہ بات سن کر مجھے اور پریشانی ہوئی۔ پھر میں نے سوچا کہ میں تو مختار ہوں بحث نہ کروں گا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ میرا دل ترک بحث پر مطلقاً راضی نہیں ہوتا۔ اب میں سوچنے لگا کہ صاف صاف کہوں گا کہ اگر بحث منظور ہے تو کسی ایسے ثالث کے سامنے ہو جو نہ سنی ہو نہ شیعہ۔ اور میں مناظرہ کروں گا۔ خواہ اس میں میرے قتل ہی تک نوبت کیوں نہ پہنچے۔ وہاں سے چل کر ہم شہر ذی الکفل میں آئے اور آبادی سے باہر ہی ٹھہر کر کچھ دیر آرام کیا۔ رات کے پچھلے پہر روانہ ہو گئے اور بڑوندان میں پہنچ کر فجر کی نماز پڑھی۔ فارغ ہوتے ہی نادر شاہ کا ایک قاصد دوڑتا ہوا آیا اور کہا کہ جلد چلئے آپ کا انتظار ہے۔ اس مقام سے شاہ کا خیمہ دو فرسخ ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا شاہ کا یہی دستور ہے کہ جب کوئی آتا ہے تو اس کے استقبال کے لئے قاصد دوڑتا ہے یا صرف اس موقع پر ایسا کیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ کبھی نہیں، بلکہ لوگ آتے بھی ہیں تو عرصے تک ان کو باریابی نصیب نہیں ہوتی۔ راستہ سے بجز آپ کے آج تک شاہ نے کسی کو نہیں بلایا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اس عجلت سے بلانے کی غرض یہ ہو سکتی ہے کہ مجھ کو مذہب جعفری قبول کرنے پر مجبور کرے۔ پہلے ممکن ہے کہ دنیاوی لالچ دلائے۔ اگر میں نے اس کو قبول نہ کیا تو پھر سختی سے کام لے گا۔ بہت کچھ استغفار توبہ اور لاحول وغیرہ پڑھنے کے بعد آخر میں نے اپنے دل میں طے کر لیا کہ حق کا دامن نہیں چھوڑوں گا۔ دین اسلام پہلی بار اس وقت رُک گیا تھا جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ردت کے معاملہ میں صحابہؓ نے ابوبکرؓ کو تنہا چھوڑ دیا تھا۔ اللہ نے انہیں کی بدولت اس کو چلایا پھر دوسری بار اس وقت رُکا جب خلیفہ مامون نے علماء کو خلق قرآن کے اقرار پر مجبور کیا اس وقت احمد بن حنبل جیسا امام کھڑا ہو گیا۔ جس نے اس کو آگے بڑھایا۔ آج اگر میں بھی ان ہی مثالوں کی پیروی کروں تو کیا عجب ہے کہ حق قائم رہ جائے۔ ورنہ میرے ساتھ لاکھوں مسلمان گمراہ ہو جائیں گے۔

آخر میں موت کے لئے ہر طرح تیار ہو کر کلمہ توحید و شہادت پڑھتا ہوا روانہ ہوا۔ کچھ دیر کے بعد دو اونچے اونچے جھنڈے نظر آنے لگے۔ معلوم ہوا کہ یہی شاہی عسکر ہے۔ وہاں پہنچکر دیکھا کہ بڑے بڑے سات ستونوں پر شاہی خیمہ کھڑا ہے۔ راستہ پر کشک خانہ ہے جس میں پندرہ پندرہ خیمے بالمقابل کھڑے کئے گئے ہیں۔ شاہی خیمہ کے متصل رواق (شامیانہ) سے دائیں سمت میں چار ہزار سپاہی حفاظت کے لئے رہتے ہیں۔ اور بائیں سمت میں خالی خرگاہیں ہیں جن میں کرسیاں وغیرہ رکھی ہیں۔

جب کشک خانہ کے قریب آیا تو وہاں ایک درباری میرے استقبال کے لئے نکلا۔ اس نے مجھ سے بغداد کے اُمراء روسا اور احمد پاشا اور اس کے متعلقین کے حالات نام بنام پوچھنے شروع کئے میں اس کی واقفیت سے حیران ہوا۔ اس نے میرے تعجب کو دیکھ کر کہا کہ آپ شاید مجھے نہیں پہچانتے میرا نام عبدالکریم بیگ ہے۔ میں مدتوں بغداد میں احمد پاشا کے پاس رہا ہوں۔ آج کل دولت عثمانیہ کی طرف سے شاہ کے پاس سفارت لے کر آیا ہوں۔ اسی اثناء میں نو اشخاص ہماری طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ عبدالکریم ان کی تعظیم کے لئے کھڑا ہو گیا۔ ان لوگوں نے مجھے سلام کیا میں نے جواب دیا۔ عبدالکریم نے ان سب سے مجھ کو ملایا۔ اور یکے بعد دیگرے ان کا تعارف کرانا شروع کر دیا۔ کہ یہ حسن خاں معیار الممالک ہیں، یہ مصطفےٰ، یہ نظر علی خاں، یہ مرزا ذکی اور یہ مرزا کافی۔

معیار الممالک جو کہ جی الاصل اور شاہ حسین کے موالی میں سے ہے نادر شاہ کا وزیر ہے سرسری ملاقات کے بعد یہ لوگ مجھے شاہ کے دربار میں لے چلے۔ شامیانہ کے دروازہ پر پہنچ کر پردہ اٹھایا گیا۔ ان لوگوں نے مجھ سے کہا کہ جب ہم چلیں تو آپ بھی چلیں۔ اور جب ہم ٹھہر جائیں تو آپ بھی ٹھہر جائیں شامیانہ سے گذر گئے تو ایک طرف کشادہ جگہ دیکھی وہاں حرم کے خیمے تھے۔ سامنے ایک شاندار خیمے میں نادر کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ جب اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو بلند آواز سے کہا۔ خوش آمدید عبداللہ آفندی پھر قریب آنے کا حکم دیا۔ خوانین میرے دائیں طرف تھے، اور عبدالکریم بائیں طرف۔ ہم سب دس قدم چل کر رک گئے۔ پھر شاہ نے کہا اور آگے آؤ۔ الغرض اسی طرح ہم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر چلتے اور رکتے اس کے پاس پہنچ گئے۔ جب صرف پانچ ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا تو ٹھہر گئے۔

شاہ کا قد بلند ہے۔ چہرہ سے بڑھاپا ٹپکتا ہے، آگے کے چند دانت بھی گر گئے ہیں۔ عمر تقریباً اسی سال کی معلوم ہوتی ہے۔ ڈاڑھی حنا اور وسمہ سے رنگی ہوئی ہے۔ دونوں ابرو کمان کی طرح کشیدہ

ہیں اور آنکھوں سے زردی نمایاں ہے۔ ایک سفید چوگوشہ کلاہ عجمی سر پر ہے جس پر عمامہ ہے جو موتی یا قوت الماس اور ہر قسم کے جواہر سے مزین ہے۔ گلے میں موتی کے ہار ہیں اور قبا کے دونوں مونڈوں پر جواہرات لگے ہوئے ہیں۔ الغرض وہ اپنی شکل و لباس کے باعث پر تمکنت و جلال معلوم ہوتا ہے جب میں نے قریب سے اس کو دیکھا تو وہ تمام رعب جو اس کا میرے دل پر بیٹھا ہوا تھا جاتا رہا۔ اس نے ترکی زبان میں میرے ساتھ گفتگو شروع کی۔ پہلے احمد خاں (پاشا) کی خیریت دریافت فرمائی پھر کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میری سلطنت میں ترکستان و افغانستان بھی ہیں۔ وہاں کے لوگ ایرانیوں کو کافر کہتے ہیں اور ایرانی ان کو کافر سمجھتے ہیں حالانکہ سب ایک ہی امت کے ہیں اور ایک ہی دین کے پیرو۔ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ میری سلطنت میں ایسے مسلمان رہیں جو ایک دوسرے کو کافر بنائیں۔ میں نے آپ کو اسی غرض سے طلب کیا ہے کہ میری طرف سے وکیل بن کر ان کے باہمی مکفرات کو رفع کر دیجئے اور ہر فرقہ کو پابند کر دیجئے کہ وہ ان امور سے باز آ جائے جن سے کفر عائد ہوتا ہے تاکہ کوئی ان کو کافر نہ بنا سکے۔ جو کچھ آپ دیکھیں اور سنیں اس کو مجھ سے بھی آ کر کہیئے اور بغداد پہنچنے پر احمد پاشا کو بھی سنا دیجئے۔

اس کے بعد ہم کو وہاں سے واپسی کی اجازت ملی اور میری میزبانی کے لئے اعتماد الدولہ نامزد کئے گئے میں وہاں سے نہایت خوش ہو کر نکلا کیونکہ میرا جو خطرہ تھا اس کے برخلاف شاہ نے سارے مذہبی اختیارات میرے ہاتھ میں دے دیئے۔ اب ہم اعتماد الدولہ کی طرف روانہ ہوئے۔ نظر علی خاں، عبدالکریم بیگ اور ابوذر بیگ جو تینوں میری خدمت کے لئے مامور تھے ساتھ ساتھ چلے۔ اعتماد الدولہ خیمہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کو سلام کیا۔ اس نے جواب دیا لیکن بدستور بیٹھا رہا۔ میرے دل میں اس سے سخت انفعال اور غصہ پیدا ہوا کہ اس شخص نے اپنی رعونت سے علم اور اہل علم کی اہانت کی اور میں سوچنے لگا کہ جب کہ نادر شاہ نے جملہ مکفرات کے اٹھا دینے کا وکیل مطلق مجھے بنا دیا ہے۔ میں اس سے اس کی شکایت ضرور کروں گا اور اس کفر کو جو اسلامی شان کے خلاف ہے سب سے پہلے مٹاؤں گا۔ مگر جونہی کہ میں بیٹھ چکا اعتماد الدولہ کھڑا ہوا اور اس نے ادب سے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے اور میری طرف جھکتا ہوا مرحبا کہہ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ ایرانیوں کا تعظیمی دستور یہی ہے۔ لہٰذا اب اس کی طرف سے کوئی شکایت مجھے نہیں رہی۔

اعتماد الدولہ دراز قامت، سفید رو اور کشادہ چشم ہے۔ داڑھی پر حنا اور وسمہ کا خضاب کرتا ہے۔

عاقل نرم خو اور خلیق ہے۔

جب کھانے سے فارغ ہو چکے تو حکم آیا کہ میں ملا باشی دودباری علامہ ملا علی اکبر سے ملوں میں سوار ہوا۔ میر بالوں کی جماعت رفاقت میں تھی۔ راستہ میں ایک شخص افغانی لباس میں ملا۔ اس نے سلام کیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ بولا کہ ملا حمزہ افغانستان کا مفتی ہوں میں نے کہا کہ شاہ نے مجھ کو وکیل مطلق بنایا ہے کہ ایرانیوں سے ہر قسم کے مکفرات اُٹھا دوں۔ تم چونکہ سُنی ہو اس ملئے میں تم سے اُمید رکھتا ہوں کہ اگر وہ کوئی فعل اس قسم کا کرتے ہوں جو منجر بکفر ہو اور مجھ سے اس کو چھپائیں تو مجھے مطلع کر دینا کیونکہ میں ان کے حالات، عقائد اور عبادات سے اس قدر واقف نہیں ہوں جس قدر کہ تم لوگ ہو۔

ملا حمزہ نے کہا کہ آپ شاہ کی باتوں سے دھوکے میں نہ آجائیں درحقیقت اس نے آپ کو ملا باشی کے پاس اس غرض سے بھیجا ہے کہ وہ مناظرہ کرنے، ایران کے تمام علماء اس کا ساتھ دیں گے لہٰذا آپ ہوشیار رہیں میں نے کہا کہ مجھے بحث کا زیادہ خطرہ نہیں ہے۔ صرف ڈر یہ ہے کہ وہ ناانصافی نہ کریں یا جو کچھ مجلسِ مناظرہ میں میں کہوں اس کے خلاف شاہ سے جا کر بیان کریں اس نے کہا کہ اس لئے آپ خاطر جمع رکھیں۔ اس مجلس میں شاہ کے مخبر ہیں۔ پھر ان مخبروں پر مخبر ہیں۔ ان کے علاوہ خاص جاسوس ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک لفظ بھی خلافِ واقعہ شاہ کے سامنے کوئی بیان کر سکے۔

اب ہم ملا باشی کے خیمے کے قریب پہنچ گئے۔ وہ منتظر تھا، استقبال کے لئے نکلا۔ گندم گوں اور پستہ قد آدمی ہے۔ مجھ کو لیجا کر صدر پر بٹھایا اور خود سامنے شاگردوں کی طرح ادب کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مجمع کثیر تھا۔ ہر ملک کے علماء جمع تھے۔ پہلے اس نے مجھ سے رسمی باتیں کیں۔ اس کے بعد افغانی مفتی کو مخاطب کر کے کہا کہ تم نے بادی خواجہ دقاضی بخارا کو دیکھا؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں — ملا باشی نے کہا کہ مجھے تعجب ہے کہ اس نے اپنا لقب بحر العلم کیوں رکھا ہے اس کو تو علم سے ذرا بھی مس نہیں بخدا اگر میں حضرت علیؓ کی خلافت کے متعلق دو دلیلیں بھی بیان کروں تو وہ ان کا جواب نہیں دے سکے گا، اور وہ کیا اہلِ سنت کے علمائے مجول سے بھی ان کا جواب بن نہ پڑے گا۔ اس آخری جملے کو اس نے تین بار دہرایا۔ اس لئے لازم آگیا کہ میں ان دونوں دلیلوں کو پوچھوں اور ان کے جو جوابات ہو سکتے ہوں پیش کروں۔

میں:۔ جناب ذرا میں بھی سنوں کہ حضرت علیؓ کی خلافت کے ثبوت میں آپ کی وہ کونسی دو دلیلیں

ہیں، جن کا جواب آپ کے خیال میں کسی بڑے سے بڑے سنی عالم سے بھی نہیں ہو سکتا۔
ملا باشی:۔ میں آپ سے پہلے یہ پوچھ لینا چاہتا ہوں کہ آنحضرت کا یہ قول حضرت علیؓ کے متعلق آپ کے یہاں مسلم ہے یا نہیں کہ انت منی بمنزلة هارون من موسی الا انه لا نبی بعدی۔ (تم میرے ساتھ وہ نسبت رکھتے ہو جو ہارونؑ کو موسیٰ کے ساتھ تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔
میں:۔ ہاں یہ حدیث مشہور ہے۔
ملا باشی:۔ تو کیا اس حدیث کا منطوق و مفہوم صریحاً اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ خلیفہ برحق علیؓ ابن ابی طالب ہیں؟
میں:۔ دلیل کی صورت معرض بیان میں لایئے۔
ملا باشی:۔ جب آنحضرتؐ نے ہارونؑ کے تمام منازل و مراتب حضرت علی کے لئے فرما دیئے اور ان سے کوئی چیز بجز نبوت کے مستثنیٰ نہ کی تو ثابت ہو گیا کہ خلیفہ برحق حضرت علیؓ ہیں کیونکہ ہارونؑ کا اولین مرتبہ تو خلافت ہی تھا اگر وہ زندہ رہتے تو ضرور حضرت موسیٰؑ کے بعد ان کے خلیفہ ہوتے۔
میں:۔ آپ کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس کو قضیہ موجبہ کلیہ سمجھتے ہیں لہٰذا یہ بتایئے کہ اس ایجاب کلی پر کونسا لفظ دلالت کرتا ہے کہ ہارون کے تمام منازل حضرت علیؓ کو حاصل ہیں۔
ملا باشی:۔ اس لئے کہ منزلة هارون میں جو اضافت ہے وہ بقرینہ استثنا استغراقی ہے۔
میں:۔ سنئے۔ یہ حدیث اولاً تو نص جلی نہیں ہے اور آپ کے یہاں امامت یا خلافت کے ثبوت کے لئے نص جلی درکار ہے۔ ثانیاً محدثین نے اس کے متعلق اختلافات کئے ہیں۔ کسی نے اس کو صحیح کہا ہے کسی نے حسن اور کسی نے ضعیف۔ یہاں تک کہ ابن جوزی نے جو نقد حدیث کا بہت بڑا امام ہے۔ اس کو قطعاً موضوع قرار دیا ہے۔
ملا باشی:۔ نص جلی ہمارے یہاں شرط ہے نہ کہ آپ کے یہاں، سو ہم حضرت علیؓ کی خلافت کے لئے دوسری حدیثیں پیش کرتے ہیں جو نص جلی ہیں لیکن چونکہ اہل سنت کے نزدیک وہ نامقبول ہیں۔ اس لئے ان کے واسطے اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔
میں:۔ یہ حدیث مختلف وجوہ سے دلیل نہیں بن سکتی۔ اولاً یہ کہ استغراق کا دعویٰ جو آپ نے کیا وہ ممنوع ہے۔ کیونکہ ہارونؑ حضرت موسیٰ کے ساتھ نبی تھے اور حضرت علیؓ میں یہ بات نہ تھی۔

حالانکہ استثناء تو نبوت بعد از وفات کا ہے ثانیاً ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے ماں جائے بھائی تھے اور حضرت علیؓ نبیؐ کے ساتھ یہ رشتہ نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا استغراق کا دعویٰ تو قطعاً باطل ہوا۔ اب اس کی دلالت ظنی رہ گئی جو اصولاً صرف ایک منزل پر ہوگی۔ جیسا کہ منزلۃ کی تاء وحدت سے خود ظاہر ہے، اس لئے یہ اضافت عہد ہے نہ کہ استغراق اور مقصود یہ ہے کہ علیؓ خلافت جنگ تبوک میں میرے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہیں جو حضرت ہارون کو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اس وقت تھی جبکہ انہوں نے حکم دیا تھا "اُخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ" میری قوم میں میری جانشینی کرو (۱۴۲)۔

ملا باشی:۔ تو پھر کیا اس استخلاف سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ صحابہ میں افضل تھے اور نبی کے بعد اُن کی جانشینی کے سب سے زیادہ مستحق۔

میں:۔ نہیں، کیونکہ حضرت علیؓ کے علاوہ اور صحابہ کو بھی آپ نے اپنی جانشینی کا زندگی میں شرف بخشا ہے مثلاً ابن اُم مکتوم وغیرہ پھر وہ بھی بعد وفات کے اس دلیل سے خلافت کے سب سے زیادہ مستحق ہوں گے۔ علاوہ بریں اگر یہ استخلاف کوئی فضیلت ہوتی تو حضرت علیؓ اس پر ناراضی کا اظہار نہ کرتے جیسا کہ انہوں نے کہا کہ آپ مجھ کو کمزور بچوں اور بوڑھی عورتوں کے ساتھ چھوڑتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی اسی کبیدگی کو دفع کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فقرہ "انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ" فرمایا تھا۔

ملا باشی:۔ لیکن لحاظ عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص سبب کا۔

میں:۔ خصوص سبب کو میں نے دلیل نہیں گردانا ہے بلکہ اس کو قرینہ بتلایا ہے کہ یہاں ایک منزلت جو مراد ہے اس سے صرف وہی خلافت مخصوصہ جنگ تبوک ہے نہ کہ اور کوئی خلافت۔ اس کے بعد ملا باشی خاموش رہ گیا اور اس کے کثیر طرفدار علماء میں سے بھی جو اس کی حمایت کے لئے پس پشت بیٹھے ہوئے تھے، کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ اب اس نے اپنی دوسری دلیل شروع کی اور کہنے لگا کہ میری دوسری دلیل تو ایسی ہے کہ اس میں قطعاً کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔

میں:۔ اس کو بھی بیان فرمایئے۔

ملا باشی:۔ وہ آیت مباہلہ ہے۔ "قُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَکُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَکُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَکُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ" کہہ دے کہ آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور

اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور اپنے آپ کو اور تم کو پھر مباہلہ کریں۔ (پ ۳)

میں:۔ استدلال کی شکل بیان کیجئے۔

ملا باشی:۔ جب نجران کے نصاریٰ مباہلہ کے لئے آئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گود میں حسین رضؓ کو اٹھایا حسن رضؓ کا ہاتھ پکڑا، پیچھے فاطمہؓ تھیں اور ان کے پیچھے علی رضی اللہ عنہم۔ ظاہر ہے کہ دعا کے لئے وہی لوگ منتخب ہو سکتے ہیں جو سب سے افضل ہوں۔

میں:۔ یہ منقبت ہوئی نہ کہ فضیلت۔ اکثر صحابہ بعض خصوصیات سے مختص ہیں جو دوسروں میں نہیں ہیں اور یہ باتیں ان لوگوں سے مخفی نہیں ہیں جو تاریخ و سیر کا مطالعہ کرتے ہیں مگر یہ خصوصیات فضیلت کی دلیل ہرگز نہیں ہو سکتیں۔ فرض کرو کہ دو قبیلوں میں جنگ ہو، ان دونوں کے رؤساء صرف اپنے اپنے خاص خاص متعلقین کو ساتھ لے کر مبارزہ کریں تو یہ دلیل اس امر کی نہیں ہو سکتی کہ ان قبیلوں میں ان رؤساء کے خاص عزیزوں سے بڑھ کر کوئی بہادر نہ تھا اور یہ چونکہ دعا کا موقع تھا جس میں خاص متعلقین کی موجودگی سے خشوع زیادہ بڑھ جاتا ہے اس لئے مقتضائے مقام یہی تھا کہ آنحضرت انہیں حضرات کو اپنے ساتھ لے جاتے۔

ملا باشی:۔ ہاں تو خشوع نتیجہ ہے فرط محبت کا اور ہم یہی تو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کو یہی حضرات سب سے زیادہ محبوب تھے۔

میں:۔ یہ طبعی اور جبلی محبت ہے نہ کہ اختیاری جس سے کوئی فضیلت ثابت ہو سکے۔ انسان یقین رکھتے ہوئے کہ اس کے بیٹوں یا خاص عزیزوں سے دوسرے لوگ ہر لحاظ سے افضل ہیں۔ پھر بھی طبعاً ان کی محبت پر مجبور ہے اور یہ ایسی بات ہے جس کو سب جانتے ہیں۔

ملا باشی:۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں ایک خاص نکتہ ہے جس کی وجہ سے ہم حضرت علیؓ کی افضلیت کی دلیل اس کو سمجھتے ہیں۔ وہ یہ کہ ابناءنا سے مراد ہیں حسنؓ و حسینؓ نساءنا سے فاطمہؓ اور انفسنا سے آنحضرتؐ اور علیؓ۔ اس لئے حضرت علیؓ نفس نبی ہوئے اور یہ انتہائی فضیلت ہے۔

میں:۔ یہ تو میں پہلے سمجھ گیا تھا کہ تم اصول سے ناواقف ہو لیکن اب معلوم ہوا کہ عربیت سے بھی ناآشنا ہو۔ سنو! انفس جمع قلت ہے جو جمع متکلم کی طرف مضاف ہے اور جمع جب جمع کی طرف مضاف ہوتی ہے تو تقسیم احاد کی مقتضی ہوتی ہے مثلاً "رکبوا دوابھم" اس کے یہ معنی نہیں کہ جملہ اشخاص

سب گھوڑوں پر چڑھ گئے بلکہ ہر ہر شخص اپنے اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور یہ قاعدہ متعارف و متداول ہے اور کتب نحو میں بہ تصریح مذکور۔

یہ سن کر وہ خاموش ہو گیا اور کوئی جواب اس سے نہ بن پڑا۔ کہنے لگا میرے پاس ایک دلیل اور بھی ہے میں نے کہا اسے بھی پیش کیجئے۔

ملا باشی:۔ آیت اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ کی تفسیر میں جملہ اہلِ تفاسیر کا اتفاق ہے کہ حضرت علیؓ کے متعلق نازل ہوئی ہے اور آیت میں انما کلمۂ حصر ہے جس سے ان کا افضل اُمّت ہونا ظاہر ہوتا ہے

میں:۔ اس دلیل کے متعدد جوابات ہیں۔

میں اسی قدر کہنے پایا تھا کہ اس کے ساتھیوں میں سے ایک نے فارسی زبان میں اس سے کہا کہ یہ بحث چھوڑ دو کیونکہ یہ شخص تمہاری ہر دلیل کو توڑتا چلا جائے گا اور لوگوں کی نگاہوں میں تم اسی قدر گرتے جاؤ گے۔ یہ سن کر اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا کہا کہ آپ فاضل شخص ہیں۔ میری ہر دلیل کا جواب دے سکتے ہیں لیکن میرا روئے سخن تو در اصل بحر العلم کی طرف تھا میں نے کہا کہ آغازِ سخن میں آپ نے فرمایا تھا کہ فول علماء اہلسنت بھی میری دلیلوں کا جواب نہیں دے سکتے۔ اس بنا پر میں نے گفتگو کی ورنہ مجھے کوئی بحث نہ تھی۔

ملا باشی:۔ میں عجمی شخص ہوں، عربی بولنے میں کبھی کبھی مقصود کے خلاف بھی الفاظ میری زبان سے نکل جاتے ہیں۔

میں:۔ اچھا اب میں دو سوال کرتا ہوں جس کی بابت مجھ کو یقین ہے کہ علماء شیعہ میں سے کوئی بھی ان کے جواب نہ دے سکے گا۔

ملا باشی:۔ وہ کیا ہیں؟

میں:۔ کیا تمہارے یہاں یہ روایت مسلّم نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد تمام صحابہؓ (بوجہ حضرت علیؓ کی خلافت پر بیعت نہ کرنے کے) مرتد ہو گئے بجز پانچ کے حضرت علیؓ مقداد، ابوذر، سلیمان فارسی اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم۔

ملا باشی:۔ ہاں مسلّم ہے۔

میں:۔ اگر معاملہ یہ تھا تو پھر کیوں حضرت علیؓ نے اپنی بیٹی اُم کلثوم کا نکاح حضرت عمرؓ کے ساتھ کیا؟

ملا باشی:۔ مجبوراً دباؤ سے۔

میں:۔ بخدا تم نے حضرت علیؓ کی ایسی منقصت پر عقیدہ رکھا ہے جس کو ادنیٰ عرب بلکہ اجلاف بازاری بھی اپنے لئے جائز نہ رکھیں گے۔ اگر جبراً کسی کی بیٹی کو کوئی بیاہ لے تو کیا اس کی زندگی بے غیرتی کی زندگی نہیں ہے؟ پھر تم کیسے دعوے کر سکتے ہو کہ حضرت علیؓ اسد اللہ، شیر خدا، شاہ مرداں اور شجاع دوراں تھے۔

ملا باشی:۔ یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے یہاں بجائے اُم کلثوم کے کوئی چڑیل یا جنّنی رخصت کی گئی ہو۔

میں:۔ یہ جواب اس سے بھی عجیب تر ہے اگر اس احتمال کا دروازہ کھولا جائے تو شریعت کا کوئی نقطہ اپنی جگہ پر باقی نہیں رہ سکتا۔ مثلاً ایک شخص اپنی منکوحہ کے پاس جاتا ہے وہ کہتی ہے کہ ممکن ہے کہ تم میرے شوہر نہ ہو بلکہ جن یا بھوت ہو۔ اگر وہ دو گواہ پیش کرے تو وہ کہہ سکتی ہے کہ ممکن ہے کہ یہ انسان نہ ہوں بلکہ غولِ بیابانی ہوں۔ علیٰ ہذا ایک قاتل عدالت میں پیش کیا جائے وہ بیان کرے کہ میں نے قتل نہیں کیا ممکن ہے کہ کوئی جن میرا ہم شکل بن گیا ہو، یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ تہذیب جعفری جس کو تم حق سمجھتے ہو ممکن ہے کہ امام جعفرؒ سے نہ مروی ہو بلکہ کسی جن سے ہو جس نے ان کی شکل اختیار کر لی ہے۔ الغرض وہ اب کے بھی ساکت ہوا، اور ایک حرف آگے نہ چل سکا۔ اب میں نے دوسرا سوال پیش کیا اور پوچھا کہ ظالم خلیفہ کے افعال کی بابت تمہارا کیا عقیدہ ہے؟

ملا باشی:۔ غیر نافذ ہیں شرعاً اور دیانتاً۔

میں:۔ یہ بتایئے کہ حضرت علیؓ کے بیٹے محمد بن الحنفیہ کی والدہ کس قبیلہ کی تھیں؟ اور کس نے اُن کو مالِ غنیمت میں حاصل کیا تھا؟

ملا باشی:۔ میں نہیں جانتا (میرے خیال میں اس نے صحیح نہیں کہا کیونکہ ممکن نہیں کہ وہ اس بات کو نہ جانتا ہو) لیکن علمائے شیعہ میں سے ایک نے کہا کہ وہ حنیفہ میں سے تھیں۔ اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ان کے حکم سے بنی حنیفہ کے ساتھ جو لڑائی ہوئی تھی اس میں گرفتار ہو کر قیدیوں کے ساتھ آئی تھیں۔

میں:۔ پھر حضرت علیؓ نے یہ کیسے جائز سمجھا کہ خلیفۂ ظالم کے مالِ غنیمت میں سے کنیز لے کر اس سے اولاد پیدا کریں۔ اس معاملہ میں تو نہایت احتیاط کی ضرورت تھی۔

ملا باشی :- ہوسکتا ہے کہ حضرت علیؓ نے ان کو خود بنی حنیفہ سے بطور ہبہ کے مانگ لیا ہو۔
میں :- اس کی کوئی دلیل ؟
اس پر ہر طرف خاموشی تھی ؟
میں :- میں نے قصداً احتیاط رکھی کہ کوئی حدیث یا کوئی آیت آپ کے سامنے پیش نہ کروں۔ اس لئے کہ ممکن ہے ہم دونوں اس کی صحت یا اس کی تادیل میں متفق نہ ہوں اور استدلال صرف انہیں باتوں سے ہوسکتا ہے جو فریقین کے نزدیک مسلّم ہوں، میرے یہ دونوں سوالات عقل و عرف کی بنا پر تھے۔

اس مناظرہ کی لفظ بہ لفظ صحیح صحیح خبریں شاہ تک پہنچ گئیں۔ اس نے حکم دیا کہ جملہ علماء باہم جمع ہو کر مکفرات کو اُٹھا دیں اور ایک دوسرے کی تکفیر سے دست بردار ہو جائیں اور میں ان کا حکم رہوں۔ اسلئے ہم سب ملا باشی کے خیمہ سے نکل کر اس مجمع کی طرف چلے جو ضریح علیؓ کے متصل اس غرض کے لئے جمع ہوا تھا۔

علماء ایران کی تعداد ۷۰ تھی جن میں سے صرف ایک شخص مفتی اردلان سُنی تھا۔ اور باقی سب شیعہ۔ ان میں سے ممتاز حضرات کے نام میں نے اسی وقت لکھ لئے تھے۔

(۱) ملا باشی علی اکبر۔ (۲) مفتی رکاب آقا حسین۔ (۳) ملا محمد امام لاہجان (۴) آقا شریف مفتی مشہد رضا (۵) مرزا برہان قاضی شروان (۶) شیخ حسن مفتی ارومیہ (۷) مرزا ابوالفضل مفتی قم (۸) حاجی صادق مفتی جام (۹) سید محمد مہدی امام اصفہان (۱۰) حاجی محمد زکی کرمان شاہ (۱۱) حاجی محمد شمامی مفتی شیراز (۱۲) مرزا اسد اللہ مفتی تبریز۔ (۱۳) ملا طالب مفتی مازندان۔ (۱۴) ملا محمد مہدی نائب صدر مشہد۔ (۱۵) ملا محمد صادق مفتی خلخال (۱۶) محمد مومن مفتی استرآباد۔ (۱۷) سید محمد تقی مفتی قزوین۔ (۱۸) ملا محمد حسین مفتی سبزوار۔ (۱۹) سید بہاء الدین مفتی کرمان (۲۰) سید احمد مفتی اردلان شافعی۔

افغانستان کے علماء جو سب کے سب حنفی تھے حسب ذیل تھے۔

(۱) شیخ فاضل ملا حمزہ قلنجانی مفتی افغانستان (۲) ملا امین قلنجانی قاضی افغانستان (۳) ملا دینا خلق (۴) ملا طٰہٰ افغانی مدرس مدرسہ نادر آباد (۵) ملا محمد قلنجانی (۶) ملا عبد الرزاق قلنجانی (۷) ملا ادریس ابدالی۔
تھوڑے سے عرصہ کے بعد علماء ترکستان آئے جن کی تعداد سات تھی۔ ان کے آگے ایک شیخ تھا جس

کے چہرہ سے رعب اور وقار برستا تھا ایک بڑا عمامہ سر پر دیکھنے والے کو خیال گذرتا تھا کہ امام اعظمؒ کے شاگرد رشید امام ابو یوسفؒ چلے آرہے ہیں۔ ایرانیوں نے اس خیال سے کہ میں ان سے کوئی بات نہ کرسکوں مجھ سے پندرہ آدمیوں کے فاصلے پر بائیں طرف ان کو بٹھایا۔ اسی طرح افغانی علماء کو بھی دائیں طرف مجھ سے دور جگہ دی۔ ترکستانی علماء کے نام یہ ہیں۔

(۱) علامہ ہادی خواجہ بحر العلم قاضی بخارا حنفی۔ (۲) میر عبداللہ صدر بخارا حنفی (۳) قلندر خواجہ بخاری حنفی (۴) ملا اُمید صدر بخاری حنفی۔ (۵) بادشاہ میر خواجہ بخاری حنفی۔ (۶) مرزا خواجہ بخاری حنفی (۷) ابراہیم بخاری حنفی۔

جب مجلس بیٹھ چکی ملاباشی نے بحر العلم کو مخاطب کیا اور کہا کہ آپ اس شخص (میری طرف اشارہ کر کے) کو پہچانتے ہیں۔ بحر العلم نے کہا کہ نہیں۔ ملاباشی نے کہا کہ یہ فضلاء اہل سنت میں سے ہیں شیخ عبداللہ آفندی۔ ان کو احمد پاشا والیٔ بغداد نے شاہ کے حسب طلب بھیجا ہے تاکہ اس مجلس میں ہمارے نگران اور شاہد رہیں۔ شاہ نے ان کو اپنا وکیل بنا دیا ہے۔ جن امور پر ہمارا اتفاق ہوتا جائے گا یہ شاہد رہیں گے لہٰذا آپ ان تمام امور کو بیان کریں جن کی بناء پر شیعوں کی تکفیر کرتے ہیں تاکہ اگر واقعی وہ موجب کفر ہوں تو ہم ان سے باز آجائیں ورنہ حقیقت میں تو ہم کافر نہیں ہیں۔ خود امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بھی۔ چنانچہ جامع الاصول میں ہے کہ اسلام کے پانچ مذاہب ہیں جن میں سے ایک مذہب جعفری بھی ہے۔ اسی طرح صاحب مواقف نے بھی امامیہ کو اسلام کا ایک فرقہ تسلیم کیا ہے۔ اور امام ابو حنیفہ کا قول فقہ اکبر میں ہے کہ ہم اہل قبلہ کو کافر نہیں سمجھتے۔ شرح ہدایہ میں بہ تصریح موجود ہے کہ صحیح یہ ہے کہ امامیہ اسلام ہی کا ایک فرقہ ہے لیکن باوجود متقدمین کی ان تصریحات کے بھی متاخرین نے غلو اور تعصب سے کام لے کر ہم کو کافر بنانا شروع کیا۔ جس طرح ہمارے فرقہ کے لوگوں نے آخر میں سنیوں کی تکفیر شروع کر دی۔ حالانکہ نہ ہم کافر ہیں۔ نہ تم۔ بہرصورت ہمارے اندر کفر کی جو باتیں آپ کے خیال میں ہوں ان کو ظاہر کیجئے۔

بحر العلم: سب شیخین۔

ملاباشی: ہم نے اس کو چھوڑا۔

بحر العلم: تم صحابہ کرامؓ کو کفار، مرتد اور گمراہ کہتے ہو۔

ملاباشی: سارے صحابہ عدول ہیں۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ

بحر العلوم:۔ متعہ کو حلال سمجھتے ہو۔
ملا باشی:۔ متعہ حرام ہے جو اس کی حلت کا قائل ہو وہ سفیہ ہے۔
بحر العلوم:۔ تم علیؓ کو ابوبکرؓ پر فضیلت دیتے ہو اور کہتے ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہی خلیفہ برحق ہیں
ملا باشی:۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اُس اُمت میں سب سے افضل ابوبکرؓ پھر عمرؓ پھر عثمانؓ پھر علیؓ
رضی اللہ عنہم ہیں اور ان کی خلافتیں بھی اسی ترتیب کے ساتھ ہیں۔
بحر العلوم:۔ تمہارا اصول اور عقیدہ کیا ہے۔
ملا باشی:۔ ہم ابوالحسن اشعری کے عقیدہ پر ہیں۔
بحر العلوم:۔ شرط یہ ہے کہ شرع کی کسی حلال چیز کو حرام یا حرام کو حلال نہ بناؤ۔
ملا باشی:۔ یہ شرط منظور ہے۔

بحر العلم نے اس کے بعد کچھ اور شرطیں بھی پیش کیں۔ جن کو کفر سے علاقہ نہ تھا۔ ملا باشی نے ان سب کو قبول کیا پھر کہا کہ جب ان امور کے ہم پابند ہو گئے۔ تو اب تم کو ہمارے مسلمان شمار کرنے میں کیا عذر ہے۔

بحر العلوم:۔ سبِ شیخین پر تبرا کفر ہے۔
ملا باشی:۔ ہم نے اس کو چھوڑا۔
بحر العلوم:۔ دکچھ دیر تک سکوت کے بعد لیکن شیخین کو بُرا کہنا تو کفر ہے۔
ملا باشی:۔ جناب ہم نے تو اس کو چھوڑ دیا پھر بھی آپ ہم کو کُفار ہی کہتے رہیں گے۔
بحر العلوم:۔ بہر صورت سبِ شیخین تو کفر ہے۔

مراد بحر العلم کی یہ تھی کہ سبِ شیخین چونکہ کفر ہے[1] اور جس سے کفر صادر ہو مذہبِ حنفی کے مطابق اس کی توبہ قبول نہیں۔ پھر میں کیسے تسلیم کر لوں کہ شیعہ مسلمان ہیں جب کہ یہ کفر ان سے سرزد ہو چکا ہے۔

آخر مفتی افغان ملا حمزہ نے کہا کہ ہادی خواجہ! کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت موجود ہے کہ ان سے سبِ شیخین کا کفر صادر ہوا ہے جو تم ان کی توبہ نہیں قبول کرتے۔ بحر العلم نے کہا کہ نہیں۔ ملا حمزہ نے کہا کہ جب

---

[1] لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ سب شیخین کفر ہے نہ ناقابل توبہ۔ یہ فتاوے جن لوگوں نے دیئے ہیں انکے حالات پڑھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خاص خاص اسباب سے وہ شیعوں سے ذاتی تعصب اور عداوت رکھتے تھے۔ اسلم

وہ حتمی وعدہ کرتے ہیں۔ کہ ہم تبرا نہ کہیں گے تو پھر اس کے قبول کر لینے میں کونسی شے مانع ہے۔ اس پر بحرالعلم نے کہا کہ اچھا یہ لوگ بھی مسلمان ہیں جو ہمارے حقوق وہ ان کے حقوق۔

جب یہ بات طے ہو گئی تو شیعہ حنفی اور شافعی تینوں فرقوں کے علماء اُمرا اور اعیان کھڑے ہو گئے، باہم مصافحہ اور معانقہ کرنے لگے اور ایک دوسرے سے بچھڑے ہوئے بھائیوں کی طرح بغلگیر ہونے لگے۔

اس وقت ہمارے پس پشت اردگرد عجمی اُمرا، اور تماشائیوں کا ہجوم دس ہزار سے کم نہ تھا جو سب کے سب جوش سرور اور فرط مسرت سے آپس میں ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے۔

یہ مجلس بحسن و خوبی چہار شنبہ کے دن مغرب سے پہلے ختم ہوئی۔ رات کو دس بجے شاہ کی طرف سے ایک آدمی آیا جس نے کہا کہ شہنشاہ آپ کو سلام کہتے ہیں اور آپ کی مساعی کے شکر گزار ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ کل کی مجلس میں جب آج کی باتوں کا عہد و پیمان ہوگا اور ہر فریق محضر پر دستخط کرے گا آپ بطور شاہد اور میرے وکیل کے موجود رہیں گے اور محضر کی پیشانی پر خود اپنے قلم سے اپنی شہادت تحریر کریں گے اور مہر لگائیں گے۔

میں نے کہا کہ بسر وچشم میں اس حکم کی تعمیل کروں گا۔

دوسری دن پنجشنبہ ۲۵ شوال کو مزیح علیؓ کے سامنے دوپہر سے پہلے اجتماع ہوا۔ ہم سب لوگ وہاں پہنچے حاضرین کی تعداد کم سے کم ساٹھ ہزار تھی۔ محضرنامہ سات بالشت کے کاغذ پر فارسی زبان میں لکھا گیا تھا۔ ملا باشی نے مفتی رکاب آقا حسین کو جو بلند آواز شخص تھا اس کے سنانے کا حکم دیا اس نے مجمع عام میں پڑھا۔ اس کا مضمون یہ تھا۔

> اللہ جل شانہ، اس دنیا میں سلسلہ وار رسول بھیجا رہا۔ سب کے آخر میں محمد مصطفے صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نے اپنا رسول بنا کر بھیجا۔ جن پر رسالت ختم کر دی۔ ان کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بالاتفاق ابوبکر صدیق ابن ابی قحافہؓ کو ان کا جانشین بنایا۔ اور ان کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی۔ حضرت علیؓ نے بھی بطیب خاطر بلا جبر و اکراہ بیعت فرمائی اور باجماع صحابہؓ وہ اُمت کے امیر اور خلیفہ ہو گئے۔ پھر انہوں نے بذریعہ عہد کے عمر بن خطاب کو اپنا جانشین کیا۔ ان کے ہاتھ پر بھی جملہ اصحابؓ نے مع حضرت علیؓ کے خوشی کے ساتھ بیعت کی۔ عمرؓ نے خلافت کو اپنے بعد چھ اُمیدواروں میں بطور شوریٰ کے چھوڑ

دیا جن میں سے ایک علیؓ بن ابی طالب بھی تھے۔ کثرتِ رائے سے حضرت عثمانؓ خلیفہ ہو گئے جب وہ اپنے گھر میں باغیوں کے ہاتھ سے شہادت پا گئے اور اُمت بلا خلیفہ کے رہ گئی۔ اس وقت صحابہؓ نے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنایا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ چاروں خلیفہ ایک زمانہ میں تھے۔ ان میں کبھی باہم کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور اس کی تعریف کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب علیؓ سے شیخینؓ کی بابت سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ دونوں امام عادل اور برحق تھے اور اسی پر مرے۔ اسی طرح جب حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے تو انہوں نے فرمایا کہ تم میں علیؓ موجود ہیں پھر بھی تم میرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہو۔

اہلِ ایران تم کو یقین رکھنا چاہیئے کہ ان کی افضلیت اور خلافت اسی ترتیب پر ہے جس طرح بیان کی گئی۔ سو جو شخص ان کی تحقیر یا ان کی بابت کوئی ناشائستہ کلمہ زبان سے نکالے گا۔ اس کا مال، اولاد اور خون سب شہنشاہ کے لئے حلال ہوگا اور اس کے اوپر اللہ ملائکہ اور جملہ بنی نوعِ انسان کی لعنت ہو گی۔

میں نے صحراءِ مغان میں تخت نشینی کے وقت یہی عہد لیا تھا۔ اب جو کوئی صحابہؓ کو بُرا یا شیخینؓ پر تبرا کہے گا اس کو اس کے اہل و عیال سمیت قید کر دوں گا اور مال و جائداد ضبط کر لوں گا۔ یہ بدعت ایران میں کبھی نہیں تھی۔ اس کا ظہور اسمٰعیل شاہ صفوی کے عہد حکومت سے ہوا، جو اب تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔

یہ حصہ شاہ کی طرف سے تھا۔ اس کے نیچے چند سطریں تھیں جن میں باشندگانِ ایران کی طرف سے عہد تھا کہ:۔

ہم صحابہ کو بُرا نہ کہیں گے اور تبرے سے دست بردار ہوئے۔ خلفائے اربعہؓ کی فضیلت اور خلافت کے ہم اسی ترتیب کے ساتھ قائل ہیں جو اس محضر میں مندرج ہے جو اس کے خلاف کرے اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سارے آدمیوں کی لعنت ہو اور شہنشاہ کے لئے اس کا مال، عیال اور خون حلال ہے۔

اس کے نیچے علماء اور عمائدِ ایران کے دستخط ہوئے اور اُن کی مُہریں لگائی گئیں، پھر اس کے بعد یہی

مضمون چند سطروں میں کربلا، نجف، حلہ اور خوارزم کے باشندوں کی طرف سے تھا اس پر اُن کی مُہریں ثبت ہوئیں۔
مہر لگانے والوں میں سید نصراللہ بن قطہ اور شیخ جواد نجفی وغیرہ ممتاز افراد تھے۔

پھر اس کے تحت میں چند سطریں علماء افغانستان کی طرف سے تھیں کہ ایرانی جب ان باتوں کی پابندی کریں گے جو اس محضر میں ہیں تو ہم ان کو کافر نہیں سمجھیں گے بلکہ ان کو اپنے بھائی مسلمانوں کا فرقہ تسلیم کریں گے۔ اس کے نیچے ان کے دستخط ہوئے اور ان کی مُہریں لگائی گئیں۔

بعینہٖ یہی مضمون ترکستانی علماء کی طرف سے بھی تھا۔ انہوں نے بھی اس پر مہریں لگائیں۔ عنوان پر میں نے اپنی شہادت لکھ کر دستخط کیا اور مُہر لگائی۔

جب یہ تمام کارروائی ختم ہو گئی تو مجمع سے ایک خوشی کا نعرہ بلند ہوا۔ سنی اور شیعہ سب کے سب فرحناک تھے۔ اور نہایت گرم جوشی سے باہم گلے مل رہے تھے۔ اس کے بعد شاہ کی طرف سے چاندی کی سینیوں میں خدام حلوے اور مٹھائیاں لئے ہوئے آئے اور خالص سونے کے جڑاؤ عطر دانوں سے جو مشک و عنبر سے بھرے ہوئے تھے مجمع کی خاطر کی گئی۔

پھر شاہ نے مجھے بلایا اور کہا کہ میں آپ کا اور ساتھ ہی احمد خاں (پاشا) کا شکر گزار ہوں کہ مسلمانوں کو باہمی تکفیر اور خونریزی سے بچانے میں سعی فرمائی۔ میں ازراہ شکر نہ کہ ازراہِ فخر یہ کہتا ہوں کہ اس کام کو اللہ نے میرے ہاتھ سے کرایا کہ صحابۂ کرامؓ پر تبرا کرنے سے لوگ تائب ہوئے ورنہ سلاطین عثمانیہ نے کس قدر خونریز جنگیں کیں۔ اور بارہا لشکر لے کر چڑھائی اور لڑائی کرتے رہے مگر یہ سعادت ان کے حصہ میں نہ تھی۔ اور میں نے بلا ایک قطرہ خون بہائے شاہانِ صفویہ کی اس بدعت قبیح پر جو سارے ملک پر چھائی ہوئی تھی فتح حاصل کر لی۔

میں نے کہا کہ انشاء اللہ سارا ایران جیسے پہلے سنی تھا اب پھر ہو جائے گا۔ شاہ نے کہا رفتہ رفتہ اس کے بعد سر اٹھا کر بولا کہ میں اگر فخر کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ میری ذات اس وقت مجموعہ ہے چار عظیم الشان سلاطین کا یعنی ہندوستان، افغانستان، توران اور ایران، کیونکہ ان چاروں ممالک کی زمامِ حکومت میرے ہاتھ میں ہے لیکن رفع تبرا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ تائیدِ الٰہی سے یہ امر حاصل ہوا ہے اور چونکہ میں ذریعہ ہوں، اس لئے تمام نظامِ اسلامی کی یہ خدمت مجھ سے ہوئی ہے مجھے اُمید ہے کہ صحابۂ کرامؓ میرے اس فعل سے خوش ہوں گے۔ اور آخرت میں میری شفاعت کریں گے۔

اس کے بعد مجھ سے کہاکہ تم ابھی ٹھہر جاؤ کل جمعہ ہے اور میں نے حکم دیا ہے کہ جامع کوفہ میں جمعہ پڑھا جائے۔ اور منبر پر حسب ترتیب خلفاء کا نام لیا جائے آخر میں خلیفہ عثمانی کے لئے دعا کی جائے۔ اس کے بعد میرے لئے کیونکہ میں ان کو اپنا بڑا اور بزرگ بھائی سمجھتا ہوں۔ ان کے باپ دادا پشتہا پشت سے اسلام کی خدمت کرتے چلے آئے ہیں۔ اور تم جانتے ہو کہ میں جب دنیا میں آیا تو میرا باپ سلطان تھا۔

میں دربار سے واپس آیا دیکھا کہ ہر ہر خیمہ میں ایرانی بیٹھے ہوئے اسی میثاق کا تذکرہ کر رہے ہیں اور اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے فضائل آیات واحادیث سے نکالتے اور شاہان صفویہ کی اس رسم تبرا پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔

دوسرے دن اعتماد الدولہ ظہر کے وقت مجھے لینے کے لئے آیا کہ چل کر جمعہ میں شرکت کروں۔ میں نے کہا کہ جامع کوفہ میں حنفیہ کے نزدیک بھی جمعہ نہیں ہو سکتا کیونکہ آبادی نہیں ہے اور شافعیہ کے نزدیک بھی کیونکہ باشندوں کی تعداد چالیس تک نہیں پہنچتی۔ اس نے کہا کہ آپ جمعہ نہ پڑھیں وہاں تو صرف آپ کی موجودگی درکار ہے۔ چنانچہ میں گیا۔ جماعت میں اُمراء خوانین، علما اور عوام تقریباً پانچ ہزار تھے۔ منبر پر شاہی امام تھا۔ اس نے خطبہ میں خلفاء کا حسب ترتیب نام لیا اور ان کی مدح کی پھر خلیفہ عثمانی اس کے بعد نادرشاہ کے لئے دعا مانگی اور امامیہ کے قاعدہ کے مطابق نماز پڑھائی۔ شام کے وقت شاہ نے مجھے واپسی کی اجازت دی۔ اور میں بغداد کو روانہ ہو گیا۔

صاحب جہاں کشائے نادری نے لکھا ہے کہ نادرشاہ نے مرزا محمد علی نائب وزیر کو روانہ کیا کہ وہ تمام ایران میں دورہ کر کے خطبوں میں خلفائے اربعہ کا نام داخل کریں اور سارے ملک میں اس محضر کی اشاعت کر کے تعمیل کرائیں۔

باب عالی میں بھی یہ ساری کیفیت لکھ کر درخواست کی کہ اب خلیفہ کو اسکے پانچوں مطالبات منظور کر لینے چاہئیں۔

ایک مدت تک سفیروں کی آمد و رفت ہوتی رہی مگر ترکی کے شیخ الاسلام اور سلطان محمود خاں نے اس کی دو باتوں سے انکار کر دیا۔ یعنی نہ مذہب جعفری کی صحت تسلیم کی نہ کعبہ میں پانچواں مصلّٰی منظور کیا باقی تین مطالبات تسلیم کر لئے۔

نادرشاہ بھی مصلحت وقت دیکھ کر ان دو امور کے مطالبہ سے دست بردار ہو گیا۔ بالآخر محرم ۱۱۶۰ھ میں فریقین میں عہد مصالحت لکھا گیا جس پر سلطان کی طرف سے لطیف آفندی عثمانی سفیر نے دستخط کئے۔

☆☆☆

سفر حج

(از رسالہ جامعہ اگست ۱۹۲۶ء)

یوں تو کئی سال سے دل میں خیال تھا کہ حج ایک اسلامی فریضہ ہے اس کو ادا کرنا چاہیئے۔ ورنہ قیامت میں باز پرس ہوگی۔ لیکن یہ خیال ارادہ تک بھی نہیں پہنچا تھا چہ جائیکہ عزم بالجزم، بارے اس سال جاذبہ رحمتِ الٰہی نے بھی گنہگار کو کھینچا۔ ارادہ پیدا ہؤا۔ اور فوراً عزم صمیم بن گیا۔ یہاں تک کہ اسی ہفتہ میں سامان سفر ٹھیک کر کے دہلی سے روانہ بھی ہوگیا۔ وطن میں والدہ مکرمہ اور نانی صاحبہ سے ملنے کے لئے بھی نہیں گیا۔ اور ان کی خدمت میں معذوری کے خطوط بھیج دیئے۔

رفیقِ طریق محترم خواجہ عبدالحیؒ صاحب اُستاد جامعہ تھے جن کی زبانی یہ معلوم ہؤا کہ مولانا عبدالقادر صاحب قصوری بھی عازم حجاز ہیں اس لئے ان کی خدمت میں خط بھیجا گیا۔ اور جہاز کے ٹکٹ کا بندوبست بھی انہیں کے ذمہ کیا گیا۔

میں اور خواجہ صاحب دونوں ۲۸ اپریل ۲۶ء کو بمبئی پہنچ گئے۔ اور مولانا عبدالقادر صاحب قصوری کے انتظار میں ان کے بیٹے مولوی محمد علی صاحب (کنٹب) کے یہاں قیام کیا۔ مولانا کے بمبئی آنے کے بعد وفدِ محمل بھی پہنچا۔ جس میں مولانا عبدالواحد صاحب غزنوی، مولوی داؤد صاحب غزنوی اور مولوی اسمٰعیل صاحب غزنوی شامل تھے۔ نیز دہلی کے حاجی بشیر الدین صاحب اور حافظ حمید اللہ صاحب بھی۔ اور یہ بھی معلوم ہؤا کہ اسی جماعت کے ذیل میں ہم دونوں کے نام بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ جو روزانہ انقلاب زمیندار میں شائع کئے جاتے ہیں۔ اور مولانا عبدالقادر صاحب اس وفد کے امیر قرار دیئے گئے ہیں۔

بمبئی میں حاجیوں کو لانے اور لے جانے والی تین کمپنیاں ہیں۔ ایک نمازی کمپنی جس کے غالباً چھ جہاز ہیں۔ انگلستان، تنگستان، سروستان، گرجستان وغیرہ۔ دوسری شوسنزی کمپنی جس کے صرف دو جہاز ہیں سلطانی اور ربانی تیسری مغل لائن کمپنی ہے جو پہلے مسلمانوں کی تھی اب ایک انگریز ٹرنر ماریسن کے

ہاتھ میں ہے۔ اس کے پاس متعدد جہاز ہیں ہمایوں، اکبر، جہانگیر، دارا اور شجاع وغیرہ۔

ہماری گفتگو نمازی کمپنی کے ساتھ تھی لیکن محمل کی شہرت سے جو کمپنی کے لئے ایک اشتہار کی شکل رکھتی تھی، مغل کمپنی کے ایجنٹ نے آکر ارکانِ وفد سے ملاقات کی اور کہا کہ اگر ہمارے جہاز سے محمل لے جایئے تو آپ لوگوں سے بجائے ساڑھے پانچسو کے فی کس چار سو روپیہ لے کر ہم اوّل درجہ کا واپسی کا ٹکٹ بھی دیدیں گے۔ یہ سُن کر بعضوں کی طبیعت مائل ہوئی مگر بالعموم لوگوں نے اس کو مناسب نہ سمجھا کہ کمپنیوں کی باہمی رقابت سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے، اس لئے نمازی کمپنی سے گفتگو جاری رکھی گئی اس نے نصف قیمت پر واپسی کے ۴ ٹکٹ اوّل درجے کے دیدیئے۔

نمازی کمپنی کی یہ بھی خواہش تھی کہ محمل کا جلوس نکال کر تمام بمبئی میں گشت کرایا جائے جس کے اخراجات کمپنی برداشت کرے گی۔ لیکن اہلِ حدیث جماعت نے اس کو پسند نہ کیا۔

اہلِ بمبئی چاہتے تھے کہ برقعہ اور حرام جو دہلی میں تیار ہوئے ہیں اُن کو دکھا دیئے جائیں لیکن وفد نے مناسب نہ سمجھا اور ہم لوگ مع محمل کے انگلستان نامی جہاز سے ۸ مئی کو روانہ ہو گئے۔

حاجیوں کے جہازوں میں انگلستان اچھا جہاز ہے۔ اس میں تقریباً ۷ فرسٹ کلاس اور ہزار گیارہ سو تھرڈ کلاس کے مسافروں کی گنجائش ہے لیکن چونکہ یہ سب سے آخری جہاز تھا اس وجہ سے اس پر حاجیوں کی تعداد بہت کم تھی تھرڈ کلاس کا کرایہ ۱۹۵ روپیہ سے گھٹا کر ۸۰ روپے تک کمپنی نے کر دیا تھا مگر پھر بھی ۳۶۵ آدمیوں سے زائد نہ ہوئے۔

بعض لوگ اہلِ حدیث میں سے جن کا ارادہ بھی حج میں جانے کا نہ تھا کچھ تو کرایہ کی کمی اور کچھ اہلِ حدیث وفد کی کشش سے سوار ہو گئے۔ جہاز پر خالی جگہ ہونے کی وجہ سے باقاعدہ پنجوقتہ نمازوں کی جماعتیں ہوتی تھیں وہ بھی دو دو، ایک غیر مقلدوں کی دوسری مقلدوں کی۔

میرا یہ پہلا بحری سفر تھا اور میں نے ہر وہ چیز جو کسی نے بحری سفر کے لئے ضروری بتائی تھی رکھ لی تھی۔ لیکن سمندر اس قدر ساکن ملا کہ کوئی اثر کسی قسم کا میرے اُوپر نہیں ہوا۔ بلکہ بہت فرحت اور خوشی حاصل ہوئی۔ سقوترہ میں جہاں ہمیشہ کچھ نہ کچھ طوفانی کیفیت رہتی ہے وہاں بھی میں خوش رہا حالانکہ بعضوں کو چکر بھی آئے، قے بھی ہوئی۔ خواجہ صاحب تو ایک دن، دن بھر اپنے بستر سے اُٹھ بھی نہ سکے۔ پانچ روز تک نیچے جہاں تک نظر جاتی تھی نیلا سمندر تھا اور اوپر نیلا آسمان، چھٹے روز سرزمینِ

عرب کا ساحل نظر آنے لگا۔ رات کو ہم عدن کے سامنے سے گذرے وہاں کے چراغ دکھائی دیئے ساتویں روز افریقہ کا ساحل بھی نظر آنے لگا۔ اور ہم باب المندب پہنچ گئے جہاں عربی اور افریقی ساحلوں میں بہت کم فاصلہ رہ جاتا ہے۔ آٹھویں روز قمران پہنچے۔ وہاں قرنطینہ کے لئے حاجیوں کے ہر جہاز کو ہم ۲ گھنٹے رکنا پڑتا ہے۔ ہم لوگ بھی اُترے۔ لیکن چونکہ نہ کوئی جہاز میں بیمار ہوا تھا نہ مرا تھا اس لئے غسل اور بھپارا دینے کے بعد ہم کو جہاز پر واپس جانے کی اجازت مل گئی اور صرف ۶ گھنٹے وہاں صرف ہوئے۔

حاجیوں کی تذلیل و توہین کا سلسلہ بمبئی ہی کے بندرگاہ سے شروع ہو جاتا ہے۔ قمران اسکا بدترین منظر ہے۔ پہلے ایک سائبان میں بیٹھے۔ پھر ایک ٹولی کم و بیش سو آدمیوں کی ایک ہال میں داخل ہوئی۔ اس میں سارے کپڑے جو جسم پر تھے اُتروا لئے گئے اور ایک لنگی باندھنے کو دیدی گئی۔ وہاں سے دوسرے ہال میں گئے جہاں تعداد شماری ہوئی۔ پھر تیسرے میں گئے جہاں سلیمانی۔ ہندی اور بنگالی وغیرہ الگ الگ کھڑے کئے گئے۔ اس کے بعد نہانے کے ہال میں پہنچے وہاں اُتارے ہوئے کپڑے بھپارہ سے نکال کر ملے۔ غرض یہ تمام مراحل طے کر کے لوہے کی جالیوں سے گھرے ہوئے احاطے میں پہنچے جہاں چھپّر ہیں۔ یہاں پہنچنے پر راحت نصیب ہوئی کیونکہ یہ صاف ستھرے ہیں اور ان میں خوشگوار ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں۔

یہاں حاجیوں کو پانی اور لکڑی سرکار دیتی ہے اور باقی ضروریات کے لئے بازار لگ جاتا ہے۔ چیزوں کا نرخ معیّن ہے۔ گوشت سستا ملتا ہے۔ مُرغ ایک روپے کا جوڑا۔ آم بھی ہم نے یہاں خریدے۔ لیکن صرف ان کی شکل آم کی سی تھی۔ مزہ کسی قسم کا نہ تھا، نہ کھٹے نہ میٹھے۔

یہاں کے ڈاکٹر صاحب سے مفصّل گفتگو رہی وہ کہتے تھے کہ قرنطینہ جلد ٹوٹنے والا ہے۔ غالباً اس کی بجائے جدہ میں قرنطینہ ہوا کرے گا۔

سلطان ابن سعود اس زمانہ میں جدہ میں تھے۔ وفد کی آمد کی اطلاع ان کو پہنچ چکی تھی۔ وائرلیس سے وقت بھی بتلا دیا گیا۔ جس وقت جہاز جدہ میں پہنچا، سلطانی کشتیاں اور ان کے آدمی ہم کو لینے کے لئے جہاز پر آگئے سارا سامان اُن کے سپرد کر دیا گیا۔ اور ہم لوگ موٹر بوٹ میں بیٹھ کر ساحل پر آئے۔ جہاں جدہ کے حاکم جو قائم مقام بولے جاتے ہیں مع ایک دستہ فوج کے استقبال کے لئے موجود تھے چند موٹریں تھیں جن پر سوار ہو کر ہم ایک مکان پر پہنچا دیئے گئے جو بالکل اس محل کے سامنے تھا جس میں

سلطان ٹھہرتے ہوئے تھے۔

بعد مغرب سلطان نے ملاقات کے لئے ہم لوگوں کو طلب کیا۔ اس وقت وہ پانچویں منزل کی چھت پر تشریف رکھتے تھے۔ معمولی دری کا فرش تھا اور اُمراء جدّہ اور بعض ارکانِ سلطنت موجود تھے۔ سلطان نے کھڑے ہوکر ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ مصافحہ کیا۔ مولانا عبدالقادر صاحب قصوری تعارف کراتے تھے۔ مولانا عبدالواحد صاحب غزنوی کو سلطان نے احترام کے ساتھ اپنے پاس بٹھایا۔ انھوں نے پہلے مولوی ثناء اللہ صاحب کا ذکر کیا کہ اب تک وہ اپنی غلطیوں سے رجوع نہیں کرتے۔

ایسا معلوم ہوا تھا کہ سلطان کو اس جھگڑے سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے کیونکہ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ رجوع کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد موضوعِ سخن بدل کر مسلمانوں کے باہمی تفرقوں پر افسوس کا اظہار کرنے لگے۔ پھر ہندوستان کے موسم اور بہار کی پیداوار وغیرہ کی نسبت پوچھنے لگے۔ چائے اور قہوہ کے دور گزر جانے کے بعد ہم کو واپسی کی اجازت ملی۔

دوسرے دن شام کو سلطان کے ملازم موٹریں لائے۔ ہم لوگ مغرب کے وقت مکّہ مکرمہ کو روانہ ہوئے۔ وسطِ راہ میں مقام بحرہ میں تقریباً ایک گھنٹہ ٹھہرے وہاں سے روانہ ہوکر شب کو گیارہ بجے حرم شریف کے پاس جاکر ہمارا موٹر کھڑا ہوا۔ راستہ میں بعض بعض مقامات پر ریت میں موٹر کے پھنس جانے کی وجہ سے اس قدر دیر ہوئی ورنہ جدہ سے مکہ دو گھنٹے سے زیادہ کا راستہ نہیں ہے اور سڑک تعمیر ہو جانے پر جو نصف بن چکی ہے صرف ڈیڑھ گھنٹہ کا راستہ ہو جائے گا۔

حرم میں پہنچ کر طواف اور سعی سے فارغ ہو کر تقریباً دو بجے شب کو معلّم نے ہم کو اس مکان میں پہنچا دیا جو محلہ جیاد میں ہمارے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ وہ مکان اگرچہ پنج منزلہ اور عالی شان تھا لیکن صبح کو اُٹھ کر ہم کو حبس اور گرمی کی تکلیف معلوم ہوئی۔ سامنے ہی متّصل جبل ابوقبیس تھا جس کی وجہ سے ہوا رکی تھی۔ اس وجہ سے ہم لوگ سویرے ہی اس مکان سے نکل کر کسوۃ خانے میں آ گئے جو قلعہ مکہ کے نیچے پہاڑ کے دامن میں مؤتمر کے سامنے غلاف کی تیاری کے لئے اسی سال پچاس ہزار روپیہ کی لاگت سے تعمیر ہوا ہے۔

یہ مکان کشادہ ہوادار، صاف ستھرا اور آرام دہ ہے اور حرم سے صرف تین منٹ کے فاصلہ پر واقع ہے۔ جب تک رہے اسی میں رہے نہ اس میں بدبو تھی، نہ مچھر۔ جو مکّہ کے مکانات میں عام ہیں۔ ہمارا

سارا سامان وہیں ہمارے پاس پہنچ گیا۔

مولوی ظفر علی خاں اڈیٹر زمیندار دو روز ہم سے پیچھے پہنچے۔ اور وہ بھی ہمارے ساتھ اس مکان میں ٹھہرے۔

حج کے قریب ہونے کی وجہ سے سلطان بھی ہمارے پہنچنے کے دوسرے دن مکہ میں تشریف لائے۔ تیسرے دن شام کو ہم کو اطلاع دی گئی کہ سلطان برقع اور حرام کو دیکھنے کے لئے ابھی مؤتمر میں تشریف لا رہے ہیں۔

مؤتمر ترکوں کے زمانہ کی شاہی عمارت ہے جس میں دربار کے لئے بڑے بڑے ہال ہیں۔ ہماری فرودگاہ اور مؤتمر میں صرف ایک سڑک کا فاصلہ تھا۔ ہم لوگ بھی پہنچ گئے۔ سلطان تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ان کے بھائی امیر محمد اور قاضی مکہ شیخ عبداللہ بن حسن بھی تھے اور بعض اعیانِ سلطنت۔

سلطان کے آنے کے بعد ایک دور شربت کا چلا اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ مناسب یہ ہے کہ ممالکِ اسلامیہ سے جو نامی اور ممتاز لوگ حج میں آئے ہوئے ہیں وہ بھی بلالئے جائیں تب یہ صندوق کھولے جائیں۔ ہم نے کہا کہ یہ رائے انسب ہے۔ چنانچہ معائنہ کل پر رکھا گیا اور سلطان تشریف لیگئے۔

دوسرے دن حکومت کی طرف سے دعوتی خطوط شائع ہوئے اور تقریباً پانسو معززین حجاج کو جس میں مصری ٹیونسی، یمنی، شامی، ترکی، ایرانی، تورانی، ہندی اور جاوی وغیرہ سب شامل تھے بھیجے گئے۔ شام کو مؤتمر میں مجمع ہوا اور برقع اور حرام کھولا گیا۔ جملہ حاضرین نے اس کو بہت پسند کیا اور تعریف کی۔ خاص کر مصریوں نے حالانکہ وہ ایک قسم کے حریف تھے۔ سلطان نے کہا کہ میرا خیال تھا کہ اچھا بنا ہوگا لیکن یہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ اس قدر اچھا بنا ہوگا۔

اس کے بعد ایک عرب نے تقریر کی جس میں سلطان کی اور ان کے عہدِ حکومت کی تعریف کی۔ پھر ایک دوسرے شخص نے نظم پڑھی۔ اور مولوی اسمٰعیل غزنوی نے غلاف کی تیاری کے متعلق مفصل کیفیت پڑھ کر سنائی۔

پھر یہ سارا مجمع اُٹھ کر چھت پر گیا جہاں چائے کی دعوت کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہر قسم کے انگریزی بسکٹ وغیرہ اور فواکہ جو اس وقت مل سکتے تھے میز پر تھے۔ مکھن اور پنیر بھی۔ عربی بھی اور انگریزی بھی اور مختلف قسم کے مربّے اور زیتون۔

سلطان کے پاس شعب مصری کا ایک نمایندہ بیٹھا تھا اس نے نہایت دلکش تقریر میں اپنی جماعت کی طرف سے اصلاحات حجاز پر سلطان کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی تقریر اس قدر بے تکلف اور لطیف تھی کہ سلطان بھی عش عش کر گئے۔ اور فرمانے لگے کہ میں بدو ہوں ایسی عمدہ اور لطیف تقریر نہیں کر سکتا۔ مگر تاہم مجھ کو اپنے بدو ہونے پر فخر ہے۔ میرا دل زبان کے ساتھ اور زبان دل کے ساتھ ہے۔ میں مصری قوم کو محبوب رکھتا ہوں کیونکہ مسلمانوں میں وہ علمی حیثیت سے ایک ترقی یافتہ جماعت ہے اور جو کوئی کسی حیثیت سے اسلام اور توحید کی خدمت کرے، میں اس کا غلام ہوں۔

شیخ سنوسی بھی اسی جگہ موجود تھے۔ شعب مصری کے نمائندے نے سلطان کو ان کی تکریم کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ دلائی۔ اس نمائندے کی عمر تقریباً پچاس سال تھی اور ڈاڑھی بالکل خش خشی۔

دوسرے دن اسی ٹکٹ پر محلِ شاہی میں دعوت تھی۔ ہر محلہ میں حکومت کی طرف سے مہمانوں کو اطلاع دیدی گئی کہ فلاں فلاں مقامات پر سرکاری موٹریں موجود رہیں گی۔ مہمان بعد نمازِ مغرب ان پر سوار ہو کر قصرِ شاہی پہنچیں۔

سلطان اپنے نوتعمیر محل میں جنت المعلیٰ کے سامنے جو مکہ کی آخری حد پر ہے۔ مہمانوں کے منتظر تھے۔ ہمارے لئے جو موٹروں کی جگہ مقرر تھی وہ حمیدیہ تھی جو کوتوالی ہے اور مسجد حرام سے بالکل متصل مغرب کی نماز سے فارغ ہوتے ہی ہم سوار ہو گئے اس وجہ سے دوسرے مہمانوں سے کسی قدر پہلے پہنچے۔ سلطان جس ہال میں تشریف رکھتے تھے۔ تقریباً ۷۰ فٹ لمبا ۴۰ فٹ چوڑا اور سادہ تھا۔ مگر قالینوں کے فرش اور نیز کی نشست وغیرہ کے انداز سے خاص شاہانہ عظمت نمایاں تھی سلطان اس کے ایک گوشہ میں بیٹھے تھے اور جابجا قرینہ سے محافظ دستہ کے سپاہی کھڑے ہوئے تھے جن کی سرخ عبائیں پنڈلیوں تک تھیں کمر میں پیٹی سینہ پر پرتلہ جن پر کارتوس لگے ہوئے اور ہاتھوں میں بندوقیں، سر پر سرخ رومال جو نجدیوں کا خاص شعار ہے اور ان پر سیاہ عقال۔

ان سپاہیوں کا قد بالعموم ساڑھے پانچ فٹ کا تھا اور اہلِ نجد کا اغلباً یہی قد ہوتا ہے۔ جسم چھریرا اور رنگ خالص عربی یعنی زرد سیاہی مائل۔ اپنی سرخ قباؤں میں بت کی مانند غیر متحرک کھڑے ہوئے گھونگچی کی طرح یہ ہال کا ایک سامانِ آرائش معلوم ہوتے تھے کسی طرح کا سپاہیانہ رعب ان سے نمایاں نہ تھا اکثر یہ لڑکے تھے۔ اور نجدیوں کے چونکہ ڈاڑھی مونچھ بھی کم ہوتی ہے۔ اس لئے زیادہ عمر والے بھی لڑکے

ہی معلوم ہوتے تھے چستی اور نشاط ان سے بیشک ٹپکتی تھی۔ اور ان کی تیز نگاہیں ہر وقت اپنے آقا کیطرف لگی رہتی تھیں۔

مہمان جب پہنچتے تو درباری آگے ہوتا اور ایک سپاہی پیچھے پیچھے ساتھ ساتھ۔ اسی طرح سلطان تک اس کو پہنچاتے۔ سلطان اٹھ کر اس سے مصافحہ کرتے۔ پھر درباری اس کو مناسب جگہ بٹھا کر واپس جاتا اور جُندی الٹے پاؤں اپنی جگہ جا کر کھڑا ہو جاتا۔

میری کرسی سلطان کے سامنے متصل ہی تھی۔ اور ظفر علی خاں بھی میرے ساتھ ہی تھے۔ سلطان کے دائیں پہلو پر سلطان مکلّا ان کے بعد شبلی اور پھر مولانا عبدالقادر صاحب قصوری تھے۔ بائیں طرف شیخ سنوسی تھے اور امام ادریسی کا بیٹا جو سوٹ بوٹ اور ترکش کیپ میں تھا۔ سامنے نجدی اور ترکی اور مصری رُؤسا تھے۔ خالد لوئی بھی تشریف لائے تھے اور اس وقار اور تمکنت سے بیٹھے تھے کہ احنف بن قیس کی تاریخی شخصیت ان کو دیکھ کر یاد آتی تھی۔ ان کے متصل یمنی وفد کے ارکان تھے جو اپنی سفید عباؤں اور بڑے بڑے عماموں سے ممتاز نظر آتے تھے۔

جب ہال بھر گیا تو سلطان نے جو نہایت سادہ لباس میں سنجیدہ سکون کے ساتھ بیٹھے تھے فرمایا کہ مسلمانوں کو دو چیزوں کے جاننے کی ضرورت ہے۔ ایک تو چاہیئے کہ وہ اسلام کو پہچانیں۔ دوسرے خود مسلمانوں کو۔ کیونکہ ہم میں باہمی تعارف نہ ہونے کی وجہ سے بہت غلط فہمیاں ہیں۔ اس کے بعد وہ اس دردناک تفریق کا مرثیہ پڑھتے رہے جو بدقسمتی سے مسلمانوں میں اس وقت واقع ہیں۔

مجھے سلطان کے طور طریق اور ان کی باتوں سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ ایک وسیع القلب اور روادار سلطان ہیں۔ تعصب سے ان کا رتبہ بالا تر ہے اور اس اخوت اور مساوات کے طلبگار ہیں۔ جس کی اسلام تعلیم دیتا ہے۔ وہ مذہبی تفرق سنیت اور شیعیت۔ مقلدی اور غیر مقلدی وغیرہ سے بیزار ہیں اور گو نام کے لئے حنبلی کہلاتے ہیں مگر حنبلیت، حنفیت اور شافعیت وغیرہ کو بھی بہر صورت تفرق ہی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اچھا مسلمان بنانے کے لئے صرف کتاب و سنّت کافی ہے۔ محفل میں ہر پندرہ منٹ کے بعد قہوہ یا چائے کا دور حسب معمول چلتا رہا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ یہ محفل رہی۔ اس میں سوائے سلطان کے اور کسی نے کم گفتگو کی۔ ان کی تقریر بھی کسی ایک موضوع پر نہ تھی۔ عشاء کے وقت ضیافت کی تیاری کی اطلاع پا کر وہ مہمانوں کو لے کر اُٹھے۔

میرا خیال تھا کہ بدویانہ سادی دعوت ہو گی۔ لیکن کھانا میزوں پر چنا ہوا تھا۔ اور نشست کرسیوں پر تھی۔ چھری کانٹا اور تمچہ بھی تھا۔ سالن متعدد قسم کے تھے اور کوفتہ شامی کباب اور مرغ مسلّم بھی۔ اچار اور مربے بھی کئی قسم کے تھے۔ پڈنگ بالکل انگریزی وضع کی اور کئی طرح کی تھی۔ خربوزے، کشمش اور ملٹے بھی تھے۔ اور عرب کا خاص شاہی کھانا یعنی کوزی جو مسلّم دنبہ کا پلاؤ ہوتا ہے اور قیمتی کھانا سمجھا جاتا ہے۔ خدام میزوں کے آگے کھڑے ہوئے تھے کہ کھانا سامنے بڑھائیں اور برف آب پلائیں۔

مہمانوں کا کچھ حصہ ایک بڑے ہال میں تھا جس میں برقی روشنی اور برقی پنکھے تھے۔ بقیہ ہال سے باہر کھلی ہوئی چھت پر تھے۔ ضیوف کی تعداد میرے خیال میں ایک ہزار سے کم نہ تھی مگر کھانے کی مقدار اتنی تھی کہ جب ہم اُٹھے ہیں تو میزیں پُر تھیں۔ غالباً نجدی فوجوں نے ان کو ختم کیا ہوگا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم اُوپر کی چھت پر گئے۔ جہاں نشستوں کا انتظام تھا۔ سلطان وہاں بھی ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ مہمان کرسیوں اور بازوؤں کی نشستوں پر۔ پہلے چائے اور پھر قہوہ کا دور چلا۔ اس کے بعد کسی قاری نے ایک رکوع تلاوت کیا۔ پھر حرم کے امام شیخ ابو سمع عبداللہ نے ایک مختصر تقریر کی جس کا مضمون یہ تھا کہ مسلمانانِ عالم کو اصلاحاتِ حرم میں سلطان کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔ اس کے بعد مولوی ظفر علی خاں نے اپنی اُردو نظم سُنائی۔ میں نے اس کا عربی میں ترجمہ لکھ دیا تھا۔ اور ایک تمہید بھی نظم سنانے کے بعد انہوں نے اس تمہید اور ترجمہ کو سنایا کہ سامعین سمجھ سکیں۔

مولوی صاحب موصوف نے یہ نظم دراصل اس جلسے کے لئے لکھی تھی جو اس سے اگلے دن مؤتمر میں ہوا تھا۔ جلدی میں یہ نظم میرے نزدیک کچھ موقع کے حسب حال نہ ہو سکی۔ میں نے ظفر علی خاں سے کہا بھی۔ لیکن انہوں نے جواب دیا کہ اب جو کچھ بھی لکھی گئی ہے۔ اس کو پڑھ دینا چاہیئے۔ اس روز موقع نہ مل سکا۔ اس لئے دعوت میں سنائی۔ اس کا مطلع یہ تھا۔

جب اُٹھاتا ہے حرم میں آستینِ ابنِ سعود جیب سے لاتا ہے نذر گوہریں ابنِ سعود

تقریباً دس بجے شب اور عربی حساب سے ۴ بجے واپس آئے۔ کیونکہ وہاں غروب آفتاب کے وقت بارہ بجائے جاتے ہیں۔

سلطانی ضیافت خانے سے جو کھانا ہمارے لئے آتا تھا وہ ہمارے موافق نہ تھا اس وجہ سے ایک باورچی وہاں سے طلب کر لیا گیا اور خام رسد منگوا کر اس سے اپنے حسب منشا کھانا پکوانے لگے

۲۸ رمئی کو ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ تھی اس روز حج کو روانگی ہوئی۔ موٹروں کی اجازت نہ تھی خود سلطان اور شاہزادے اونٹوں پر گئے ہمارے لئے بھی اونٹ ہی آئے مگران کے شغدفوں پر بجائے ٹاٹ کے معمولی پردوں کی نئی دریاں سلطان کے حکم سے خرید کر ڈالی گئی تھی۔ سب کے عدیل مقرر ہو گئے ظفر علی خاں نے مجھ کو منتخب کیا مگر شغدف پر اپنا ٹفن بکس اور بستر رکھ کر پیدل روانہ ہو گئے۔ میں نے کہا یہ کیا؟ کہنے لگے کہ پا پیادہ حج کروں گا۔ اب ہم بیعدیل رہ گئے اور شغدف کا توازن قائم نہ رہ سکا۔ جنت المعلیٰ سے آگے نکل کر ایک پہلو نیچا اور ایک اونچا ہو گیا۔ جمال چلایا کہ یا شیخ المیزان اتنے میں ظفر علی خاں نظر پڑے کہ ایک نہایت چھوٹے گدھے پر جن کو میں ملّہ کی بائیسکل کہا کرتا تھا تیزی کے ساتھ منا کی طرف بھاگے جا رہے ہیں اور پیچھے پیچھے مولوی اسمٰعیل غزنوی بھی ہیں۔ ٹانگیں اس خوف سے کہ زمین سے نہ بھڑ جائیں دونوں نے گدھوں کی گردنوں کے برابر اٹھا رکھی تھیں۔ غرض ایک دلچسپ تماشا تھا میں نے جمال سے کہا کہ دیکھ المیزان وہ گدھے پر بھاگا جا رہا ہے۔ آخر اس نے میرے ہم وزن پتھر لا کر رکھ دیئے اس تدبیر سے کچھ توازن ٹھیک ہؤا۔

رات منا میں گزار کر صبح کو روانہ ہوئے اور دس بجے دن کے اس مقدّس میدان میں پہنچے۔ جہاں حج ہوتا ہے، سلطانی خیمہ کے متّصل مہمانوں کا خیمہ تھا اور ایک دن کی ضروریات کا پورا سامان کر دیا گیا تھا تھوڑی دیر کے بعد ہمارے ساتھیوں نے مسجد نمرہ کا قصد کیا جہاں ظہر اور عصر دونوں نمازیں ظہر ہی کے وقت جمع کر کے پڑھی جاتی ہیں۔ گرمی اور طبیعت کی کمزوری سے ہم سے یہ سنّت ادا نہ ہو سکی۔ سلطان اور شاہزادے اور بعض احباب ہمت کر کے وہاں پہنچ گئے۔ واپسی کے بعد وقوف کا وقت آیا۔ سلطان نجد اور اس کی فوج نیز یمنی اور بدوی اعراب جن کی تعداد لاکھ سوا لاکھ ہو گی، جامہ احرام پہنے سر کھولے ہوئے اس آتشیں دھوپ میں جبل عرفات پر اور اس کی وادی میں جا کر تقریباً دو ڈھائی دن کے کھڑے ہو گئے۔ کچھ اونٹوں پر تھے اور کچھ پیدل۔ اسی طرح غروب آفتاب تک ان لوگوں نے وقوف کیا۔ کسی ہندی یا جاوی کی یہ ہمت نہ تھی کہ وہاں جا کر کھڑا ہوتا۔ حقیقت میں وقوف عرفات کا حق عربوں ہی نے ادا کیا۔ دور سے یہ پہاڑ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تصویر کا ایک مرقع ہے۔ ہم لوگ خیمہ سے سر نکال کر کبھی کبھی دیکھتے تھے۔ اور پھر دھوپ کی تپش سے اندر کھینچ لیتے تھے۔

چار بجے کے بعد آندھی آئی جس میں خیمہ گر گیا۔ خفیف بوندیں بھی پڑیں جن سے کسی قدر تپش کم ہو

گئی۔ اس وقت میں نے ایک عرب کو ساتھ لیا اور جبلِ عرفات پر پہنچا۔ دیکھا کہ نجدی کھڑے ہوئے تسبیح اور تہلیل اور دعاؤں میں مشغول ہیں۔ ان کی ناکوں میں روئی کی بتیاں پڑی ہیں۔ غالباً رعاف کی عربوں میں کثرت ہے۔ کیونکہ میں نے طواف میں بھی ان کو ناکوں میں بتیاں ڈالے دیکھا۔

وہاں سے جبلِ رحمت کی طرف آیا اور پھر میدانِ عرفات کا ایک نظری جائزہ لیا۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ وہاں کم و بیش تین لاکھ آدمی ہوں گے

بعد غروب آفتاب وہاں سے کوچ ہوا پھر ہم اونٹ پر بے مدیل تھے اور ظفر علی خاں پیدل ایک پہر رات گئے مزدلفہ میں آئے۔ وہاں بستر لگا دیئے گئے۔ مغرب اور عشا کی نماز ایک ساتھ ادا کی گئی اور کچھ کھا پی کر سو رہے۔

مشعر الحرام کے متصل خصوصیت کے ساتھ قرآن میں حکم ہے کہ ذکر الٰہی ہو (۲/۱۹۸) لیکن حجاج نے اسکا مطلق خیال نہ کیا الا ماشاء اللہ۔ عام طور پر قہوہ نوشی اور کھانے پینے ہی میں لوگ مشغول رہے۔

صبح کو مزدلفہ سے منا میں آ گئے جو ایک میل کے فاصلے پر ہے یہاں خیمہ لگا ہوا تھا آرام کے ساتھ اس میں ٹھہر گئے۔ دوپہر کے قریب قربانی سے فارغ ہوئے۔ سنّت یہ ہے کہ اسی دن مکہ میں آکر طواف و سعی کریں لیکن گرمی کی حدت نے پھر ہماری ہمتیں پست کر دیں اور یہ سنّت نہ ادا کر سکے۔ بارہویں تاریخ کو جب واپس آئے اس وقت اس کو ادا کیا۔

ارکانِ وفد میں سے کچھ مکہ میں رہنا چاہتے تھے کچھ مدینہ کا ارادہ رکھتے تھے۔ میں اسی آخری جماعت میں تھا مگر طبیعت یکایک ناساز ہو گئی۔ اس لئے اس گرمی میں تابِ سفر نہ لا کر اکیلا جدہ واپس چلا آیا اور اسی جہاز میں جس میں گیا تھا بلکہ اسی کیبن میں پھر واپس آیا۔ ۷ جون کو مکہ سے روانہ ہوا تھا آٹھ روز جدہ میں رہا۔ ۱۲ جون کو جہاز پر سوار ہو کر ۲۲ جون کو بمبئی میں اُتر گیا۔

:.......:.......:

حالاتِ حج

(از رسالہ جامع اکتوبر سنہ ۲۸ء)

اہل بمبئی حجاج کی خوب امداد اور خدمت کرتے ہیں۔ بعض تجار مسافر خانہ سے جہاز تک ان کو پہنچانے کے لئے لاریاں مفت بھیج دیتے ہیں۔ کھانے بھی کھلاتے ہیں اور چائے اور شربت بھی پلاتے ہیں۔ یہی حال اس وقت ہوتا ہے جب حاجی حج کر کے واپس آتے ہیں اور بمبئی میں اُترتے ہیں۔ انجمن خدام النبی خصوصیت کے ساتھ اس میں حصہ لیتی ہے۔ اس انجمن کی طرف سے چند آدمی ہمارے جہاز پر بھی تھے، جنہوں نے قمران میں پہنچ کر برف اور شربت کی سبیل لگائی پھر مکہ اور منیٰ میں اور شاید عرفات میں بھی۔

جہاز پر سوار ہونے سے ایک دن پہلے سامان رکھا جاتا ہے۔ حجاج کو میں نے دیکھا کہ اجازت ملنے پر وہ اچھی جگہ لینے کے لئے عجلت کے ساتھ سیڑھی پر ایک دوسرے کو دھکا دیتے اور گراتے ہوئے آگے بڑھے۔ کمزور بڈھوں اور بچوں کی عجیب حالت تھی۔ کئی گرے اور کئی کچل گئے۔ میں سوچنے لگا کہ یہ قوم جو اس قدر بے نظم اور خود غرض ہے۔ دنیا میں کسی کو وحشی کہنے کا حق نہیں رکھتی۔

اس جہاز میں فرسٹ کلاس کا ڈک بہت بڑا اور وسیع تھا اس وجہ سے ہم لوگوں کو ہر قسم کا آرام تھا۔ کھانے پینے کی ایسی آسائش تھی کہ حضر میں بھی مشکل سے ہو سکتی ہے اور یہ مولانا عبد القادر صاحب کا فیض اور انتظام تھا۔

مولانائے موصوف سے پیشتر سے شناسائی تھی لیکن اس سفر کی رفاقت میں ان کے عقلی اور علمی ظاہری اور باطنی اوصاف کو دیکھ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ اسلامی پنجاب کے تاج ہیں۔

حجاج کے جہازوں میں جو ہندوستان سے جاتے ہیں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ان کو کھانا اپنے ہاتھ سے پکانا پڑتا تھا۔ جس کی وجہ سے جہاز میں دھواں، گرمی اور فی الجملہ گندگی بھی رہتی ہے۔ حالانکہ یہی جہاز دوسرے ممالک مثلاً جاوا، سماٹرا اور سنگاپور وغیرہ سے جب حاجیوں کو لے جاتے ہیں تو ان کے کھانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں کمپنیوں سے گفتگو کی جائے تو آسانی سے یہ دقت رفع ہو سکتی ہے۔ کیونکہ حجاج کو سخت تکلیف

ہوتی ہے اور بڑا سامان لادنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ لکڑی چیرنے کے لئے کلہاڑیاں بھی ساتھ رکھنی پڑتی ہیں۔

ملّاجی[1] یعنی مولوی نثار احمد صاحب کانپوری بھی اس جہاز پر تھے، جو روزانہ اپنے مریدوں کو جمع کر کے وعظ فرماتے تھے ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ بمبئی سے میں کوئی زادِ راہ لے کر نہیں چلا تھا، مگر اللہ کی مہربانی دیکھئے کہ قورمہ اور پلاؤ دیتا ہے۔ میں نے کہا یہ مواعظ جو آپ کی جھولی میں تھے۔

ملّاجی کا یہ آٹھواں حج تھا۔ اُن کو اس سفر کا اچھا تجربہ ہے اور آدمی نہایت مستعد اور جفاکش ہیں۔ ساتھیوں کو خوب آرام دیتے ہیں، واپسی میں بھی میرا ان کا ساتھ اسی جہاز پر رہا۔ انہوں نے جو آرام پہنچایا میں اس کا شکر گزار ہوں۔

وہابیوں سے نہایت بیزار ہیں۔ یہاں تک کہ جدہ سے مکّہ اور مکّہ سے مدینہ کا سفر پاپیادہ کیا تاکہ کوشان[2] نہ دینا پڑے اور ان کا کوئی پیسہ وہابی حکومت کو نہ ملے۔ میں نے یہ بھی سنا کہ انہوں نے نمازی کمپنی سے اپنے کرایہ میں سے وہ پندرہ روپے بھی معاف کرا لئے تھے جو کمپنیوں کو فی کس حجازی گورنمنٹ کو دینے پڑتے ہیں۔

ایک دن ہماری حقہ نوشی کی محفل میں جو جہاز پر اکثر گرم رہتی تھی ملّاجی بیٹھ گئے اور فرمانے لگے کہ مسجد حرم کا ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ چاہے کتنے ہی آدمی آ جائیں وہ پُر نہیں ہوتی۔ دوسرا یہ کہ بدو پہاڑوں سے پتھر لا کر لاتے ہیں وہ قدرتِ الٰہی سے ترازو بن جاتے ہیں۔ ان کے اس بیان سے محفل پر جو لطیف کیفیت طاری ہوئی تھی اس کے شاہد حافظ حلیم صاحب کانپوری ہیں اور غلام کبریا صاحب انجینئر۔

جہاز میں آقائے معتمد الاسلام شیرازی بھی تھے۔ ان سے شعر و شاعری کے سلسلہ سے تعارف ہوا۔ آدمی نہایت وسیع الخیال تھے اور مسلمانوں کی فرقہ بندیوں سے سخت نالاں۔ کہتے تھے کہ ان مذہبی تفرقوں کا اثر ہمارے دنیاوی معاملات پر نہایت بُرا پڑ رہا ہے۔ ان کے ایک بھائی جو معمر اور وجیہ تھے مجتہد تھے۔ اثنائے گفتگو میں وہ بھی آ کر بیٹھے۔ فرمانے لگے کہ یہ اختلافات اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ دونوں فریق کے اہلِ علم چاہیں بھی تو اتفاق نہیں کرا سکتے۔ میں نے کہا کہ یہ اختلاف ڈالا کس نے۔ علاوہ بریں فروعی امور میں اتفاق نہ بھی ہو تو کیا حرج ہے۔ ہم میں اصولی اسباب

---

[1] مولوی صاحب موصوف اپنے آپ کو ملّاجی کہتے ہیں۔ یہ لقب غالباً انہوں نے ملّا سیف الدین طاہر کے جواب میں اختیار کیا ہے۔

[2] کوشان روٹی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ ایک حقیر سی رقم بھی دینی پڑتی ہے۔

اتفاق کے اس قدر ہیں کہ اگر چاہیں تو متحد ہو سکتے ہیں۔

بمبئی کے ایک مرشد بھی جو شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ہیں۔ ہمارے جہاز پر تھے۔ آدمی دلچسپ اور خوش آواز تھے۔ ہر حلقہ کی سیاسیات علیحدہ ہوتی ہیں۔ ان کے کچھ مرید جنوبی افریقہ نٹال وغیرہ میں ہیں۔ وہاں قادیانی مبلغ پہنچ گئے تھے اور خواجہ کمال الدین کا بھی دورہ ہوا تھا۔ پیر صاحب موصوف کو ان کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان کی تمام تر گفتگو اپنی انھیں فتوحات کے متعلق تھی جو انہوں نے اس جدید مرزائی اثر پر حاصل کی تھیں۔

اثنائے گفتگو میں ایک دن فرمانے لگے کہ ہندوستان میں جہاں سوائے مذہب حنفی کے اور کوئی مذہب نہ تھا، کہاں سے وہابی اور قادیانی وغیرہ فرقے پیدا ہو گئے۔ میں نے کہا کہ حالات اور خیالات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ آپ کے جدِّ امجد شیخ جیلانی حنبلی تھے پھر آپ کیسے حنفی بن گئے۔

جدہ میں جہاز ساحل سے دور کھڑا ہوتا ہے، کیونکہ کنارے پر پہاڑیوں کے چھکے ہیں جن میں وہ جا نہیں سکتا۔ جدہ کی پنج اور شش منزلہ عمارتیں جو سفید مٹی کی بنی ہوئی ہے جہاز پر سے نہایت شاندار معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہاں کے ایک رئیس جو ہم لوگوں کو جہاز پر لینے آئے تھے کہنے لگے کہ دیکھئے یہ ہمارا لندن ہے، یہ ہمارا پیرس ہے۔

جدہ میں حاجیوں کے لئے مسافر خانے کم ہیں، اور اہل جدہ تھوڑی رقم لے کر محض دو ایک روز کے لئے ان کو اپنے مکانوں میں ٹھہرانا اور اپنے ساز و سامان و فروش کو خراب کرنا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے فی الجملہ حجاج کو یہاں ٹھہرنے کی تکلیف ہے۔ بعض ہندوستانی ریاستوں کے رباط یہاں ہیں لیکن وہ بالکل دوسرے مصرف میں ہیں۔ حجاج کے کام نہیں آتے۔ کاش وہ ریاستیں اس کی طرف توجہ کرتیں۔

جدہ چھوٹا سا شہر ہے لیکن شاندار ہے۔ وہاں الفلاح نامی ایک مدرسہ ہے جس میں معمولی نوشت و خواند کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس کی عمارت اچھی ہے۔ ایک دوسرا مدرسہ حکومت کی طرف سے بھی قائم ہوا ہے۔

جدہ اور نیز مکہ میں موٹر کمپنیاں حجاج کے لئے کثرت سے ہیں۔ اس وقت حجاز میں ۶۰۰ سے زائد موٹر لاریاں کرایہ پر چل رہی ہیں۔ سب سے بڑی کمپنی شرکت سعودیہ ہے۔ جو امرائے حجاز کی ہے۔ النجاح کمپنی میں ہندوستانیوں کا حصہ زیادہ ہے۔ یہی سب سے آرام دہ ہے۔ کیونکہ اس میں پنجابی لڑکے ڈرائیور ہیں جو ہوشیاری

کے ساتھ گاڑیوں کو چلاتے ہیں اور حجاج کو آرام پہنچاتے ہیں۔ دوسری کمپنیوں میں زیادہ تر کمزوری (سوڈانی حبشی) یا عرب ڈرائیور ہیں جو بے تحاشا چلاتے ہیں اور اپنی ناواقفی سے گاڑیوں کو بھی خراب کرتے ہیں اور حاجیوں کو بھی تکلیف دیتے ہیں۔ مکہ اور جدہ کے درمیان میں تھوڑا سا حصہ ریگِ رواں کا پڑتا ہے۔ اس میں میں نے بہت سی موٹریں اور لاریاں پھنسی پڑی دیکھیں جن میں سے کوئی تو ٹوٹ گئی تھی اور کسی کا انجن جل گیا تھا۔ پنجابی ڈرائیور اس ریتے میں سے صفائی کے ساتھ موٹریں نکال لے جاتے ہیں۔

بجز اس چار پانچ میل کے جس میں ریگِ رواں ہے بقیہ راستہ موٹر کے لئے برا نہیں ہے۔ اب حکومت کی طرف سے سڑک بن رہی ہے جو غالباً سال آئندہ تک تیار ہو جائے گی۔ سڑک ہموار کرنے والے دو انجن بھی راستہ میں ہم نے دیکھے۔ لیکن ساری وقت پانی کی ہے۔

ہم خصوصیت خاص کی وجہ سے اپنا موٹر مسجد حرام تک لے جا سکے۔ ورنہ عام طور پر حجاج مکہ سے باہر ہی کرشان کی چوکی پر موٹروں سے اتار دیئے جاتے ہیں اور وہاں سے پیدل شہر میں داخل ہوتے ہیں۔

یہ سارا خطہ غیر ذی ذرع یعنی باصطلاح پٹواریان "ناممکن ہے" اور کیسا ناممکن جس میں نہ کہیں گھاس ہے نہ سبزی نہ جھاڑی ہے نہ کھجور۔ جدہ سے مکہ تک راہ میں پچاسوں اونٹوں کی لاشیں پڑی دیکھیں مگر پانی کے فقدان سے نہ کوتے تھے نہ چیل، نہ گدھ نہ گیدڑ۔

مکہ کی عمارتیں جدہ سے بھی زیادہ شاندار اور بڑی ہیں۔ اس کی آبادی کا اندازہ ایک لاکھ ہے۔ مگر گنجائش دو لاکھ سے زائد نفوس کی ہے۔ یہاں عراقی گھرانے کم ہیں۔ زیادہ تر سوڈانی اور ہندی وجاوی وغیرہ ہیں۔ بازاری اور مزدوری پیشہ طبقہ بالعموم سوڈانیوں کا ہے۔ قہوہ خانے بہت ہیں۔ جن کے آگے شغدف والی چارپائیاں سینکڑوں کی تعداد میں دور تک پڑی رہتی ہیں اور انہیں پر قہوہ اور چار نوشوں کا صبح اور شام جمگھٹا رہتا ہے۔

بازاروں میں کھانے پینے اور ضروریات کے سامان بھرے پڑے ہیں۔ لیکن پانی کی قلت ہر جگہ نمایاں ہے نہ بازار کے آدمی صاف ہیں نہ کپڑے نہ میز نہ برتن۔

باشندے بالعموم مجاورانہ ذہنیت کے ہیں۔ نہ ان میں تمکنت ہے نہ رعونت، نہ غصہ ہے نہ جوش، ان کا سارا کاروبار حجاج کے لئے ہے اور وہی ان کی آمدنی کا ذریعہ ہیں۔ ان کو خوش رکھنا اور آرام پہنچانا چاہتے ہیں لیکن تھوڑے نفع کی توقع پر۔ سیدھے اور نیک لوگ ہیں۔ خود معتبر ہیں اور دوسروں پر اعتبار کرتے ہیں اور جب سے آلِ سعود کی حکومت قائم ہوگئی ہے۔ بالعموم سب کے سب نماز اور جماعت کے پابند ہوگئے ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے

اذانیں ہوتی تھیں اور لوگ قہوہ خانوں میں بیٹھے چائے اور سگرٹ پیتے، گپ شپ کرتے بلکہ تاش کھیلتے رہتے تھے۔ جو اب تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسجد حرم میں نمازیوں کی کثرت رہتی ہے۔ چنانچہ پہلے ہی دن مغرب کی نماز میں مَیں نے دیکھا کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں آدمی صف بستہ باہر سڑک پر کھڑے ہوئے جماعت میں شریک ہیں۔ اس وقت ملّا جی بہت یاد آئے۔

مسجد میں تقریباً ۸۰ ہزار آدمیوں کی گنجائش ہوگی مجھے یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ کیا سوچ کر ترکوں نے اس کی عمارت مربع یا مستطیل بنوائی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے ہر چار سمت گوشوں پر کعبہ کی طرف رُخ کرنے کے لئے صفیں گول کرنی پڑتی ہیں۔ جس سے جا بجا سے ان کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے اور ہر دالان میں جہاں چھ صفوں کی گنجائش ہوسکتی تھی تین صفوں کی بھی نہیں رہتی۔ یہ مسجد بجز مدور شکل کے اور کسی صورت میں نہیں ہونی چاہئے۔

مطاف میں سنگ مرمر ہے اگرچہ ادنیٰ قسم کا ہے۔ اس کی وجہ سے طواف میں آسانی ہوتی ہے، کیونکہ وہ دوپہر کو زیادہ گرم نہیں ہوتا۔

موسم حج میں ۲۴ گھنٹوں میں سے ایک منٹ کے لئے بھی یہ جگہ خالی نہیں رہتی خاص کر صبح اور شام کو بڑا ہجوم رہتا ہے اور ہزاروں مسلمان پروانوں کی طرح کعبہ کے اردگرد طواف میں مشغول رہتے ہیں۔ جب آپ مسجد میں داخل ہوں گے دور ہی سے معلموں کا شور سنائی دے گا جو ایک ٹولی اپنے پیچھے لئے ہوئے طواف کرا رہے ہیں۔ بلند آواز سے دعائیں پڑھتے جاتے ہیں اور پیچھے پیچھے حجاج انہیں لفظوں کو دہراتے ہیں۔

بڑا ہجوم حجرِ اسود پر ہوتا ہے کیونکہ ایک وقت میں صرف ایک ہی شخص اس کا بوسہ لے سکتا ہے اور ہر طواف کرنے والا اس تقبیل کا خواہاں رہتا ہے۔ اس وجہ سے وہاں خواجہ سرا بید لئے ہوئے کھڑے رہتے ہیں اور جو تقبیل میں ضرورت سے زیادہ دیر لگاتا ہے اس کے مونڈھے پر مارتے ہیں جس سے وہ فوراً آگے بڑھ جاتا ہے اور دوسرے کو تقبیل کا موقع ملتا ہے۔

حجاج اس تقبیل کے ایسے عاشق ہوتے ہیں کہ جماعت کے وقت بھی حجرِ اسود سے لپٹے رہتے ہیں۔ بڑی مشکلوں سے خواجہ سرا مغرب اور صبح کے وقت مطاف میں صفیں کھڑی کر پاتے ہیں۔ اس پر بھی بعض لوگ صفوں کے آگے سے نکلتے ہوئے جاکر لپٹ جاتے ہیں اور بعض بعض جماعت میں شریک ہی نہیں ہوتے۔ منتظر بیٹھے رہتے ہیں، سلام پھیرتے ہی بلکہ پہلے ہی اچھل کر وہاں پہنچتے ہیں۔ خواجہ سرا صفوں کی ابتری کے خیال سے فوراً اٹھ کر ایسے لوگوں کو روکتا ہے اور بزور بید پھر نظام قائم کرتا ہے۔

مولانا فاخر صاحب الہ آبادی نے مجھ سے کہا کہ دیکھئے یہ وہابی قرآن کی نص صریح ومن دخلہ کان امنا دیتے ہیں کے کسقدر خلاف کرتے ہیں کہ حرم میں حجاج کو بید سے مارتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ انتظام وہابیوں سے بہت پہلے سے چلا آتا ہے اور اگر اس آیت کے یہی معنی لئے جائیں کہ وہ بنیادی گرفت یا سزا سے محفوظ رہے گا جو میرے نزدیک صحیح نہیں ہیں تو بھی مسجد کے اندرونی نظام کو قائم رکھنے کے لئے یہ محاسبہ ضروری ہوں گے ورنہ طواف اور نماز باجماعت سب میں مشکل پڑ جائے گی۔

مولانا کو دوسری شکایت یہ تھی کہ عورت اور مرد ساتھ طواف کرتے ہیں۔ کسی مصری عورت نے ان کو دھکا بھی دے دیا تھا جس سے پہلو میں درد بتلاتے تھے۔

میں نے کہا کہ مؤتمر میں یہ طے ہوا تھا کہ صبح اور شام ایک ایک گھنٹہ عورتوں کے لئے مخصوص کر دیا جائے لیکن یہ چل نہ سکا کیونکہ ان کے ساتھ ان کے ذی محرم بھی آنے لگے اور مخلوط طواف ہونے لگا، علاوہ بریں علماء نے فتوے دیئے کہ زمانۂ رسالت سے جو دستور چلا آتا ہے اس میں دخل نہیں دینا چاہئے۔ لیکن تاہم سلطان اس زمانہ میں مخلوط طواف کو مصلحت کے خلاف سمجھتے ہیں اور انہوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ میں دونوں جنسوں کے طواف الگ الگ رکھوں گا۔ انشاء اللہ

نجدی اور یمنی قافلہ بلعموم ۵، ذی الحجہ کو آتا ہے۔ وہ لوگ جوق در جوق طواف کے لئے آتے ہیں، جس سے دوسروں کو حجرِ اسود تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہاں فوجی سپاہی متعین ہو جاتے ہیں جو انتظام ٹھیک رکھتے ہیں۔ نجدیوں کو میں نے اس سے زیادہ مار کھاتے دیکھا جتنی کہ دوسرے حاجیوں پر پڑتی تھی لیکن خصوصیاتِ قومی کا اختلاف اس میں بھی نمایاں تھا۔ ہندی پر جہاں بید پڑی فوراً بھاگا افغانی دو ایک ضرب زیادہ برداشت کرتا تھا مگر ایسی تیز نگاہوں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھتا تھا کہ بس چلتا تو مارنے والے کو پھاڑ کھاتا نجدی دھن کا پکا صرف تقبیل سے غرض رکھتا تھا آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا کہ کس نے مارا اور کس قدر مارا۔ جاوی ایسی حالت میں دور ہی سے استلام پر قناعت کرتا تھا۔

بعض متعصب ہندی جن کے جہاز پر سوار ہونے کی وحشت آمیز کیفیت میں لکھ چکا ہوں، نجدیوں اور یمنیوں کے اس ہجوم کو وحشت قرار دیتے تھے۔ حالانکہ ان کو صرف دو دن طواف اور سعی کے لئے ملتے ہیں اور تعداد میں ہوتے ہیں ۶۰-۷۰ ہزار سے زیادہ، پھر لوٹ نہ پڑیں تو اور کیا کریں۔

ان کی عورتیں اور بچے، جوان اور بوڑھے سب کے سب طواف کی دعاؤں اور جملہ مناسک حج سے

اچھی طرح واقف تھے۔ ان کو کسی معلّم یا مطوّف کی حاجت نہیں ہوتی تھی۔

اندرونِ کعبہ میں لوگوں کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ شیبی صاحب ایک دکاندار کی طرح درِ کعبہ پر بیٹھے ہوئے تھے اور سیڑھی لگادی گئی تھی جس پر سے لوگ چڑھ رہے تھے۔ مجھ پر یہ نظارہ گراں گذرا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے پاؤں میرے قلب کے اوپر پڑ رہے ہیں۔ کاش دنیا میں یہ ایک جگہ تو ایسی مقدس سمجھی جاتی کہ گنہگار انسانوں کی آلودگی سے پاک رکھی جاتی۔ نبیؐ کا ہر فعل سنت نہیں ہوتا بلکہ ان میں سے بعض خصوصیت خاص رکھتے ہیں اور سنّت سے بالاتر ہوتے ہیں۔

مسجدِ حرم میں رات کے وقت کم سے کم ۵۔۶ ہزار آدمی سوتے ہیں۔ مجھے یہ امر بھی اس کے احترام کے منافی معلوم ہوا۔

اگرچہ اہلِ سنت کی مذہبی تفریق کے مظاہر یعنی چاروں مصلے کعبہ کی چاروں سمت میں اپنی شکل میں قائم ہیں۔ محرابِ جماعت صرف ایک ہی ہوتی ہے۔ کسی وقت شافعی امام پڑھاتا ہے کسی وقت حنفی، کبھی حنبلی اور کبھی مالکی جس کے پیچھے بالعموم ہر فرقہ کے لوگ نماز پڑھ لیتے ہیں یہاں تک کہ غیر اہلِ سنت بھی۔ یہ اسلامی اخوت کا منظر بہت دلفریب ہے۔ جس سے توقع پیدا ہوتی ہے کہ شاید مسلمان وحدت اور روا داری کا سبق سیکھیں گے اور فرقہ بندی کو مٹادیں گے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے جو بیٹھے رہتے تھے اور جماعت میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ حنفیہ عصر کی نماز میں کم آتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک دو مثل پر وقت ہوتا ہے اور وہاں ایک مثل پر اوّل وقت پڑھی جاتی ہے۔

ہندی حجاج کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ کراچی اور بمبئی سے جو لوگ گئے تھے ان کا شمار ۲۱ ہزار تھا۔ اس میں ۴ ہزار کابلی اور ترکستانی تھے۔ بقیہ ۱۷ ہزار ہندی۔ ہندی حاجیوں کی تعداد میں یہ کمی غالباً ہندوستان میں قلتِ پیداوار اور قحط کے باعث تھی۔ ورنہ سال گذشتہ اس سے پورے دگنی تعداد میں یہاں سے لوگ گئے تھے۔

ہندوستانی حاجیوں کی سب سے بڑی تعداد ۲۵ ہزار شریف عون الرفیق کے زمانہ میں گئی تھی جبکہ مکہ کے تمام حکام بہت نیک دل مشہور تھے۔ لیکن سال گذشتہ ۳۴ ہزار تھی۔ جس کی بڑی وجہ اس امن وامان کی شہرت تھی جو نجدی حکومت کی بدولت حجاز میں قائم ہوگیا ہے حالانکہ یہی سال تھا جس میں خدام الحرمین نے الولاء حج کے رزولیوشن پاس کئے تھے اور ہند کے طول وعرض میں اس کا پروپیگنڈا کرتے پھرتے تھے۔

جاوی حجاج کی تعداد ۵۰ ہزار تھی اور یہ ہمارے ہندی بھائیوں کی طرح بوڑھے اور سن رسیدہ لوگ نہ تھے بلکہ

بالعموم لڑکے اور نوجوان تھے۔ مرد بھی اور عورتیں بھی۔ مسجد حرام میں رات دن ہزاروں کی تعداد میں موجود رہتے تھے لیکن کبھی ان کو میں نے اس میں بات چیت کرتے نہ دیکھا۔ نماز، تلاوت، دعا اور ذکر میں مشغول رہتے تھے یا کسی اپنے عالم کے حلقہ میں بیٹھے ہوئے مناسک حج سیکھتے تھے۔ بخلاف اس کے ہمارے ہندی حجاج چار بھی جمع ہو جاتے ہیں۔ تو دنیا بھر کی گپیں ہانکتے تھے۔ بدوؤں کی داستان، وہابیوں کی مذمت، خلافت کمیٹی کے جھگڑے جہاز کے واقعات اور کھانے پینے کے حالات وغیرہ۔

مصری بھی زیادہ تعداد میں آئے تھے۔ تقریباً دس ہزار۔ ان کی عورتوں میں پردہ نہیں، نہ جاوئیوں میں ہے۔ مگر دیگر اقوام مسلم خاص کر عرب کی عورتیں پردہ کی سخت پابند تھیں۔

مطاف میں بجلی کی روشنی ہوتی ہے جس کا انجن حمیدیہ کے متصل ہے اور انجینئر میاں اسمٰعیل ذبیح بدایونی ہیں جو نہایت دلچسپ، ادیب اور متواضع شخص ہیں۔ کہتے تھے کہ سلطان نے اب ایک دوسرا بڑا انجن منگوایا ہے جس سے سارے حرم میں برقی روشنی ہو سکے گی۔ آجکل گیس کی روشنی ہوتی ہے جس کے لئے اہل خیر تبرعاً رقمیں جمع کر دیتے ہیں۔

زمزم پر سلطان کی طرف سے سبیل لگی ہوئی ہے اور ہر شخص کو ہر وقت اس کا پانی مل سکتا ہے۔ سبیل کے اخراجات کے لئے حکومت فی حاجی کچھ تھوڑی سی رقم بھی لیتی ہے۔

بعض حجاج کی یہ حرکت بھی عجیب حیرت افزا تھی کہ وہ دامان کعبہ سے لپٹ کر دعائیں کرتے کرتے اندر ہی اندر چاقو یا قینچی سے اس میں سے ایک ٹکڑا تعویذ بنانے کے لئے کاٹ لیتے تھے۔ میں نے ایک دن دیکھا کہ ایک ہندوستانی جو جبہ و دستار سے آراستہ تھے دن کی روشنی میں اس جرم کا ارتکاب کر رہے تھے۔ خواجہ سرا نے دیکھ پایا اور بید مارتے مارتے ان کو دور تک بھگایا۔ مجھے ہنسی بھی آتی تھی اور رونا بھی۔

دسویں شب کو مسجد خالی رہتی ہے کیونکہ لوگ حج کو چلے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے دستور یہ ہے کہ اسی رات کو جدید غلاف کعبہ کو پہنایا جاتا ہے۔ ہم نے حج سے واپس آکر دیکھا تو اس نئے غلاف میں بھی دو تین جگہ دست درازیاں ہوئی تھیں اور ٹکڑے کاٹے گئے تھے۔

مکہ مکرمہ اکثر برائیوں اور فواحش سے پاک ہے۔ باشندے دیندار اور باعفت ہیں۔ وہاں نہ سینما ہے نہ تھیٹر نہ بار روم نہ فونوگراف، نہ جلوس نہ بینڈ، نہ لڑائی نہ جھگڑے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیطان اس خطہ سے باہر ہے۔ اتنا بڑا اجتماع تھا لیکن نہ کوئی ہنگامہ ہوا نہ شور و شش، نہ ڈنڈے چلے نہ لٹھ، جو ایسے اژدہاموں میں ہر جگہ عام ہیں۔

بازار میں جائیے تو صفا سے مروہ تک سعی کرنے والوں کی دعائیں سنائی دیں گی اور حرم میں آئیے تو طواف کرنے والوں کی لبیک۔ نہ راگ ہے نا باجا، نہ رقص ہے نہ سرود، نہ وجد ہے نہ حال، نہ سماع ہے نہ قوال۔ ہمارے مہربان مولانا فاخر صاحب نے غالباً اسی وجہ سے طنزاً کہا کہ وہابیوں کی بدولت یہاں مولود بھی تو نہیں ہو سکتا ورنہ حرم میں دھوم دھام سے محفل میلاد اور نعت خوانی ہوتی۔ میں نے کہا کہ اس سے قدیم تو مرثیہ خوانی کی رسم ہے۔ شیعہ بھی اگر کہنے لگیں کہ ہم اس میں مجلس کریں گے تو آپ کس دلیل سے ان کو روک سکیں گے۔

سلطان کا مسلک یہ ہے کہ ہر شخص خواہ وہ کسی فرقہ کا ہو اپنے خیال کے مطابق حج کر لے اور فرائض بجا لا کر واپس چلا جائے۔ تبلیغ کی اجازت نہیں ہے کیونکہ وہ اس مقدس مقام کو مذاہبِ اسلامی کا دنگل نہیں بنانا چاہتے مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ایک فرقہ کے لوگوں نے سلطان سے اجازت چاہی کہ ہم اپنی کتابیں یہاں بیچیں اور اپنے رسالے تقسیم کریں۔ انہوں نے کہا کہ اپنے عقیدہ کے مطابق حج کر کے چلے جاؤ اور اگر اس قسم کی حرکت کی تو یا در کھو بلا سنگ سار کئے نہیں رہوں گا۔

جس طرح نجدیوں کو دو سو سال سے خصوصیت کے ساتھ قبہ شکنی کی تعلیم دی گئی ہے، اسی طرح ہندوستانیوں کو بھی وہابیوں کو بددین اور لامذہب سمجھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جن کے دلوں میں وہابیوں کی اس قدر عداوت اور دشمنی متمکن تھی کہ وہ مسجدِ حرم میں ان کے لئے بددعائیں کرتے تھے۔ حکومت کو ان میں سے بعض کے حالات معلوم تھے لیکن اس نے مطلقاً گرفت نہیں کی۔ صرف بمبئی کا ایک زبان دراز واعظ جو علی الاعلان وہابیوں کی برائیوں کرتا تھا پکڑا گیا تھا۔ قاضی عبداللہ بن حسن نے اثباتِ جرم کے بعد اس کو پانچ سال قید کی سزا دی مگر میں نے سنا کہ ہمارے بعض ساتھیوں کی سفارش سے سلطان نے معافی عطا کی اور زادِ راہ اور سفر خرچ کے لئے پچاس گنی دے کر رخصت کر دیا۔

ان متعصبین میں سے بہت سے لوگوں کو میں نے دیکھا کہ وہ حکومت یا نجدیوں کے خلاف جو بات سنتے فوراً قلمبند کرتے اور خصوصیت کے ساتھ لکھنؤ کے اخبار ہمدم یا بمبئی کے اخبار خلافت میں بھیجتے۔ ان کو اس سے غرض نہ تھی کہ یہ صحیح ہے یا غلط، افترا ہے یا تہمت ہر تعریض عتاب اور نہتی حمار پر جس سے وہابیوں کی برائی نکلتی ہو تصدیق کی مہر ثبت کر دیتے تھے۔ چنانچہ ہندوستان آنے کے بعد اخبار ہمدم لکھنؤ کا ایک نمبر ۱۵ جولائی کا مجھ کو ملا اس میں کسی شخص عبدالرزاق نامی کا خط جو ۳ جون کو یعنی حج سے واپسی کے تیسرے دن لکھا گیا ہے چھپا ہے۔ جس میں مندرج ہے کہ نجدیوں نے عرفات میں لوگوں کو پتھروں سے مارا چنانچہ ممبرانِ وفد میں سے اسمٰعیل غزنوی اور داؤد

غزنوی اور میرا نام لکھا تھا کہ یہ لوگ زخمی ہوئے۔ یہ ایسا افترا محض ہے جس کو پڑھ کر مجھے ہنسی آئی۔ کیونکہ اس قبیل کا کوئی واقعہ خواب میں بھی نہیں گذرا چہ جائے کہ بیداری میں۔ اور نہ اس قسم کے واقعہ کا امکان تھا کیونکہ اہل نجد عربی شرافت کے وارث ہیں جن کے یہاں مہمان نوازی کا اعلیٰ وصف ہے۔

مولوی اسماعیل غزنوی آج کل غالباً مصر میں ہیں مگر مولوی داؤد غزنوی کے ہاتھ میں ایک اخبار ہے۔ وہ تصدیق کر سکیں گے کہ یہ سارے کا سارا خط کس قدر غلط اور جھوٹ ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ میدانِ عرفات میں پانی کا انتظام اچھا تھا لیکن اس کو نظامِ حیدرآباد کا کارنامہ قرار دیتا ہے۔ پھر لکھتا ہے کہ وہابیوں نے ظلماً منیٰ میں مسجد خیف سے حجاج کو نکالدیا اور یہ نہیں ظاہر کرتا کہ اس مقدس مسجد میں جس کا فرش تمام تر ریت کا ہے۔ ان ڈیرے ڈالنے والوں نے کس قدر غلاظت جا بجا اور رکھی تھی۔ اس کا یہ بھی بیان ہے کہ تمام حجازی حکومت سے بیزار ہیں۔ معلوم نہیں کس حجازی سے اس نے گفتگو کی میرا خیال یہ ہے کہ صرف اپنے معلّم سے کوئی بات سُنی ہو گی جو حکومت کی شدید نگرانی کی وجہ سے اب حجاج کو لُوٹ نہیں سکتے اور شکایت کرتے ہیں۔ ہمدم کے اسی نمبر میں ایک خط اور بھی تھا وہ بھی اسی قسم کا تھا۔

بالعموم لکھنے والے ایسے لوگ تھے کہ تعصب نے ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ جو واقعات ان کی آنکھوں کے سامنے سے گذرے تھے ان کو بھی نہ سمجھتے تھے نہ سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ صرف وہابیوں کے مظالم اور مصائب کی ان کو جستجو تھی اور بس۔

مثل الذباب یراعی موضع العلل

علیگڈھ پارٹی ملے سے بھی ملاقات ہوئی۔ پروفیسر حمید الدین خان کہنے لگے کہ میں تو وہابیوں کا طرفدار تھا۔ مگر مدینہ میں ان کے جو جرائم دیکھے وہ ناقابلِ معافی ہیں۔ انہوں نے قبروں کے گنبد گرا دیئے ہیں جن پر آیات لکھی ہوئی تھیں۔ علاوہ بریں قاضی مدینہ دو گھنٹہ تک مسجد نبویؐ میں بیٹھے رہے اور ان کے پاؤں روضۂ اطہر کی طرف تھے۔

ان دونوں شکایات پر پروفیسر صاحب جملہ وہابیوں سے بیزار ہو گئے تھے۔

مولوی سلیمان اشرف صاحب ہمارے پرانے کرم فرما بھی اس قافلہ میں تھے جو وہابیوں کے قدیمی مخالف ہیں، کہنے لگے کہ دیکھئے آج پانچ تاریخ ہو گئی ہے مگر اب تک اعلان نہیں ہوا کہ حج کس دن ہو گا۔ میں نے کہا کہ دستور یہ ہے کہ حج کمیٹی حج کے دن کا اعلان ۶ ذوالحجہ کو کرتی ہے جبکہ نجدی اور یمنی قافلے آچکتے ہیں کیونکہ ان سے رویتِ ہلال اور تعین تاریخ حج میں شہادت اور مدد ملنے کی توقع رہتی ہے۔ لیکن مولانا اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور

کہنے لگے کہ پچھلے سال عین وقت پر نجدیوں نے محض اس وجہ سے کہ لوگ جمعہ کے حج کو حج اکبر نہ سمجھیں، تاریخ بدل کر حاجیوں کو پریشان کیا تھا۔

میں نے جب اس امر کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ مولانا کا بیان صحیح نہ تھا۔ پچھلے سال بھی حسب معمول ۹ تاریخ کو اعلان ہوا تھا اور کوئی تبدیلی اس میں نہیں کی گئی تھی۔ نجدی تو خود عوام الناس کی طرح جمعہ کے حج کو حجِ اکبر سمجھتے ہیں۔ اور ان کی کتب میں اس کی تصریح ہے۔ مولانا نے مناسکِ حج پر ایک کتاب لکھی تھی جس کی نسبت بار بار فرماتے ہیں کہ میں نے بہت اچھی کتاب لکھی ہے مجھے بھی ایک نسخہ دینا چاہا مگر میں نے اس وجہ سے نہیں لیا کہ جہاز پر اس کو ایک مسافر کے پاس دیکھ چکا تھا۔

یہ کچھ دستور سا ہو گیا ہے کہ اکثر مولوی جب حج کو جاتے ہیں یا اس کا ارادہ کرتے ہیں تو مناسک پر کوئی کتاب یا رسالہ لکھ ڈالتے ہیں جس میں حج کے فرائض کی صرف ظاہری شکلوں سے بحث ہوتی ہے۔ جن کا بڑا حصہ علماء کا رثابت ہوتا ہے۔ ان کتابوں اور رسالوں کی اس قدر کثرت ہو گئی ہے کہ اب کچھ لکھنا لاحاصل ہے اصل ضرورت حج کے حقائق سمجھانے کی ہے۔ جن کے متعلق ایک حرف بھی ان میں نہیں ہوتا۔

ڈپٹی زین الدین صاحب اس مختصر قافلہ کے امیر تھے اور غالباً اسی کتاب کے قوانین و ضوابط کے ماتحت جرمانے اور تاوان لگاتے تھے۔ پروفیسر حمید الدین خاں کہنے لگے کہ مجھ پر چار "دم" (قربانیاں) عائد ہو چکی ہیں۔ ایک بار جامۂ احرام سوتے میں سر پر آگیا تھا۔ دوسری بار کندھے پر پھیلے ہوئے تیسری بار کسی عزیز کا دامن سر پڑ گیا تھا۔ چوتھی بار غالباً کوئی لونگ کھا لی ہے۔

میرے ساتھ بٹوے میں کچھ کے ملے ہوئے پان تھے جو میں ہندوستان سے لے گیا تھا۔ اس کو پیش کیا۔ پروفیسر نے منہ میں ڈالا مگر چونکہ اس میں الائچی تھی اس وجہ سے فوراً تھوک دیا اور منہ صاف کر ڈالا ورنہ قریب تھا کہ فردِ جرم لگ جائے۔

ایک طرف فقہ کی یہ شدت تھی اور دوسری طرف یہ غفلت کہ ہمارے ترک بھائی دین تو کجا اس میں قانون بننے کی بھی صلاحیت نہیں تسلیم کرتے تھے۔

مولوی محمد سلیم صاحب ظہور حسین وارڈ کے پرانے سب سپیکٹر بھی مکہ میں ملے۔ روزانہ شام کو وہ اسی طرح پورے لباس میں حرم شریف میں آتے ہیں جس طرح مغرب کے وقت ظہور وارڈ سے کالج کی مسجد میں آیا کرتے تھے۔

ایک نوجوان ترک ڈاکٹر معہ چند ترکوں کے ہم لوگوں سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں نے یہ کیا کیا کہ اپنے دستورِ اساسی سے فلاں فلاں دفعات جو اسلام کے متعلق تھیں نکال ڈالیں۔ ڈاکٹر نے اس کے جواب میں زور شور سے ترکوں کے اسلامی کارنامے بیان کئے اور کہا کہ کیا ایسی قوم کی نسبت یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اسلام کو چھوڑ بیٹھی۔ میں نے کہا کہ ترک مسلمان سہی مگر جو حکومت یہ کہے کہ میرا دین اسلام نہیں وہ یقیناً کافر ہے۔

اس کے جواب میں ڈاکٹر کے طویل بیان کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ انکار نہیں ہے بلکہ غیر ضروری اعلان کا حذف ہے، دنیا جانتی ہے کہ ترک مسلمان ہیں پھر اس کے لئے دستورِ اساسی میں دفعات رکھنے کے کیا معنی۔

لیکن مولوی ظفر علی خاں صاحب کی اس جواب سے تسلی نہیں ہوئی۔ انہوں نے دو ایک یورپین سلطنتوں کی مثالیں پیش کیں کہ باوجود عیسائی ہونے کے بھی ان کے دستورِ اساسی میں حمایتِ عیسویت کے دفعات موجود ہیں۔

ڈاکٹر کا جواب یہ تھا کہ کیا اسی تقلید پر آپ ہم کو مجبور کرنا چاہتے ہیں؟

مکہ میں متعدد اقوام اور ریاستوں کی طرف سے رباط قائم ہیں۔ مصری رباط جو تکیہ کے نام سے مشہور اور مسجد حرام کے متصل ہے ایک بڑی اور پختہ عمارت ہے وہاں سے ہزاروں فقراء اور مساکین کو روزانہ کھانا تقسیم ہوتا ہے۔ بعض امراء مصر اس میں ٹھہرتے بھی ہیں۔ ان لوگوں نے مجھ کو اور مولوی ظفر علیخاں کو تکیہ دیکھنے کے لئے بلایا تھا۔ چائے اور قہوہ سے تواضع کی اور دیر تک گفتگو کرتے رہے اس میں ایک شفاخانہ بھی ہے جہاں سے اوسطاً روزانہ پچاس بیماروں کا علاج ہوتا ہے۔ دوائیں مفت دی جاتی ہیں۔ عمل جراحی بھی کیا جاتا ہے جس کے مکمل آلات موجود ہیں۔

سب سے بہتر رباط بوہرہ قوم کا ہے جو ملا سیف الدین طاہر کے حسب ہدایت غالباً آٹھ لاکھ روپیہ کے صرفہ سے تیار ہوا ہے۔ یہ عمارت نہ صرف مکہ بلکہ سارے جزیرہ نمائے عرب میں بے مثل بتائی جاتی ہے۔ اس میں پانچ سو حجاج نہایت آرام کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ عمارت بہت بڑی، عالی شان، صاف ستھری ہے۔ اور مکہ میں سلطانی شفاخانہ کے بعد صرف یہی ایک جگہ ہے جس میں ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی ہم نے دیکھا۔ اس کے متصل ایک کنواں بھی کھودا گیا ہے جس کا پانی صاف اور شیریں ہے۔

جماعت اہلحدیث کے ارکان بھی ایک رباط کی فکر میں تھے۔ دیکھیں کب بنتا ہے۔

اہلحدیث وہابی قبضہ کے بعد سے مکہ میں اس طرح داخل ہوتے ہیں جیسے کوئی فاتح اپنے رقبہ مفتوحہ میں۔ اور اس میں شک نہیں کہ سلطان ان کی عزت بھی کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بعضوں کا بیجا ناز ممکن ہے کہ اس

عزت کو بھی کھو دے۔

پہلے دن جب سلطان مؤتمر میں تشریف لائے تھے تو اس جماعت کے ایک مولوی صاحب نے ان کو مخاطب کرکے پوچھا کہ ہمارے "مذہب" کا نام کہیں قرآن میں بھی آیا ہے؟ لوگ اس بے موقع اور بے معنی سوال کو سن کر برہم ہوئے۔ سلطان نے جواب دیا کہ آپ کو یہ سوال کسی عالم سے کرنا چاہئے اس نے کہا کہ آپ بھی تو امام ہیں لیکن ادھر ادھر سے لوگوں نے اشاروں سے روک دیا۔ اور دوسرے دن جب دعوت کے رقعے تقسیم ہوئے تو اس کا نام خارج کرا دیا گیا۔

ایک دوسرے مولوی صاحب جن کو دعوت کا ٹکٹ نہیں ملا تھا سلطان کے محل پر پہنچے اور درخواست کی کہ مجھ کو اپنے مہمانوں میں شامل کر لیجئے ان کے ساتھ ایک مولانا اور تھے انہوں نے کہا کہ میرے لئے اونٹ کا بندوبست کر دیجئے۔ سلطان اپنے ایک ملازم سے یہ کہہ کر کہ یہ حضرات جو کچھ فرماتے ہیں لکھ لو۔ اُٹھ گئے۔

حنبلی مصلے کے پیچھے ایک چوکی واعظوں کے لئے پڑی ہوتی ہے بیشتر علماء اہل حدیث ہی کو میں نے اس پر وعظ کہتے ہوئے دیکھا۔ ایک دن راہ میں ایک مولانا سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ حرم میں بھی آپ کا کوئی وعظ ہوا یا نہیں؟ فرمانے لگے کہ جی ہاں۔ فلاں شخص نے اپنی تقریر میں خلافت کے کارکنوں پر بہت سے دے کی تھی۔ میں نے اسی وقت اٹھ کر مجمع کے سامنے جوابات دیئے۔ پرسوں میری آخری تقریر حرم میں ہونے والی ہے۔

ابھی ہم اس جواب کی لذت ہی لے رہے تھے کہ ایک دوسرے مولانا مل گئے۔ ان سے بھی یہی سوال کیا۔ بولے کہ ظفر علی خان صاحب نے اپنی تقریر میں رفع یدین اور آمین بالجہر کی مخالفت کی تھی۔ میں نے اپنے وعظ میں نہایت قوی دلائل سے ان کا ثبوت دیا۔ اچھا اثر پڑا مجمع بھی خوب تھا۔

میں نے کہا مولوی صاحب نے تو صرف ان فروعی امور پر لڑنے جھگڑنے کی مخالفت کی تھی۔ لیکن مولانا کو تو تقریر کے لئے ایک متنازع فیہ موضوع کی ضرورت تھی اور بس۔

رہا مجمع سو اس کی کیفیت یہ تھی کہ واعظ مغرب کے بعد کھڑا ہوتا دو چار ہندی اس کے گرد بیٹھ جاتے اور بقیہ نمازی جن سے اس وقت مسجد کا صحن بھرا رہتا تھا تماشا دیکھتے ہوئے نکلے چلے جاتے۔

اس فرقہ کو سلطان کی مدح میں اسی قدر غلو ہے جس قدر کہ متعصبین کو ان کی ہجو میں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ سلطان جب مدینہ میں تھے تو وہاں بارش ہوئی پھر جدہ میں آئے تو وہاں بھی اور جب مکہ میں پہنچے تو یہاں بھی پانی پڑا اور عرفات میں گئے تو وہاں بھی۔ اہل حدیث میں سے ایک صاحب کہنے لگے کہ ان کی مقبولیت میں کیا شک ہے دیکھئے

نہیں کہ جہاں جاتے ہیں آسمانی رحمت ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ ایک دوسرے صاحب فرمانے لگے کہ سلطان ولی ہیں۔ جس نے ان کی مخالفت کی وہ اپنے رتبہ سے گر گیا چنانچہ فلاں فلاں اور فلاں ایک اور صاحب نے جو جدید تعلیم یافتہ تھے کہا کہ کاؤنٹ ٹالسٹائی نے جو پیشین گوئی کی ہے کہ دنیا کی نجات ایک بیابانی مصلح کے ہاتھوں ہوگی وہ یہی ہیں۔

افسوسناک امر یہ ہے کہ مکہ میں تعلیم نہیں ہے۔ چند مدرسے ہیں جن میں موسم حج کی وجہ سے تعطیل تھی میں ان کو دیکھ نہ سکا۔ مدرسہ صولتیہ بھی بند تھا۔ مگر اس کے مہتمم صاحب نے اس کی تینوں عمارتیں دکھلائیں۔ جدید مکان نہایت عالیشان اور چہار منزلہ ہے۔ اس کی وہ اوپر کی چھت بھی دکھائی جہاں مولانا محمد علی اور شوکت علی صاحبان جب حج کو گئے تھے تو جا کر سو جایا کرتے تھے۔ واقعی نہایت وسیع صاف ستھری اور ہوادار ہے۔

مدرسہ فخریہ کے جلسہ میں بھی شریک ہوا۔ اس میں تجوید اور نوشت وخواند کی معمولی تعلیم ہوتی ہے۔

مدرسہ الفلاح اور معہد سعودی کا نصاب ونظام مجھے بالکل نہ معلوم ہو سکا۔

اہلِ مکہ اسی پر قانع ہیں اور اپنی حالت کے لحاظ سے اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ چنانچہ مسجد حرم میں شیبی صاحب کے بھتیجے سے جو عملاً کعبہ کے کلید بردار ہیں اس موضوع پر گفتگو ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ معہد سعودی جو قائم ہوا ہے اس میں حدیث وفقہ وتفسیر کے اچھے اچھے مدرس سلطان نے بلائے ہیں۔ اب انشاء اللہ مکہ میں بھی علماء پیدا ہونے لگیں گے۔ ان کی تقریر سے واضح ہوتا تھا کہ تعلیم کا مفہوم ان کے ذہن میں سوائے چند دینی کتب کے اور کچھ نہیں ہے۔ کاش اس مرکزِ دین میں دین ہی کے علماء پیدا ہوں۔ لیکن ممتاز اور وسیع لیاقت کے ہوں۔

سلطان کو بھی اس کا بے حد افسوس ہے۔ انہوں نے ایک بار کہا کہ لوگ روتے ہیں کہ مسلمانوں کا فلاں ملک نکل گیا اور فلاں صوبہ جاتا رہا اور میں روتا ہوں کہ اسلام ہی ہاتھوں سے جا رہا ہے۔ کیونکہ جب علماء نہ ہوں گے تو دین کیسے باقی رہے گا۔ میرے دیکھتے دیکھتے ریاض میں جہاں ستر نامی علماء تھے اب پانچ لڑکے رہ گئے ہیں مگر باوجود اس احساس کے تعجب یہ ہے کہ وہ اپنے شہزادوں کی تعلیم کی طرف بھی جو رات دن موٹریں دوڑاتے پھرتے اور اسی مشغلہ میں اپنا سارا وقت برباد کرتے ہیں کوئی خاص توجہ نہیں کرتے۔

کتب خانے متعدد ہیں لیکن اس مرکزِ اسلام کی شان کے مطابق ایک بھی نہیں۔ سب سے بڑا کتب خانہ جو ہے اس میں کم وبیش چھ ہزار کتابیں ہیں۔ گو بعض قلمی نوادر ہیں لیکن بہت سی ضروری علمی مطبوعہ کتابیں ندارد ہیں۔

حضارمہ میں سے علامہ احمد سورکتی ہم سے ملنے کے لئے آئے ۔ یہ جاوا کی جمعیت الارشاد کے صدر اور صاحب علم و فضل ہیں۔ اس جمعیۃ کے ایک دوسرے سرگرم کارکن علی بن عبداللہ باوضیس ہیں۔ ایک دن انھوں نے مجھ کو محلہ قشاشیہ میں چائے پر بلایا تھا وہیں ایک شخص سے پہلی بار معلوم ہوا کہ عبداللہ عسیری مولانا شوکت علی اور چند دیگر اشخاص کے خطوط امام یمن کے نام رکھتا ہے ۔

یہ عبداللہ پانچ چھ مہینے جامعہ ملیہ رہا تھا اور مکہ میں پہنچنے کے بعد خود بخود آکر ہمارا میر مبلغ بن گیا تھا مجھے اس کی پوری حالت معلوم تھی اور میں جانتا تھا کہ یہ کس قماش کا آدمی ہے ۔ میں نے اس خبر کی اصلیت سے اسی وقت انکار کیا۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ اگر اس قسم کے خطوط ہوں گے تو یقیناً جعلی ہوں گے ۔

میں ۱۴ر جون کو مکہ سے واپس چلا آیا تھا۔ بمبئی میں پہنچ کر ۲۳ جون کو اخبار خلافت میں پڑھا کہ عبداللہ گرفتار ہو گیا اور اس کے پاس سے خطوط بھی برآمد ہوئے ۔ مولانا شوکت علی صاحب کی تردید بھی اسی نمبر میں تھی کہ یہ خط ان کا نہیں ہے ۔ وہ اگر تردید بھی نہ کرتے تو بھی مجھے یقین تھا کہ وہ خط ان کا نہیں ہو سکتا۔ حسن عطاس یعنی آج بھی میرے پاس پڑھتا ہے ۔ وہ حلفیہ بیان کرتا ہے کہ اس نے کوئی خط نہیں لکھا ۔ اور میں اس کو عبداللہ سے زیادہ سچا سمجھتا ہوں ۔ عبداللہ جاہل اور جسور آدمی ہے ۔ وہ اپنے جہل میں آپ گرفتار ہوا ہے ۔

اخبار خلافت کے اسی نمبر کے اڈیٹوریل میں "شہید حرم" کا عنوان نظر آیا جس کے نیچے مصری پاگل کا قصہ بیان کیا گیا تھا جس نے مسجد حرم میں منبر پر چڑھ کر جمعہ کے دن کئی آدمیوں کو زخمی کیا تھا، آخر میں اس کے پاؤں میں بندوق سے چھرے مار کر اس کو اتارا گیا تھا مجھے اس اڈیٹوریل نگار کی ذہنیت پر ماتم کرنا پڑا کیونکہ وہ شخص آج بھی مکہ کی گلیوں میں مارا مارا پھرتا ہے جس کو یہ شہید حرم بنا کر وہابی حکومت کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے ۔

مکہ میں کل ایک ہی اخبار ہے جس کا نام ہے ام القریٰ ۔ وہ بھی ہفتہ وار ۔ میں اور مولوی ظفر علی خاں دونوں وہاں گئے ۔ اس کا دفتر حمیدیہ کے متصل ایک بڑے مکان میں ہے جس میں پریس بھی ہے ۔ اس کی اشاعت ۲۲۰۰ ہے ۔

یہ اخبار ابھی عہد طفولیت میں ہے اور سوائے سلطان نجدی اور ان کے شاہزادوں کی آمد و رفت کے حالات حلقات ملوکیہ اور بلدیہ مکہ کے اخبار کے اور باتیں کم لکھتا ہے ۔

جب حج کا دن قریب آتا ہے تو مکہ کے بعض باشندے حج بدل تلاش کرتے ہیں ۔ اکثر ہندیوں کو میں نے دیکھا کہ انھوں نے اپنے اپنے اعزہ و اقارب کی طرف سے ایک ایک گنی پر حج کرا لیا ۔

دہلی کے ایک صاحب بھی ملے جو کسی کی طرف سے حج کرنے گئے تھے۔ وہ دو دو روپیہ پر عمرے خرید رہے تھے۔ میں اس بوالعجبی پر حیران تھا کہ حج بیچیں اور عمرے خریدیں۔

میں نے دیکھا کہ حج بدل کے متعلق جملہ فرق کے علماء کا ایک ہی مسلک تھا یعنی سب کے سب اس کے جواز[1] پر متفق تھے بلکہ بہت سے حج بدل ہی میں گئے تھے۔ کاش اسی طرح دیگر مسائل میں بھی یہ لوگ اتفاق کر لیتے لیکن مشکل یہ ہے کہ ان میں یہ نفع نہیں۔ ایک مولانا صاحب جو ساتویں بار حج بدل میں گئے تھے مجھ سے فرماتے تھے کہ یہ اچھی تجارت ہے نعمت تو کہیں گئے نہیں۔

مکہ میں تمباکو نوشی بالعموم ممنوع ہے لیکن گھروں میں کوئی روک نہیں۔ شارع عام پر احتیاط کی ضرورت ہے۔ کیونکہ نجدی اس سے نفرت رکھتے ہیں اور جب کسی کو پیتے دیکھتے ہیں تو بید سے سزا دیتے ہیں۔ مگر موسم حج میں کسی قدر رعایت برتی جاتی ہے۔ دکانوں پر سگریٹ اور سگار کے بکس بھی ملتے ہیں۔

ہمارے ساتھ حقہ تھا اور تمام جماعت میں سے صرف میں اور مولوی صاحب ظفر علی خاں پیتے تھے۔ آدمی کو ہدایت تھی کہ جب لال مندیل والا کوئی عرب ملنے کے لئے آئے جو نجدیوں کی خصوصیت ہے تو اس کو اٹھا کر الگ رکھ دے۔

خود ہمارے ساتھیوں میں سے مولوی داؤد صاحب غزنوی امرتسری بھی نجدیوں سے اس معاملہ میں کچھ کم نہ تھے۔ میں ان سے کہا کرتا تھا کہ شاید آپ کا گھر "عبدالوہاب صاحب" سے قریب واقع ہے۔

ایک دن صبح کو کوئی ملازم نہ تھا۔ مولوی ظفر علی خان کو سخت طلب تھی۔ اٹھے اور خود چلم بھر کر لائے میں بھی چونکہ ان کا شریکِ عمل تھا اٹھ کر حقہ تازہ کرنے لگا اور اس وقت یہ شعر کہے۔

بھرتے ہیں چلم ظفر علی خان　　اسلم کرتے ہیں حقہ تازہ
مکہ میں جب آ گئی یہ نوبت　　حقہ کا نکالدو جنازہ

لیکن جنازہ تو نہیں نکالا گیا۔ ہاں یہ ہوا کہ ہمارا حقہ حج میں ساتھ نہیں گیا۔

مکہ کی تاریخی یادگاروں کے متعلق کتاب مرآۃ الحرم نامی جو وہاں عام طور پر شائع ہے۔ نہایت مکمل اور

---

[1] میرے نزدیک قرآنِ کریم کے اس عام اصول "لیس للانسان الا ما سعیٰ" کے مطابق ہر انسان کو صرف اس کے ہی عمل کی جزا و سزا ملے گی ایک دو روایتیں جو حج بدل کے متعلق آئی ہیں ان کا محل مخصوص ہے وہ عام نہیں کی جا سکتیں۔

مفصل ہے۔ لیکن اس کی روایات نیز وہاں کے معلّمین کے بیانات کچھ زیادہ قابلِ وثوق نہیں معلوم ہوئے۔

اکثر مزارات پر پہرے قائم ہیں تاکہ زائرین سجدہ اور شرک نہ کرنے پائیں بعض جگہ مثلاً غارِ حرا یا جبلِ ثور پر بلا سلطانی اجازت کے جانے نہیں دیتے۔

مسجد بلال جبل ابوقبیس پر ہے۔ مجھ سے بعض ہندیوں نے کہا کہ وہابیوں کا ظلم دیکھئے کہ اس کو مقفل کرادیا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ حرم شریف کے صحن میں سے نظر آتی ہے۔ اس لیئے ظاہر ہے کہ مسجد حرم کی نماز کو جس میں دوسری مساجد سے ایک لاکھ گنا زیادہ ثواب ملتا ہے کوئی چھوڑ کر اس میں نماز پڑھنے کیوں جائے گا۔ علاوہ بریں حرم میں دس بار آنے جانے سے اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک بار بھی چڑھنا اتنا زیادہ مشکل ہے۔ پھر ایسی صورت میں اس کا مقفل رکھنا ہی قرین مصلحت ہے۔

مولانا فاخر صاحب کو شکایت تھی کہ وہابیوں نے حضرت خدیجہؓ کا مزار تو توڑ ہی ڈالا تھا اب اس پر اونٹ بٹھا لیتے ہیں۔ مجھے اعتبار نہ آیا چنانچہ جب میں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کے گرد دیوار کھینچی ہوئی ہے اور وہاں تک اونٹ تو کیا بلی کا بھی گزر نہیں۔ احاطہ کے باہر میدان میں بے شک اونٹ بیٹھتے ہیں۔

سنت کے مطابق ۸ ذی الحجہ کو مکہ سے حج کے لئے روانگی ہونی چاہیئے۔ لیکن لوگ ۴۔۵ ذی الحجہ سے جانے شروع ہو جاتے ہیں۔ بالخصوص اہل جاوا۔ کیونکہ ان کے ذمہ وطن میں بھی جس قدر دعوتیں لازم ہوتی ہیں ان کو وہ میدانِ عرفات ہی میں پہنچکر کھلاتے ہیں۔

امسال منیٰ میں پانی کا انتظام کافی تھا اور عرفات میں بھی۔ میں نے دیکھا کہ توانا لوگ نہرِ زبیدہ سے خود پانی نکال کر لاتے تھے اور جابجا سبیلیں بھی لگی ہوئی تھیں جہاں سے مفت پانی ملتا تھا۔ مصری سبیل، حیدرآباد کا سبیل دہلی والوں کی سبیل، بمبئی والوں کی سبیل اور خود سلطانی سبیل۔

مول بیچنے والے بھی ہر جگہ گھومتے تھے اور ۶۔۷۔۸ کنستر تک پانی مل جاتا تھا۔

راستہ میں نیز منیٰ اور عرفات میں جابجا چائے، پانی، شربت اور برف کی دکانیں تھیں۔ سلطان کی تمام تر کوشش یہی تھی کہ حجاج کو پانی کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ عرفات میں ایک کنویں کی کھدائی میں وہ پانچ ہزار گنی خرچ کر چکے ہیں ایک انجن بھی منگوایا ہے۔ مگر ابھی تک پانی نہیں نکلا۔ سننے میں آیا ہے کہ جبل شہداء میں جو مکہ سے دو تین میل کے فاصلہ پر ہے ایک سوتا دریافت ہوا ہے جس کا قطر نہرِ زبیدہ سے بھی زیادہ ہے اور پانی بھی اچھا ہے۔ احمد زہیر جو ایک عراقی رئیس اور سلطان کے خاص دوست ہیں بیان کرتے تھے کہ سلطان

بہت خوش ہیں اور کہتے ہیں کہ انشاءاللہ اس سوتے میں مکہ سیراب کرلوں گا۔

حجاج کے لئے منا سے عرفات تک ہسپتال کے متعدد کیمپ تھے۔ اور پانچ ڈاکٹر، عبدالہادی، امین بیگ اور بشیر جو شامی ہیں اور عبدالحمید اور محمود جو لاہوری ہیں ہر وقت گشت اور علاج میں مصروف رہتے تھے۔ دوداریاں اسی غرض کے لئے مامور تھیں کہ مریضوں کو کیمپ میں پہنچاتی رہیں۔

امسال اللہ کے فضل سے بہت امن رہا اور ۸، ذی الحجہ سے ۱۲ تک یعنی پانچ دن میں اموات کی کل تعداد ۵۴۳ تھی جن میں ۷۵ فیصدی لو کی وجہ سے واقع ہوئیں۔ تقریباً تین لاکھ آدمیوں میں یہ تعداد ۔ اموات کا اوسط بالکل معمولی ہے مصیبت یہ ہے بعض حجاج اپنے بخل یا ناداری کی وجہ سے مطوف کی فیس خیمہ کے لئے ادا نہیں کرتے جس کی وجہ سے ان کو سایہ نصیب نہیں ہوتا اور بعض اوقات لو لگ جاتی ہے جس سے جانبری مشکل ہو جاتی ہے۔

ہندوستانی حاجیوں میں سے اہل بنگالہ بالخصوص باوجود روپیہ رکھنے کے بھی بخل سے کام لیتے ہیں اور ان میں سے بہت سے سوال کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ واپسی میں میں نے دیکھا کہ جدہ اور نیز جہاز میں بعض بنگالی، لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے تھے۔ ان کی وجہ سے تمام ہندوستانی عربوں کی نگاہ میں ذلیل ہیں۔

جہاز میں تو محض لالچ کی وجہ سے یہ مسکین بن جاتے ہیں، ہوٹل سے دال بھات کھاکے آرہے ہیں لیکن کسی کو گوشت یا پلاؤ کھاتے دیکھا فوراً پیالہ سامنے کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس بدپرہیزی سے بیماری میں مبتلا ہوتے تھے اور مرتے تھے اور اکثر تو ہیضہ مکہ سے ساتھ لاتے تھے۔ جہاز میں ۱۴ موتیں ہوئیں، جن میں سے ۱۲ بنگالی تھے۔

میں علماء بنگالہ سے خصوصیت کے ساتھ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کو اچھی طرح سمجھادیں کہ سوال ذلت ہے، سوال حرام ہے اور سواد الوجہ فی الدارین ہے۔

منیٰ میں قربانی کے بعد سلطان کو عید کی مبارکباد دینے کے لئے لوگ گئے۔ ہر شخص جو جاتا تھا سلطان کھڑے ہو کر برادرانہ اس سے مصافحہ کرتے تھے۔ ٹیونس کے ایک بزرگ مصافحہ کے وقت جھک گئے۔ سلطان نے ہاتھ کھینچ لیا اور کہا کہ یہ اسلامی طریقہ نہیں ہے کہ کسی کے آگے آدمی سر جھکائے۔ لوگوں کو جاہ و تمکنت پسند امراء نے یہ عادت سکھا رکھی ہے۔ میں مسلمانوں کے لئے اس کو نہایت نازیبا سمجھتا ہوں۔

عربوں میں یہ دستور بھی میں نے دیکھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مصافحہ کرتے وقت رخسار یا پیشانی

پڑھتے ہیں اور یہ رسم اس قدر عام ہے کہ اختیار تمیزی کی اس میں بہت کم گنجائش ہے۔

ابراہیم الفضل اسی دوران میں انتقال کر گئے تھے۔ ان کے اعزا منیٰ میں تھے۔ دوسرے دن ہم ان کی ماتم پرسی کو گئے۔ اس کے بعد رمی جمرات کیا۔ بعض جہال کی حالت دیکھ کر مجھے ہنسی آئی۔ ایک ہندوستانی عقبہ اولیٰ پر رمی کر رہا تھا۔ بجائے چھوٹی چھوٹی کنکریوں کے اس نے پتھر کے ٹکڑے لے رکھے تھے۔ زور زور سے مارتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ "لے اور لے" غالباً وہ ان نشانات کو اپنے خیال میں مجسم شیطان سمجھے ہوئے تھا۔

ایک بڑے ڈیل ڈول والے الہ آباد کے واعظ بھی تھے کہنے لگے کہ میں نے بھی آج تاک تاک کے شیطان کے منہ ہی منہ میں پتھر مارے۔ میں نے کہا تو پھر اس کے دانت بھی جھڑ گئے ہوں گے اور آنکھیں بھی پھوٹ گئی ہوں گی۔

قربانیاں لاکھوں کی تعداد میں ہوتی ہیں۔ بعض لوگ ان کا گوشت کھانے کے لئے لاتے ہیں آس پاس کے بدو بھی بقدر ضرورت اٹھالیجاتے ہیں۔ بعضوں کو میں نے دیکھا کہ وہ کھالیں بھی کھینچ رہے ہیں مگر کہاں تک۔ زیادہ حصہ بیکار جاتا ہے۔ حافظ حلیم صاحب کانپوری سے اس کے متعلق گفتگو ہوئی کہ آپ ان کھالوں کے نکالنے کا بندوبست کر سکیں تو یہ ایک بڑی خدمت ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے ہر طرح پر اندازہ لگالیا ہے تاجرانہ حیثیت سے اس میں جس قدر خرچ پڑے گا اتنا نفع نہ ہوگا۔ یہاں کارخانہ دباغت بھی قائم کرنا مشکل ہے کیونکہ پانی نہیں ہے۔

بالعموم دنبے اور بکریاں لوگوں نے ذبح کیں۔ خال خال لوگ تھے جنہوں نے اونٹ خریدے تھے آٹھ دس روپے میں اچھے دنبے اور پانچ چھ روپے میں اچھی بکری مل جاتی تھی۔ اونٹ تین چار گنی میں۔

امسال اونٹوں کے کرایہ میں حکومت نے بہ نسبت سالہائے سابق کے ۲۵ فیصدی اضافہ کر دیا تھا۔ حجاج اس سے ناراض تھے۔ لیکن اصلیت یہ ہے کہ حکومت حجاج کے لئے آسائش اور امن وامان قائم رکھنے میں بہت خرچ کرتی ہے۔ قبائل کے شیوخ کو جن کی ضمانتوں میں ان کے علاقے ہوتے ہیں رقم دینی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ صحت عامہ پر بھی معمول سے زیادہ صرفہ بڑھ گیا ہے اور حجاز کی آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہیں بجز حجاج کے اس لئے ناگزیر تھا کہ اونٹوں اور موٹروں کے کرایہ میں اضافہ کر کے اخراجات کے لئے رقم نکالی جائے۔

میں نے دیکھا کہ نجدیوں اور نجدی حکومت کے زیادہ تر شاکی ہندی ہی تھے اور ان کی اکثر شکایتیں

نہایت خفیف بے بنیاد یا بر بنا ر تعصب تھیں ۔ ورنہ ہم غیر عرب حجاج کے لئے صرف دو چیزیں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ ہمارا جان و مال محفوظ رہے ۔ دوسرے یہ کہ اس بے آب و گیاہ خطہ میں آرام و آسائش خاصکر پانی کا بندوبست کیا جائے ۔ ان دونوں امور میں وہابی حکومت مطلق قاصر نہیں ہے ۔ اتنا بڑا اجتماع تھا لیکن ایک شخص کی نسبت بھی یہ سننے میں نہ آیا کہ وہ لوٹا یا مارا گیا ہو۔ اور نہ یہ کہ کوئی پانی کی قلت سے ضائع ہوا ہو۔ حالانکہ یہ باتیں وہابی حکومت سے پہلے بالکل عام تھیں ۔

سال گذشتہ اس قسم کا صرف ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ میں نے سنا کہ ان حجاج میں سے جو مکہ سے جدہ کو واپس ہوئے کو شماں کے مقابلہ سے معلوم ہوا کہ ایک آدمی نہیں پہنچا۔ ابن سعود کی پوری قوت اس کی تلاش میں مصروف ہو گئی ۔ چنانچہ وہ ہندی راستہ میں ایک ٹیلہ کے نیچے زخمی ملا ۔ سلطان نے اس علاقہ کے شیخ کو طلب کیا اور کہا کہ مجرم کو مع حاجی کے سامان کے حاضر کردو ۔ دوسرے دن بدو مع مال مسلوبہ کے جو اس کے سر پر تھا پہنچا یا گیا سلطان بہت برہم ہوئے اور کہا کہ لوگ اپنے اہل و عیال اور خانماں کو چھوڑ کر مال صرف کر کے اور سفر کی زحمتیں اٹھا کر بیت اللہ کی زیارت کے لئے آتے ہیں اور یہ بے ایمان ان کو لوٹتے ہیں ۔ میں ایسی سخت سزا دوں گا جو دوسروں کے لئے عبرت ہو۔ قاضی نے اس کو ڈاکو قرار دے کر ایک ہاتھ اور پاؤں برخلاف کاٹ لینے کا حکم دیا۔ سلطان نے اعلان کرایا اور مجمع عام میں حمیدیہ کے سامنے ڈاکٹر کو بلوا کر ایک ہاتھ اور پاؤں کٹوا دیا

امن کا مظہر وہاں اس قدر نمایاں ہے کہ بنگالی حاجی پہلے جو خوف کی وجہ سے شغدف سے نیچے نہیں اترتے تھے اب جدہ سے مکہ اور مکہ سے جدہ پیدل آتے جاتے ہیں ۔ میں واپسی میں عشا کے بعد مکہ سے موٹر پر چلا تھا ۔ راستہ میں دیکھا کہ عورتیں اور لڑکیاں تک پیدل چلی آرہی ہیں اور وہی بنگالی جو شغدفوں سے نہیں اترتے تھے ، میدانوں ، پہاڑوں کے دامنوں اور ہموار ٹیلوں پر جا بجا دو دو اور چار چار آرام سے سوئے ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ ہمیانیاں ان کی کمروں سے بندھی ہوئی ہوں گی ۔ اور کہیں نہ پولیس ہے نہ چوکیدار وہی بدو جو لوٹتے تھے اب محافظ ہیں ۔

راستہ میں کہیں کہیں میں نے دیکھا کہ اونٹوں پر سے مسافروں کے پنکھے اور برتن وغیرہ گرے پڑے ہیں ۔ موٹر والے سے کہا کہ ان کو اٹھا لے جدہ میں چل کر ہم پولیس کے حوالہ کر دیں گے ۔ اس نے کہا کہ ہم نہیں اٹھا سکتے اور آپ اطمینان رکھیں یہ سب کا سب صبح تک جدہ تک پہنچ جائے گا اور ان کے مالکوں کے حوالہ کر دیا جائیگا ۔

جدہ کے معلموں کے وکیلوں کے دروازوں پر پچاسوں حاجیوں کے سامان آئے ہوئے پڑے تھے جس میں صندوق بھی تھے۔ ہینڈبیگ بھی اور بستر بھی، وکیل ان حجاج سے کہتا تھا کہ جہاں ٹھہرے ہو وہاں اپنے اپنے سامان لے جاؤ۔ لیکن بہت کم لوگ لے گئے۔ کیونکہ ان کو یقین تھا کہ یہ جس قدر ہمارے گھروں میں محفوظ ہیں۔ اسی قدر اس سڑک پر۔ چنانچہ ایک ہفتہ میں رہا اور ان کے سارے سامان وہیں پڑے دیکھتا رہا۔

ڈاکہ اور رہزنی اب بالکل مفقود ہے بلکہ تقریباً ناممکن۔ ہاں چوریاں ہوتی ہیں وہ بھی بہت کم۔ اور بیشتر خود حجاج ایک دوسرے کا مال چرلتے تھے چنانچہ جہاز میں بھی اس قسم کے وقوعے ہوتے رہے۔

حج سے فارغ ہونے کے بعد واپس آنے والے حجاج عجلت کے ساتھ جدہ پہنچتے ہیں کیونکہ واپسی کے ٹکٹ آمد ہی کی ترتیب پر ملتے ہیں۔ جہاز بھر جانے پر بقیہ مسافروں کو وہیں رہنا پڑتا ہے۔ ممکن ہے کہ دوسرے جہاز کے انتظار میں کئی ہفتے لگ جائیں۔ اور امسال جہاز کی کمپنیوں کے باہمی تنازعے سے ایک کمپنی کا مسافر دوسری کمپنی کے جہاز سے نہیں آسکتا تھا۔ اس لئے بہت سے آدمی وہاں پڑے رہ گئے اگر مکہ ہی میں جہازوں کی روانگی کی تاریخ معلوم ہوتی رہے جو کچھ مشکل نہیں ہے کیونکہ ٹیلیفون لگا ہوا ہے تو حاجیوں کو حرم چھوڑ کر جدہ میں انتظار کے دن نہ کاٹنے پڑیں۔ جاوی حجاج کے لئے انتظام اچھا تھا ان کے تمام جہازوں کی روانگی کی تاریخ اخبار اُم القریٰ میں پہلے ہی سے شائع ہو چکی تھی۔ ہندوستان کے حجاج کا انتظام بہت اصلاح طلب ہے۔ خان بہادر ڈپٹی عبدالرب خاں صاحب نے ان کی پریشانیاں دیکھ کر برٹش قونصل سے مفصل گفتگو کی تھی۔ مجھ سے فرماتے تھے کہ میں نے اس کے متعلق تجاویز سوچی ہیں۔ ہندوستان میں پہنچکر ان کو اسمبلی میں پیش کراؤں گا تاکہ قانونی شکل میں آجائیں۔

جدہ چھوٹا شہر ہے۔ سڑکیں معمولی ہیں۔ وہ حصہ کسی قدر صاف اور شاندار ہے جدھر قونصل خانے ہیں۔ بازار میں ضرورت کی جملہ اشیاء موجود ہیں۔ پانی البتہ یہاں ہر جگہ سے زیادہ گراں ہے۔ کیونکہ سمندر کے کھارے پانی سے تیار کیا جاتا ہے اور قیمتاً ملتا ہے۔ قہوہ خانے اور ہر قسم کے کھانے کی دکانیں بہت ہیں۔

وہاں ہمارے مذاق کے علمی آدمی صرف شیخ نصیف ہیں۔ جاتے وقت سلطان ابن سعود اُن کے مکان پر ٹھیرے ہوئے تھے اس وجہ سے ان سے ہم نہ مل سکے۔ واپسی میں چونکہ میں اکیلا تھا اس لئے انھیں کے یہاں پہنچ جاتا تھا۔ ان کے پاس کتابوں کا ذخیرہ بہت اچھا اور بڑا ہے۔ عربی کی جملہ علمی کتابیں موجود ہیں۔ ابن جوزی کی تلقیح جو گذشتہ سال دہلی سے شائع ہوئی تھی ان کے پاس تھی۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری کی

شرح ترمذی کی بابت بھی جو دہلی میں چھپ رہی ہے دیر تک مجھ سے پوچھتے رہے۔ امین ریحانی کی تاریخ النجد الحدیث جو اُسی مہینہ میں شائع ہوئی تھی میں نے ان کے یہاں دیکھی۔

مولوی عبدالرحمٰن صاحب مرآۃ الشعر والے جو دہلی یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کے ہیڈ ہیں حج سے واپسی کے بعد جدہ میں ولایت کے سفر کے لیئے جہاں اورینٹل کانفرنس میں وہ ایک مضمون پڑھنے والے ہیں، مصری جہاز المنصورہ کے انتظار میں تھے۔ وہ بھی میرے ساتھ شیخ نصیف کے یہاں جاتے تھے۔ شیخ کی دعوت بھی مجھ کو کبھی نہ بھولے گی۔ جو سلطانی دعوت سے کم نہ تھی۔ اور تعجب یہ ہے کہ یہ میز اور کرسی پر تھی اور چھری اور کانٹے کے ساتھ۔

ایک دن سلسلۂ گفتگو میں میں نے پوچھا کہ آخر یہ حنبلیت کس بنیاد پر ہے اور سلفیت کس اصول پر؟ کہنے لگے کہ علماء نجد میں سے سب تو نہیں مگر اہلِ نظر اس تفریق کو ناپسند کرنے لگے ہیں اور صرف مسلمان بننا کافی سمجھتے ہیں۔

عرب جن کی تاریخ بچپن سے پڑھتے چلے آتے ہیں اس مختصر سے سفر حج میں آج بھی ہم کو انہیں صفات میں نظر آئے۔ ان میں دین ہے اور شجاعت۔ مہمان نوازی ہے اور کرم۔ خوش خلقی اور زندہ دلی ان کی ایک ایک ادا سے ٹپکتی ہے۔

اسی کے ساتھ وہ قومی عیوب بھی ہیں جنہوں نے ان کو کھویا ہے۔ یعنی قبائلی عصبیت اور فخر بالانساب۔ ان کے ساتھ سب سے دلچسپ گفتگو وہ ہوتی تھی جن میں قبائل کے انساب اور ان کے مفاخر کا تذکرہ ہوتا تھا۔ آج کل ربیعہ کی گردنیں بلند ہیں کیونکہ حکومت اور سیادت بنی تغلب کے ہاتھ میں ہیں مگر مضر میں سے قریش کی بزرگی اب بھی مسلم ہے۔

یہ امر نہایت رنجدہ ہے کہ غلامی جس کا رواج دنیا سے بالعموم اُٹھ گیا ہے۔ اب تک عرب میں پائی جاتی ہے اور مکہ جیسے محترم اور مقدس شہر میں جو اسلام کا مرکز ہے بردہ فروشی کی دوکان موجود ہے۔ سلطان کو اس کا علم ہے لیکن پھر بھی وہ اسکے انسداد کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب اس کے کچھ ایسے خوگر ہو گئے ہیں کہ اس کو اتنا بُرا نہیں سمجھتے جس قدر کہ وہ ہماری نگاہ میں ہے۔

حقیقتِ حج

دین اسلام کا ہر ہر رکن ایک ایک خاص غرض کے لئے ہے۔ ان میں ملت کی اجتماعی اصلاح حج سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ رکن اگر صحیح طور پر ادا ہونے لگے تو بلا کسی کوشش اور بغیر کسی چندہ کے اس انتشار و تشتت کو جس نے ملت کو پارہ پارہ اور اُمت کو پُرزے پُرزے کر رکھا ہے دُور کر کے اجتماعی زندگی پیدا کر سکتا ہے۔

اسس ضمن میں مَیں نے کوشش کی ہے کہ حج کی حقیقت اور اسس کی تاریخ کے ساتھ ساتھ اسس کے فوائد اور اس کو صحیح طور پر ادا کرنے کی صورت بھی بیان کروں۔

فریضۂ حج ۔ اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے حج وہ رکن ہے جو اسلام کی حقیقی بنیاد یعنی توحید کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ جیسی موحدانہ عبودیت، مخلصانہ خشیت الٰہی اور والہانہ شیفتگی اس میں پیدا ہوتی ہے اور کسی دوسری عبادت میں نہیں پیدا ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مرکزِ توحید کو جہاں حج کے مناسک ادا کئے جاتے ہیں اللہ نے کچھ ایسی خصوصیت بخشی ہے کہ وہاں مومن کے قلب پر وہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس کا گمان اور اندازہ بھی دوسری جگہ نہیں کیا جا سکتا۔

حج ۹ھ میں فرض کیا گیا۔ ہر مسلمان پر جو سفر کی طاقت اور اسس قدر مال رکھتا ہو کہ اسس کے مکہ آنے جانے اور واپسی تک اسس کے اہل وعیال کے خرچ کے لئے کافی ہو زندگی بھر میں ایک بار حج کرنا لازم ہے۔ اور باوجود استطاعت کے حج نہ کرنا گناہ بلکہ کفر ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے۔

" اور لوگوں پر بیت اللہ کا حج خالص اللہ کے لئے فرض ہے۔ (یعنی) ان پر جو وہاں تک جانے کی استطاعت رکھتے ہوں اور جو کوئی کافر بن جائے تو اللہ دنیا جہاں سے بے نیاز ہے۔" (۳:۹۷)

تاریخ حج ۔ عہد الست کا حامل انسان ابتدائی زمانہ میں باوجود نبیوںؑ اور رسولوںؑ کی تعلیموں کے توحید کی طرف کم مائل ہوا اور اپنی نادانی سے زیادہ تر مظاہر پرستی میں مبتلا ہو کر شرک کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو برگزیدہ فرمایا جو اپنی مستحکم توحید اور شانِ حنیفیت کے باعث موحدوں کے

نوادرات

پیشوائے اعظم ہو گئے۔ انہوں نے اکیلے اللہ کی خاطر اپنے باپ، گھر، خاندان اور وطن سب کو چھوڑنا گوارا کیا اور جس وقت حجاز کے اس بے آب وگیاہ خطہ میں اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو لے کر آئے اس وقت دونوں نے مل کر خلوص قلب اور دلی دعاؤں کے ساتھ اکیلے اللہ کی عبادت کے لئے کعبہ کو تعمیر کیا جو دنیا میں موحدوں کی سب سے پہلی مسجد ہے۔ اللہ نے ان کی دعائیں قبول فرمائیں اور اس گھر کو مبارک اور سرچشمہ ہدایت بنایا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے۔

"پہلا توحید کا گھر جو بنی انسان کے لئے بنایا گیا ہے وہ جو مکہ میں ہے برکت والا ہے اور دنیا بھر کے لئے ہدایت ہے۔" (۹۶/۳)

تیار ہو جانے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ لوگوں میں اعلان کر دو کہ حج کے لئے یہاں آیا کریں۔ سورۃ حج میں ہے۔

"اور بنی نوع انسان میں حج کا اعلان کر دے وہ تیرے پاس پاپیادہ اور سواریوں پر جو ہر دور دراز کے راستوں سے آتی ہیں آئیں گے۔" (۲۲/۲۷)

اس اعلان کے بعد سے حج شروع ہوا اور سلسلہ وار ہوتا چلا آیا۔ لیکن قرنوں پر قرن اور صدیوں پہ صدیاں گزر جانے کی وجہ سے اس میں تغیرات واقع ہو گئے اور خرابیاں بڑھ گئیں۔ کیونکہ اولاد ابراہیمؑ میں سے بنی اسرائیل جن میں انبیاء پیدا ہوتے تھے اور آسمانی کتابیں اترتی تھیں۔ ان کا قبلہ بیت المقدس قرار پایا اور کعبے کا حج بنی اسمٰعیلؑ کی قیادت میں ہوتا رہا۔ جو علوم شریعت سے بے بہرہ اور توحید کی حقیقت سے ناآشنا تھے۔ انہوں نے اس موحدانہ عبادت کو مشرکانہ رسوم کا مجموعہ بنا لیا تھا اور اس توحید کے گھر میں سینکڑوں بتوں کو نصب کر دیا تھا جن کی پوجا ہوتی تھی۔

حج اکبر: جب بنی اسماعیل میں دعائے ابراہیمی کا ظہور ہوا اور نبوت کبریٰ کے وارث رسول عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انہوں نے بحکم الٰہی پھر اس توحید کے رکن یعنی حج کو شرکیات سے پاک کر کے اصلی شکل میں قائم کیا۔ ۹ھ پہلا سال ہے جس میں عہد ابراہیمیؑ و اسماعیلیؑ کے بعد دوبارہ صحیح اصول پر یہ فریضہ ادا کیا گیا۔ یہ حج تاریخ اسلام میں حج اکبر کے نام سے مشہور ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں اس کا یہی نام رکھا گیا ہے۔ اس حج کے امیر سیدنا صدیق اکبر تھے اور نقیب سیدنا علی مرتضٰے رضی اللہ عنہم۔

موسم حج: یہ رکن چونکہ بنیاد اسلام یعنی توحید نیز ملت کے ہر طرح کے منافع کا کفیل ہے اس لئے

سال کا ایک چوتھائی حصہ یعنی شوال، ذی قعدہ اور ذی الحجہ تین مہینے اس کے لئے مخصوص کئے گئے۔ حج کی نیت کرنے والے خالص توحید اور اکیلے اللہ کی رضامندی کی طلب کے لئے جائیں۔ نہ جھگڑیں نہ لڑیں، نہ عورتوں سے ملاعبت کریں اور زادِ راہ ساتھ رکھیں۔ تجارتی سامان بھی فروخت کے لئے لے جانا ممنوع نہیں ہے۔

۹ ذی الحجہ کو میدانِ عرفات میں حج ہوتا ہے۔

فوائدِ حج :۔ حج میں اللہ نے دین اور دنیا دونوں کے بہت فائدے رکھے ہیں۔

(۱) اس توحید کے مرکز میں فریضۂ حج ادا کرنے سے مسلمان عہدِ ابراہیمیؑ کو تازہ کر کے حنفاء کی جماعت میں داخل ہو کر اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرتا ہے جو سب سے بڑی نعمت ہے۔

(۲) کعبہ میں جہاں دنیا کے ہر خطہ کے موحدوں کے گروہ اکٹھے جمع ہوتے ہیں۔ مسلمان آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ اس کا دین کسی خاص قوم یا ملک کا مذہب نہیں ہے۔ بلکہ وہ دینِ الٰہی ہے جو تمام عالمِ انسانیت میں اخوت قائم کرنے کے لئے ہے۔

(۳) حج میں کعبے کا طواف اور وہاں کی عبادت نصیب ہوتی ہے۔ جو دنیا کی سب سے پہلی مسجد ہے اور اُم المساجد کہی جاتی ہے اور جو مبارک ہے اور ہدایت کا سرچشمہ۔

(۴) حج میں مساوات اور اخوت ہے اور وہاں آقا اور غلام اور شاہ و گدا کا امتیاز اُٹھ جاتا ہے۔ اور سب ایک ہی قسم کے فقیرانہ لباس میں ننگے سر حقیقی معبود کے آستانہ پر حاضر ہوتے ہیں۔

(۵) حج میں دنیا کے ہر ملک کے مسلمان اکٹھے جمع ہوتے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے ہر قسم کے دینی دنیاوی علم اور عقلی فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔

(۶) حج جیسی مقدس انجمن سوائے مسلمانوں کے اور کسی قوم یا ملت کے پاس نہیں ہے اس کے ذریعے سے ساری دنیا کے مسلمان ایک ہو سکتے ہیں اور سب کا متحدہ لائحہ عمل یہاں سے تیار ہو سکتا ہے۔

(۷) حج میں سیر و سیاحت کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لوگوں سے مل کر طرح طرح کے تجربے حاصل ہوتے ہیں۔

(۸) حج ایک مجاہدانہ روح اور فوجی نظام پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ تمام حجاج ایک لباس پہنتے ہیں اور ناشائستہ کلام، باہمی لڑائی جھگڑا، فحش اور بے حیائی کی باتیں سب ان کے لئے ممنوع ہیں۔ وہ ایک ساتھ مل کر طواف کرتے ہیں اور ایک ساتھ میدان عرفات میں جا کر حاضری دیتے ہیں۔

(۹) حج میں چاہے تو آدمی سامانِ تجارت لے جا کر بہت نفع کما سکتا ہے۔ کیوں حج میں تجارت اور خرید فروخت کی بھی اجازت ہے۔ قرآن میں حج کے بیان میں ہے "تمہارے لئے کوئی حرج نہیں کہ (حج میں) تم اپنے رب کا فضل (سامانِ معیشت) کماؤ"۔

الغرض اس رکن میں شخصی اور قومی اور ملکی و ملّی ہر طرح کے بے شمار فوائد ہیں۔ اللہ نے قرآن میں ایک مختصر فقرے میں ان سب کو ادا کر دیا ہے۔ "تاکہ لوگ اپنے فائدوں کے لئے حاضر ہوں"۔ لِیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ یہ فائدے نہ دنیا کے ساتھ مخصوص ہیں نہ دین کے ساتھ۔ بلکہ ہر طرح کے ملی، عقلی، مالی اور سیاسی فوائد اس میں داخل ہیں۔ (۲۸/۲۲)

احرام: کعبہ ابھی سینکڑوں میل ہے لیکن معینہ میقاتوں سے نہا دھو کر اور دو رکعت نماز پڑھ کر حجاج اس مقدس مسجد کا زائرانہ لباس پہن لیتے ہیں، جس کو جامۂ احرام کہتے ہیں۔ ایک لنگی اوپر ایک لنگی نیچے۔ زیب و زینت کچھ نہیں، خوشبو اور آرائش ممنوع۔ آقا اور غلام برابر ہوگئے، شاہ و گدا کا امتیاز اٹھ گیا۔ اخوت ہے اور مساوات۔ سب کے سب ایک رب العزت کے آستانہ کے فقیر، اسی کی توحید کا دم بھرنے والے۔ اللھم لبیک۔ لاشریک لک لبیک۔ ہر ایک کے وردِ زبان۔ سارے جھگڑے ٹنٹے ختم، شکار اور کھیل حرام اور لہو ولعب بند۔ قافلہ رواں اور دواں ہے۔ ذوق و شوق سے دل بے تاب ہو رہے کہ کب اس منزل پہنچیں، جہاں برکتیں اترتی اور رحمتیں برستی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جگہ آگئی۔ لبیک کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ زائرین بے قرارانہ شہر میں داخل ہوئے اور پاک و صاف ہو کر اس گھر میں پہنچے جو دنیا کے تمام معبودوں سے زیادہ محترم ہے۔

حجرِ اسود: عہدِ ابراہیمی میں پیمانِ عام لینے کا یہ دستور تھا کہ ایک پتھر رکھ دیا جاتا جس پر لوگ آ کر ہاتھ ملتے اس کے معنی یہ تھے کہ جس عہد کے لئے وہ پتھر رکھا گیا ہے اس کو انھوں نے تسلیم کر لیا۔

جب حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ تعمیر کیا تو اس کے ایک کونے پر عہد کے لئے ایک کالا پتھر جس کو حجرِ اسود کہتے ہیں نصب کر دیا کہ اس گھر میں جس کی بنیاد اکیلے معبود کی پرستش پر ہے جو کوئی داخل ہو پہلے اس پر ہاتھ رکھ کر توحید کا عہد باندھے پھر طواف کرے یعنی اس گھر کے اردگرد سات چکر لگائے۔ گویا وہ اپنے آپ کو اس کی توحید پر جس کی عبادت کے لئے یہ گھر ہے نثار کرتا ہے۔ اگر جان بھی دینی پڑے گی تو اس سے منحرف نہ ہوگا۔

نوادرات
اس پتھر میں نہ کوئی طاقت ہے نہ کوئی قوت۔ نہ یہ جنت کی چٹان ہے نہ عرشِ معلّی کا فرش۔ صرف تجدید عہدِ ابراہیمی اور پیمانِ حنیفیت کے لئے ایک نشان ہے اور بس۔ اس کو چھونے یا ہجوم کی صورت میں دور ہی سے اس کی جانب ہاتھ اٹھا دینے کو استلام کہتے ہیں۔ چونکہ یہ توحید کا مقدس پیمان ہے اس لئے ہاتھ یا پتھر کو چوم بھی لیتے ہیں۔ مسجدِ حرم میں پہنچکر سب سے پہلا کام یہی استلام ہے جس سے طواف شروع ہوتا ہے۔
نادان ہیں وہ لوگ جو عہدِ توحید باندھنے والوں پر سنگ پرستی کی تہمت لگاتے ہیں۔ حج کے جتنے اعمال ہیں وہ تو سارے کے سارے شرک کے مذبح ہیں۔ حجاج کی امتیازی صفت قرآن میں ہے۔ حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ" یعنی وہ اللہ کی طرف ایک رُخ ہو لیے ہیں۔ کسی کو اس کا شریک بنانے والے نہیں ہیں (الحج)
طواف :۔ یہ نظارہ کس قدر رُوح پرور ہے۔ سینکڑوں ہیں جو حجرِ اسود کی طرف ہاتھ اٹھا کے طواف شروع کر رہے ہیں۔ ہزاروں ہیں جو پروانہ وار گھوم رہے ہیں اور اللہ کے نام اس کی توحید اور اس کے آستانہ پر نثار ہو رہے ہیں۔ دل سینوں میں اچھل رہے ہیں۔ آنسو آنکھوں سے ابل رہے ہیں اور منہ سے دعائے طواف کے کلمات نکل رہے ہیں۔ کچھ کعبہ کی چوکھٹ تھامے خشوع اور خضوع کے ساتھ استغفار میں محو ہیں۔ بیسیوں غلافِ کعبہ سے لپٹے ہوئے گریہ وزاری کر رہے ہیں۔ بہت سے دیواروں سے لگے ہوئے سجدے میں پڑے ہیں۔ اور رو رو کر دعائیں مانگ رہے ہیں ایک وارفتگی کا عالم ہے جو سارے مجمع پر چھایا ہوا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساحتِ قرب کی طنابیں کھینچ گئی ہیں اور جلالِ کبریائی سے قلوب پگھل پگھل کر پانی ہو رہے ہیں۔
یوں تو اللہ تعالیٰ کہاں اور کب نہیں ہے مگر بعض بعض مکان و زمان کو اس نے خاص خاص خصوصیتوں سے نوازا ہے جو دوسروں میں نہیں ہیں۔
مقامِ ابراہیم :۔ طواف کے بعد اس تجلّی گاہ میں آتے ہیں جو معاف کے حاشیہ پر ہے۔ یہ معمارِ کعبہ حضرت ابراہیمؑ کا مقام ہے جہاں سنگِ مرمر کا ایک حجرہ اور سائبان بنا ہوا ہے۔ یہ خاص قبولیت کا مصلّی ہے۔ یہاں شکر کا دوگانہ ادا کرتے ہیں اور دل کا خون آنکھوں سے بہاتے ہیں۔
سعی :۔ صفا اور مروہ میں دو فرلانگ سے زیادہ فصل نہیں۔ جس میں نیچے ابن سعود کی بنائی ہوئی پختہ سڑک ہے اور اوپر ٹرکوں کا ڈالا ہوا سائبان ۔ مسجدِ حرم سے مشرق کی جانب پہلا قدم جو باہر رکھا جائے گا وہ اسی سڑک پر پڑے گا جس میں دو رویہ بازار ہے اور مکے کا بڑا بازار۔
طواف کر کے حجاج سعی کے لئے نکلتے ہیں کہ یہ بھی شعائرُ اللّٰہ میں سے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک متبرک ہستی

نے پانی کی جستجو میں ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سات تابانہ چکر لگائے تھے اور اس کی یہ ادا رب العزت کو بھا گئی تھی۔

سعی میں بھی دلوں میں وہی رقت ہے اور وہی سوز وگداز۔ تیز گامی بھی ہے اور آہستہ خرامی بھی۔ کبھی حمد وثنا ہے اور کبھی استغفار ودعا۔ سات بار دوڑتے ہیں اور ہر دوڑ میں وہی محویت ہے اور وہی استغراق جھنڈ کے جھنڈ ہیں مگر ایک دوسرے کو خبر نہیں۔ سڑک کے دونوں جانب دکانیں کھلی ہوئی ہیں اور خرید وفروخت جاری ہے۔ لیکن یہ گدایانِ آستانہ کسی اور ہی دھن میں ہیں۔ ان کو کچھ خبر نہیں کہ کدھر بازار ہے اور کیسا کاروبار۔ ان کا سودا ہی اور ہے۔

سعی سے فارغ ہو کر تمتع یعنی خالی عمرہ کی نیت کرنے والے جامۂ احرام اتار دیتے ہیں کیونکہ ان کا کام پورا ہو گیا۔ اب جس دن حج کو روانہ ہوں گے تو پھر اس کو پہنیں گے۔ لیکن قران یعنی حج وعمرہ دونوں کی ساتھ نیت کرنے والے ابھی اسی فقیرانہ لباس میں رہیں گے تاوقتیکہ جملہ مناسکِ حج پورے نہ کر لیں۔

عرفات: میدانِ عرفات جہاں حج ہوتا ہے مکے سے ۱۵ میل کے فاصلے پر ہے۔ آٹھویں تاریخ کو روانگی ہوتی ہے۔ راستہ بھرا پڑا ہے اونٹوں کی چار چار قطاریں ایک ایک ساتھ چل رہی ہیں۔ ہزاروں گدھوں پر سوار ہیں، لاکھوں پیدل، سب کے سب کسی خاص دھن میں ہیں نہ بات ہے نہ چیت، نہ شور ہے نہ ہنگامہ شام کو منا میں پہنچے، رات کو وہیں منزل رہی۔ صبح کو پھر کوچ ہوا۔ دوپہر تک اس میدان میں داخل ہوئے جو حج کی جگہ ہے اور جس کی کشش ان سب کو کھینچ کر لائی ہے۔ کارواں پر کارواں پہنچ رہے ہیں اور جہاں تک نگاہ جاتی ہے ڈیرے ہی ڈیرے لگے ہیں۔ عہدِ ازلی کے متوالے خمخانۂ الست کے سرشار پیمانۂ خیفیت کے سرمست، مغرب، مشرق، شمال، جنوب، دنیا کی چاروں سمتوں سے دور دراز راہوں سے سمندروں کو عبور اور بیابانوں قطع کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں اور اپنے مالک کی حضوری میں حاضر ہوئے ہیں۔ سب توحید کے فرزند، آپس میں بھائی بھائی ایک ہی لباس، ایک ہی بھیس اور ایک ہی رنگ میں۔ ایک ہی آستانہ کے پجاری اور ایک ہی در کے بھکاری، چلتے ہوئے پتھروں پر، تپتی ہوئی دھوپ میں سر کھولے اور ہاتھ پھیلائے اللہ کے سامنے کھڑے ہیں اور درد بھرے دل کو اس کے آگے انڈیل رہے ہیں۔ دعائیں ہیں التجائیں ہیں۔ تسبیح ہے اور تہلیل، گناہوں کا اقرار ہے اور توبہ واستغفار۔

یہ موقع زندگی میں کسی خوش قسمت ہی کو نصیب ہوتا ہے جو مانگنا ہو مانگ لو۔ جو مقصد ہو طلب کر لو۔

دین کے لئے بھی اور دنیا کے لئے بھی۔ اپنے لئے بھی، اوروں کے لئے بھی۔ کوئی مدعا رہ نہ جائے۔ کوئی آرزو چھوٹ نہ جائے، بڑے کریم کا دربار ہے جو یہاں آنے والوں کو محروم نہیں کرتا۔

لیکن ہائے ہائے اس اجتماع میں یہ انفرادیت؟ بھائیوں سے بھائی خبر تک نہ ہوئے، نہ ایک نے دوسرے کو جانا، نہ دل کی راہیں کھلیں۔ نہ آپس کے دکھ درد معلوم ہوئے۔ رشتۂ اخوت کہاں گیا؟ شیرازۂ الفت کیوں ٹوٹا ہوا ہے؟

خطیب جو رسول پاک کے منبر پر کھڑا ہوا وہ بھی کچھ نہ بولا۔ ایک ڈھلا ہوا مصنوعی خطبہ مقفیٰ و مسجع پڑھ کر اتر آیا۔ نہ ضرورتِ ملت کی خبر نہ شناسائی، نہ حالاتِ ملت پر نظر نہ رہنمائی۔ خالی رسم کی خانہ پری تھی۔ صرف قافیہ بندی کی داد طلبی اور محض بے مغزی کا مظاہرہ۔

ضرورت تھی کہ عرفات میں مسلمان اقوام کا تعارف ہوتا۔ باہم میل جول اور راہ و رسم پیدا کرتے جس سے ساری اُمت ایک رشتے میں منسلک ہو جاتی۔ کیونکہ حج اُمم اسلامیہ کے لئے سب سے بڑا اجتماعی مظہر ہے۔ جس میں اکناف و اطرافِ عالم سے ہر قوم کے مسلمان آ کر ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ اس لئے مناسب صورت یہ ہے کہ جس جس ملک یا قوم کے لوگ یہاں وہ پہلے سے اپنا اپنا ایک امیرِ حج منتخب کر لیں۔ یہ امراء مکے میں پہنچ کر باہم ملیں، تبادلۂ خیالات کریں۔ پھر انہیں میں سے ایک منتخب دماغ عرفات کے مجمع عام میں ایک خطبہ پڑھے جس میں ملت کی اجتماعی حالت پر تبصرہ ہو، ان کی رہبری کی جائے اور کم سے کم ایک سال کا اجتماعی لائحہ عمل ان کے سامنے پیش کیا جائے۔

منبر: ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبروں کو ہدایت کے لئے نصب فرمایا ہے، ان کا رشتہ قلوب کے ساتھ ہے کیونکہ ان سے جو آوازیں نکلتی ہیں وہ دلوں تک نفوذ کرتی ہیں۔ یہ بمنزلہ برقی بیٹری کے ہیں جن سے دلوں کے قمقموں میں روشنی اور حرارت پہنچتی ہے۔ ان سب کا صدر میدان عرفات کا منبر ہے جو افسوس ہے کہ مدتہائے دراز سے خاموش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُمت کے قلوب بے نور افسردہ منتشر اور متفرق ہیں۔ تنظیم کی صورت صرف نصب مرکزیت ہے اور کچھ نہیں۔ کیونکہ مرکز کی طرف ہر فرد متوجہ ہو جاتا ہے۔ جس سے خود بخود ساری قوم منتظم ہو جاتی ہے۔ جیسے شمع کہ اس کے روشن ہوتے ہی گھر کی کل چیزیں اپنی اپنی جگہ پر نظر آنے لگتی ہیں۔ افراد یا جماعتوں یا دیہات یا مسجدوں سے جو لوگ اُمت کی تنظیم کرنا چاہتے ہیں ان کو ہمیشہ ناکامیابی ہو گی۔ کیونکہ یہ اُلٹا راستہ ہے۔

مزدلفہ : عرفات میں حج سے فراغت کے بعد غروب آفتاب کے وقت وہاں سے واپسی شروع ہوتی ہے اور قافلے مشعر حرام کے پاس آکر ٹھہرتے ہیں۔ بالعموم لوگ یہاں پہنچ کر کچھ کھا پی کر سو رہتے ہیں اور بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی یاد کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن نے خصوصیت کے ساتھ یہاں ذکر الٰہی کا حکم دیا ہے یہ ذکر انفرادی نہیں ہونا چاہیئے کہ اکیلے بیٹھ کر تسبیح و تہلیل کر لی بلکہ اجتماعی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ حج کے کل کام اجتماعی ہیں۔ یہاں عظیم الشان محفل ذکر ترتیب دینے کی ضرورت ہے کہ جس میں سب لوگ شریک ہوں اور کم سے کم رات کا ایک حصہ حمد و ثنا تذکیر و موعظۃ وغیرہ میں صرف ہو اور شکریہ کی نظمیں پڑھی جائیں۔ (۱۹۸/۲)

قربان گاہ خلیل ؑ : صبح کو مزدلفہ سے اٹھ کر نماز فجر کے بعد لوگ منا میں آجاتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں توحید کے پیشوائے اعظم اور حنفاء کے سرگروہ حضرت ابراہیم ؑ نے اپنے بیٹے اسماعیل ؑ کو اللہ کے حکم کے مطابق قربان کرنے کے لئے پیشانی کے بل پر لٹا دیا تھا اور چھری نکال چکے تھے کہ آسمانی رحمت نے ہاتھ تھام لیا اور کہا کہ بس تم اپنی طرف سے سب کچھ کر چکے اور اس کڑے امتحان میں پورے اتر گئے۔ اُس کا فدیہ یہ ذبح عظیم ہے کہ ہر سال دین حنیف کے شیدائی اور ملت ابراہیمی کے فدائی لاکھوں ذبیحے یہاں اللہ کے نام پر قربان کر کے سنت خلیل اللہ کو تازہ کرتے ہیں۔

قربانی ۔ یہ مجمع جو اقصائے عالم سے آکر جمع ہوا ہے۔ بیت اللہ کا زائر اور اپنے رب کریم کا مہمان ہے۔ اسی لئے اس نے اپنے بندوں پر جن کو استطاعت دے رکھی ہے یہ فرض عائد کیا ہے کہ ان ضیوف کی میزبانی کریں جس کے بدلے میں ان کو اجر اور ثواب ملے گا۔ دور دور کے ذی مقدرت بھی جو خود نہ حاضر ہو سکیں جانوروں کو قربانی کے لئے بھیج کر اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔ یہی قربانی کی اصل حقیقت ہے یعنی اس کی غرض حجاج کی ضیافت ہے نہ کہ محض خونریزی۔ اللہ کا حکم یہی ہے۔

"قربانی کو خود بھی کھاؤ اور قناعت پیشہ اور مصیبت زدہ لوگوں کو بھی کھلاؤ۔" (۲۲/۲۸)

قربانی کے بعد حج کی تکمیل اور اس فریضے سے سبکدوشی ہو جاتی ہے۔ اب کھانا ہے اور کھلانا اور فرق مراتب کا لحاظ۔ اسی وجہ سے مساوات کے لباس جامۂ احرام کی ضرورت نہیں رہتی۔ حجاج سر منڈاتے، بال ترشواتے اور ناخن کٹواتے ہیں اور صاف ستھرے ہو کر اپنے کپڑے پہن لیتے ہیں تین دن تک مجمع رہتا ہے اور تینوں دن قربانیاں ہوتی ہیں۔ یہی ایام تشریق ہیں۔

نوادرات

صدیوں سے اس قربانی کی جو حالت ہو رہی ہے اس کا بیان تکلیف دہ ہے۔ لاکھوں جانور ذبح کر کے ڈال دیئے جاتے ہیں جن کو کھانے کے لئے گدھ اور گیدڑ بھی نہیں ہوتے۔ آخر ان کو دفن کر دینا پڑتا ہے۔ یہاں بھی تنظیم کی ضرورت ہے۔ ہر ہر قوم کے ڈیرے جداگانہ قطعات میں لگیں۔ کل رقم قربانی کی اس قوم کے پاس جمع کی جائے اور وہی اپنی جماعت کے اندازہ اور ضرورت کے مطابق قربانیاں کرے ایک جگہ پکائے اور ایک ساتھ سب مل کر کھائیں۔ اقوام مسلمہ جن کا دماغی تعارف اُمراء کے ذریعہ سے مکے اور عرفات میں ہو چکا ہے یہاں ایک دوسرے کی میزبانی اور مہمانی کر کے باہم ملیں جلیں جسمانی تعارف پیدا کریں اور باہمی الفت و موانست۔

ان ایامِ تشریق میں ہر جماعت کے امیر کو اپنے ہمراہیوں کو عرفات کا خطبہ اپنی زبان میں سمجھا دینا چاہیئے تاکہ جو حاجی وہاں سے پلٹ کر اپنی بستی میں آئے وہ عرفات کے منبر کا پیغام ساتھ لائے اس سے تمام عالمِ اسلامی میں ایک اجتماعی روح پیدا ہو جائے گی۔

رمی جمرات: منا میں تین جگہ تین نشانات بنے ہوئے ہیں جو شیطان سے تعبیر کئے جاتے ہیں۔ ان پر حاجی تینوں دن کنکریاں مارتے ہیں۔ گویا اس رجم سے اس مدعیٔ دین پر جو انسان کو فریب دے کر تعمیلِ فرمان اور توحیدِ الٰہی سے روکتا ہے لعنت کرتے ہیں۔ یہ دستور اسلام سے پیشتر سے چلا آتا تھا۔ اسلام نے بھی ان کو قائم رکھا۔ قرینِ قیاس یہ ہے کہ رمی جمار کی تاریخ عہدِ ابراہیمی سے نہیں بلکہ اصحابِ فیل کے واقعہ سے تعلق رکھتی ہے جو کعبہ کے ڈھانے آئے تھے۔ اہلِ مکہ نے جو اس طاقتور لشکر کے ساتھ رُو در رُو مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے تھے ان تینوں جگہوں پر پہاڑ سے ان پر پتھراؤ کئے تھے۔ جیسا کہ "ترمیھم بحجارۃ من سجیل" سے ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ "ترمی" کا فاعل بھی وہی مخاطب ہے جو پہلی آیت میں "الم تر" کا فاعل ہے نہ کہ "طیر" جیسا کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں یہ لشکر عذابِ الٰہی سے ہلاک ہو گیا اس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے رجم ہے۔ واپسی کے وقت ہر سال ان تینوں مقامات پر رجم کا دستور مقرر ہو گیا چنانچہ ابرہہ کے راہبر ابورغال ثقفی کی قبر پر بھی جو مکہ اور طائف کے درمیان مقام مغمس میں ہے ہر عرب جو گزرتا ہے رجم کرتا ہے۔

وداع: تین دن یا دو دن جیسا کہ قرآن میں ہے (ھوالحج) منیٰ میں رہ کر مکے میں آجاتے ہیں اور طواف

وداع کرکے وہاں سے رخصت ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی ایک اجتماعِ عام کی ضرورت ہے جس میں سب مل کر حمد وشکر کے ترانے گائیں۔ عربی بھی اور عجمی بھی۔ ایرانی بھی اور تورانی بھی اور پھر وہاں سے باہمدگر مل ملا کر رخصت ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر صحیح اصول پر حج ہونے لگے تو اُمّتِ اسلامیہ کے لئے دنیا جنّت بن جائے۔

میری طالب العلمی

(نوشتہ ۱۹۳۷ء)

مجھے اپنی طالب علمی کے حالات کو منظرِ عام پر لانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ صرف اس خیال سے ان کو لکھ رہا ہوں کہ میرا یہ زمانہ اسلامی ہند میں ایک عظیم الشان مذہبی تحریک یعنی اہلحدیث کے آخری دور کی یادگار ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ ان دھندلے سے نقوش سے جن کو میں تحریر میں لا رہا ہوں اس تحریک کے تاریخ نگار کو کچھ مدد مل سکے۔

ہندوستان میں ترکِ تقلید کا خیال حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات سے پیدا ہوا۔ وہ قرآن کریم پر غائر نظر رکھتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ یہ کتاب سرتاسر ذہنی غلامی کے خلاف صدائے احتجاج ہے تو اہلِ علم کو تقلیدِ شخصی سے روکنے اور تحقیق کی طرف مائل کرنے کے لئے علمی کوشش شروع کی۔ کیونکہ اس ماحول میں جبکہ قرآن کے ترجمہ کرنے پر مسلمان تلواریں کھینچ کر ان کو قتل کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے، تقلید کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھانا سخت دشوار تھا۔

رفتہ رفتہ علماء میں سے کچھ لوگ ان کی باتوں کی طرف توجہ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے پوتے مولانا اسمٰعیل شہید علیہ الرحمہ کے زمانے میں خالص کتاب و سنت کی حامل ایک جماعت تیار ہو گئی۔ ان لوگوں کے حوصلے بلند تھے اور انہوں نے پوری توجہ اعلاء کلمۃ الحق میں صرف کی۔

اس دور کے بعد جماعت کی بقاء کے لئے علماء اہلحدیث نے علمی کوشش شروع کی جن میں شمس العلماء مولانا سید نذیر حسین عرف "میاں صاحب" خاص طور پر ممتاز ہیں۔ انہوں نے دہلی میں حدیث کا درس دینا شروع کیا۔ جو نصف صدی سے زیادہ تک مسلسل جاری رہا۔ اُن کے فیض سے ہندوستان میں ہزاروں علماء محدثین پھیل گئے جنہوں نے گوشہ گوشہ میں کتاب و سنت کی اشاعت کی اور تقلید کو مٹایا۔ میاں صاحب کے آخری زمانہ میں نواب صدیق حسن خاں نے بھوپال سے اس تحریک کی مالی اور علمی امداد کی جس سے اس کو عظیم الشان تقویت پہنچی۔

پہلے اس جماعت نے اپنا کوئی خاص نام نہیں رکھا تھا۔ مولانا شہید کے بعد جب مخالفوں نے ان کو بدنام کرنے کے لئے وہابی کہنا شروع کیا تو یہ اپنے آپ کو "محمدی" کہنے لگے۔ پھر اس کو چھوڑ کر اہل حدیث کا لقب اختیار کیا جو آج تک چلا جاتا ہے۔

الغرض ہندوستان میں غیر مقلدی کا آغاز شاہ ولی اللہؒ سے ہوا۔ پھر مولانا شہیدؒ نے اس کی جماعت تیار کی جس کا امام سید احمد بریلوی کو بنایا۔ اس کے بعد صادق پوری علماء نے تبلیغی اور میاں صاحب نے علمی کوشش سے اس کو مستحکم کیا اور فروغ دیا۔ اس کا آخری مرکز بھوپال تھا جہاں سے اس کی اشاعت کا کام سرگرمی کے ساتھ ہوا۔

نواب صدیق حسن خان کی ذات اور نواب شاہجہان بیگم کی علمی قدردانی کی بدولت بھوپال اس زمانہ میں علماء وفضلاء کا مرکز تھا، نیز اقطاع ہند میں جو علماء مقلدوں کا مقابلہ اور کتاب وسنت کی اشاعت کرتے ہیں ان میں سے اکثر بھوپال سے رابطہ رکھتے تھے اور بعضوں کو امداد بھی ملتی تھی۔ اس وجہ سے ہندوستان کے ہر حصہ سے اس جماعت کے اہل علم کی وہاں آمد و رفت تھی۔ بلکہ نواب صاحب کی عربی تصانیف کی شہرت کی وجہ سے عراق، شام اور نجد وغیرہ کے علماء بھی کبھی کبھی وہاں آتے رہتے ہیں۔

میرے والد مولانا سلامت اللہ مرحوم علماء بھوپال میں سلیقۂ گفتگو میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھے اور عربی نہایت صاف اور بے تکلف بولتے تھے۔ اس وجہ سے ان وفود سے گفتگو کے لئے بیشتر وہی بلائے جاتے تھے۔

نواب صاحب کے انتقال کے بعد سے جو ۱۳۰۷ھ میں ہوا۔ بیرون ہند کے علماء کی آمد کا سلسلہ تو بہت کچھ بند ہو گیا تھا، لیکن ہندوستان کے اہل علم شاہجہان بیگم کے عہد ۱۳۱۹ھ تک آتے رہے کیونکہ امداد کا سلسلہ ان کی زندگی بھر جاری تھا۔

نواب صاحب کے بیٹوں کی زندگی امیرانہ تھی اور ان کے دروازوں پر پہرے تھے جہاں علماء کا گذر مشکل تھا اس لئے وہ لوگ اکثر والد ہی کے پاس ٹھہرتے تھے۔ والد اس زمانہ میں ریاست کے محکمۂ تعلیمات کے مہتمم تھے اور واعظ شہر۔ سرکار کی طرف سے ان کو رہنے کے لئے قدسیہ بیگم کا محل ملا ہوا تھا جو شہر کے معزز ترین حصہ میں شیش محل اور موتی محل کے سامنے واقع ہے اور جس میں سینکڑوں آدمیوں کے رہنے کی گنجائش ہے۔ اس وجہ سے ہمارا گھر مقامی اور بیرونی علماء اہلحدیث کا مرجع تھا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا ان بزرگوں کی خدمت

یں رہا اس وجہ سے مجھے ان کے حالات دیکھنے اور ان کے فیوض و برکات سے متمتع ہونے کے مواقع زیادہ نصیب ہوئے۔

بھوپال میں میری طالب العلمی کا زمانہ ۱۳۰۵ھ سے شروع ہو کر ۱۳۱۹ھ میں ختم ہو جاتا ہے۔ یہ شاہجہاں بیگم کی حکومت کا زریں عہد تھا جن کی دینداری، علمی قدردانی اور بے نظیر فیاضی کی بدولت شہر میں اسلامی شان اور خوشحالی نمایاں تھی اور علم و دین کا چرچا عام تھا۔ اس دراز مدت میں بہت سے علماء و فضلاء کو دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا۔ میں نے ان کو تحریر میں محفوظ نہیں رکھا۔ اب کہ ایک زمانہ گذر گیا ہے۔ بہت تھوڑی باتیں میرے حافظہ میں رہ گئی ہیں۔ ان میں سے بھی صرف انھیں کو لکھوں گا جن کا تعلق میرے تاثرات سے ہے۔ لیکن اس سے پہلے اپنی طالب علمی کا حال نہایت اختصار کے ساتھ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

آغاز میری ولادت میرے وطن موضع جیراجپور ضلع اعظم گڑھ میں ۱۲۹۹ھ میں ۷، ربیع الاول یوم جمعہ کو ہوئی اس وقت میرے والد حج کو گئے ہوئے تھے۔ حجاج کا یہ قافلہ ہمارے دیار میں اب تک مشہور ہے۔ اس میں علاوہ دیگر نامور بزرگوں کے آٹھ مشہور علماء اہلحدیث تھے جن میں مولانا حکیم عبداللہ صاحب جیراجپوری اور مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری بھی تھے۔ ان لوگوں نے علماء حرمین شریفین سے حدیث کی سندیں حاصل کیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ واپسی میں دیر لگی۔

وطن واپس آنے کے بعد والد کو نواب صدیق حسن خان نے بھوپال میں بلا کر مدرسہ وقفیہ کا صدر مدرس کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ مدرسہ سلیمانیہ کے نائب مہتمم ہو گئے۔ پھر جب مولوی محمد بشیر صاحب سہسوانی مہتمم مدرسہ مذکورہ کی تنخواہ مناصب میں منتقل ہوئی تو ان کی جگہ والد مدرسہ سلیمانیہ اور ریاست کے صیغہ تعلیمات کے مہتمم ہو گئے۔ وہ ہر سال گرما کی تعطیل میں ایک ماہ کے لئے وطن آیا کرتے تھے جب میری عمر پانچ سال کی ہوئی تو مجھ کو مکتب میں بٹھا دیا۔

یہ مکتب خاص ہمارے دروازہ پر تھا اس میں ایک میاں جی مولوی شکر اللہ نامی ہمارے خاندان کے بچوں کو پڑھاتے تھے۔ ایسے جلاد کہ اپنی نشست کے سامنے ہمیشہ ایک رسی لٹکائے رکھتے جس میں قصوروار لڑکوں کے ہاتھوں کو باندھ کر ان کی پنڈلیوں پر چھڑیاں توڑا کرتے۔ لڑکے جس قدر ان سے ڈرتے تھے دنیا کی کسی اور چیز سے نہیں ڈرتے تھے۔ لیکن والد نے ان کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو صرف مکتب میں بیٹھنے کی عادت ڈالنے کے لئے آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ سختی نہ کیجئے گا۔ چنانچہ انھوں نے

مجھ پر کبھی سختی نہیں کی اور یہی برتاؤ رکھا۔ جس کی والد نے ان کو ہدایت کی تھی۔ صبح کو جب میں مکتب میں جاتا تو مجھے سبق دیدیتے اور کہدیتے کہ جس وقت یاد کر کے سنا دوگے اس وقت چھٹی مل جائے گی۔ اس میں مجھے بڑی آسانی ہوئی۔ محنت کر کے تھوڑی دیر میں یاد کر لیتا اور سنا کر گھر چلا آتا۔ وہ اس قدر مہربان تھے کہ اگر کسی دن میرا جی پڑھنے کو نہ چاہتا تو چھٹی دے دیتے تھے۔

سال بھر میں قاعدہ اور تین پارے میں نے ختم کئے۔ دوسرے سال جب والد تعطیل میں مکان پر آئے تو مجھ کو مع میری والدہ کے بھوپال لائے۔

یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ میرے ایک حقیقی پھوپھی زاد بھائی عبدالاعلیٰ تھے جن کے والدین انتقال کر گئے تھے۔ اگرچہ ان کے دادا اور چچا موجود تھے مگر والد نے ان کی کفالت اپنے ذمہ لے لی تھی اور ان کو اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے۔ وہ سن میں مجھ سے دو سال بڑے تھے۔ جب میں بھوپال میں آیا ہوں وہ ڈھائی پارے حفظ کر چکے تھے۔ والد نے مجھے بھی حفظ قرآن میں لگا دیا۔

حفظ قرآن۔ والد کے پیش کار سید مظہر حسین مرحوم بڑے متقی، باوضع اور جید حافظ تھے۔ ہم دونوں بھائی مدرسہ میں جا کر ان سے سبق لیتے تھے۔ مکان پر ایک دوسرے حافظ جو پنجاب کے رہنے والے تھے صبح اور شام کو سبق یاد کرانے اور موخرہ سننے کے لئے ملازم تھے۔ ان کا نام عبدالکریم تھا لیکن حافظ "مینو" کہے جاتے تھے۔ جس کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک دن تنہا بیٹھے ہوئے آنکھیں بند کر کے پنجابی میں ایک شعر گا رہے تھے۔ جس کا پہلا مصرعہ یہ تھا۔

مینو تینو کہن وہابی اسوچ کی برائی

اسی دن سے ان کا لقب مینو پڑ گیا اور سب اسی نام سے ان کو پکارنے لگے یہاں تک کہ شہر کے لوگ بھی۔ وہ قرآن صحیح پڑھتے تھے اور قواعد قرأت سے واقفیت رکھتے تھے۔

والد نے ہمارے لئے مطبع نظامی کا چھپا ہوا کلام مجید منتخب کیا۔ جس میں علاوہ اس کے کہ سوائے ایک نقطہ کے اور کوئی غلطی نہیں ہے۔ یہ خوبی ہے کہ ایک پارہ کم و بیش چار ورق اور ایک رکوع نصف صفحہ میں تمام ہوتا ہے جس کا یاد کر لینا طبیعت پر بار نہیں گزرتا۔ ہم ہر مہینہ میں آسانی سے ڈیڑھ بلکہ دو پارے تک حفظ کر لیتے تھے۔ روزانہ پڑھائی کے صرف تین گھنٹے تھے باقی تو دن بھر آزادی۔

عبدالاعلیٰ کو والد نے اپنا بیٹا بنا لیا تھا اور مجھ کو والدہ نے۔ ہم دونوں میں مقابلہ رہتا تھا۔ سبق ہمارے

مختلف منزلوں سے ہوتے تھے۔ باوجودیکہ وہ ڈھائی پارے مجھ سے پہلے حفظ کر چکے تھے۔ میرے ختمِ قرآن کے دن اُن کے چار پارے باقی تھے۔

مجھے ۲۴ مہینے یعنی دو سال پورا قرآن حفظ کرنے میں لگے، جن میں سے تقریباً تین مہینے بیماری میں گذرے۔

یہ بیماری تپ محرقہ کی تھی۔ حکیم بھی تھے اور ڈاکٹر بھی مگر کسی کی دوا سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ سر کے بال جھڑ گئے اور کبھی کبھی غفلت کا غلبہ ہونے لگا۔ ایک دن سرِ شام ہی سے بالکل بے ہوش ہو گیا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ رات بھر والدہ میرے سرہانے بیٹھی رہیں اور والد اضطراب میں چارپائی کے سامنے صحن میں ٹہلتے رہے۔ پریشانی کی وجہ سے گھر میں کھانا بھی نہیں پکا۔ فجر کے وقت جبکہ والد مسجد میں جماعت پڑھانے گئے تھے میں ایک دم اٹھ بیٹھا اور لوٹے میں پانی مانگا۔ والدہ نل میں سے لوٹا بھر رہی تھیں کہ سیڑھیوں پر والد کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی۔ لپک کر گئیں اور کہا کہ لڑکا اٹھ بیٹھا۔ والد اُلٹے پاؤں مسجد کو لوٹ گئے اور مقتدیوں کو جن کے ساتھ مل کر میری صحت کی دعا مانگی تھی یہ خبر سنائی۔ پھر گھر میں آئے۔ میں بشاش تھا اور مرض سے نجات پا چکا تھا۔

میرا ننہال خاندان ہی میں ہے۔ بچپن سے مجھ کو میری نانی اور نانا نے پرورش کیا تھا۔ اس وجہ سے میں والدین سے زیادہ مانوس نہ تھا۔ اور بھولپن سے اُن کو کبھی کبھی تنگ کیا کرتا تھا۔ والدہ نے مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ دیکھو کوئی ایسی بات نہ کرنا جس سے تمہارے میں تمہارے ابا کی زبان سے کوئی برا کلمہ نکل جائے۔ کیونکہ اللہ ان کی بات سنتا ہے۔ میں نے کہا کیا ہماری بات نہیں سنتا۔ کہنے لگیں کہ سنتا تو سب کی ہے مگر ان کی جلد مان لیتا ہے جو اس کے ولی ہوتے ہیں۔ غالباً ٹھیک وہی وقت تھا جبکہ والد اُدھر نماز کے بعد دعا مانگ رہے تھے کہ اِدھر اللہ نے مجھ کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ اس لئے مجھ کو والدہ کی بات کا یقین آگیا۔

والدہ نے میرے صحت یاب ہونے پر اپنے زیوروں کو خیرات کر دینے کی منت مانی تھی۔ صبح کو ان سب کی ایک پوٹلی باندھ کر والد کے حوالہ کر دی۔ انہوں نے اس کو طلباء کے مصرف کے لئے

پورے کی مسجد میں بھیجدیا۔ والدہ نے اس کے بعد سے پھر کبھی چاندی کا ایک چھلا بھی نہیں پہنا۔

یہاں بطور تحدیث نعمت الٰہی کے یہ بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ اس بیماری کے بعد سے آج تک کہ تقریباً پچاس سال ہو گئے اور مجھے ہمیشہ وطن سے باہر غربت ہی میں رہنا پڑا۔ کبھی کسی سخت بیماری میں اللہ نے مبتلا نہیں کیا۔ اتفاقیہ طور پر اگر کبھی کوئی معمولی شکایت ہو جاتی ہے تو دوا کرتا ہوں مگر فوراً اطلاعی خط والدہ کو لکھ دیتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ کس دن ڈاکیہ میرے گاؤں میں جاتا ہے۔ اسی دن شفا کی امید رکھتا ہوں۔ کیونکہ جہاں خط پہنچا۔ والدہ دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ کے سامنے کھڑی ہوگئیں اور ادھر میں اچھا ہوا۔

حفظ قرآن کے بعد رمضان شریف میں صرف چند مہینے رہ گئے تھے اور مجھے اس سال قرآن سنانا تھا اس دیہہ سے روزانہ دس دس پارے حافظ جی کو سنانے شروع کر دیئے اور خوب رواں کر لیا۔ بالآخر ۱۳۰۷ھ میں جبکہ میری عمر کا نواں سال تھا۔ میں نے پہلی محراب سنائی۔ روزانہ ایک پارہ آٹھ رکعتوں میں پڑھتا تھا۔ لیکن دن بھر اس کو رٹتا تھا اور شام کو حافظ جی کو سنا لیتا تھا۔ میری قرأت قواعد کے مطابق اور صاف تھی۔ کہیں بھولتا نہ تھا۔ آواز بھی اس وقت اچھی تھی اس وجہ سے لوگ پسند کرتے تھے اور اہل حدیث دور دراز محلوں سے سننے کے لئے آتے تھے۔ شب قدر کے خیال سے ستائیسویں رات ختم کے لئے متعین ہوئی۔

لے یہ مسجد وسط میں واقع ہے جس میں اس زمانہ میں چالیس پچاس طالب علم رہتے تھے۔ ان میں سے اکثروں کو ۱۲ سیر گیہوں ماہانہ سرکار سے ملتے تھے۔ باقیوں کے لئے دیگر وظائف کا بندوبست ہو جاتا تھا۔ وہ زمانہ چونکہ بھوپال میں عام خوشحالی کا تھا اس وجہ سے اکثر بلکہ روزانہ شادی، غمی، تیجا، چہلم وغیرہ کی دعوتیں ان طلباء کو نصیب ہوتی تھیں اور ان کی پانچوں انگلیاں ہمیشہ گھی میں تر رہتی تھیں۔ یہ مشہور تھا کہ ابراہیم پورہ کی مسجد میں ایک چٹائی کی جگہ ایک اقلیم کے تخت کے برابر ہے۔ میں نے ایسی مثالیں بھی دیکھیں کہ لوگ یہاں سے پڑھ کر اپنے وطن واپس آ گئے۔ ایک مدت کے بعد پھر جب بھوپال کا پلاؤ زردہ یاد آیا دوبارہ آکر داخل ہو گئے اس میں ایسے طلبا بھی تھے جن کو اپنے داخلہ کی تاریخ بھی یاد نہ تھی اور جن کی عمریں چالیس سال سے بھی زیادہ تھیں۔ یہ صرف بھوپال ہی کا حال نہیں بلکہ تمام اقطاع ہند میں عربی خواں طلبہ کے گذارہ کی شکل بیشتر اسی قسم کی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم و فضل حاصل کر لینے کے بعد بھی بالعموم دناءت طبع اور پست خیالی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔

اس دن مسجد آراستہ کی گئی۔ والد نے دن بھر مٹھائی تیار کرائی اور سرکار کی طرف سے چھ بورے بتاشے لٹے اور کچھ روپے بھی جوان حافظ صاحب کو دیئے گئے۔ جنہوں نے میرے پیچھے کھڑے ہو کر قرآن سنا تھا۔

اس دن والدین کی خوشی دیکھ کر مجھے اپنا گھر خوشی سے معمور نظر آتا تھا اور اس خیال سے اس میں اور بھی زیادتی ہوتی تھی کہ یہ میری بدولت حاصل ہوئی ہے۔

شام کے وقت والدہ نے مجھے وہ کرتہ اور پاجامہ پہنایا جس کو خود اپنے ہاتھ سے سی کر تیار کیا تھا اب تک مجھ کو اس کرتے کا رنگ اور بوٹے یاد ہیں۔ اس وقت مجھ میں عقل نہیں تھی ورنہ اس کو پیراہن یوسف کی طرح زندگی بھر کے لئے محفوظ کر لیتا۔

دوسرے دن صبح کو والد نے ایک نہایت قیمتی زرتیں دوشالہ جو اُن کو اسی سال سرکار سے خلعت میں ملا تھا نکالا اور اس پر سو روپے رکھ کر مجھے حکم دیا کہ اپنے استاد حافظ سید مظہر حسین کے سامنے لے جاکر پیش کر دو ایک آدمی کے سر پر مٹھائی کا ٹوکرا رکھ کر ساتھ کر دیا۔ حافظ صاحب موصوف نے خوش ہو کر اپنا متبرک ہاتھ میرے سر پر پھیرا اور مجھے دعائیں دیں جن کا اثر بحمد اللہ آج تک میں دیکھ رہا ہوں۔

فارسی

حفظِ قرآن کے بعد روزانہ صبح کو ایک منزل سنانے کا سلسلہ سالہا سال تک جاری رہا۔ اسی کے ساتھ فارسی کے چھوٹے چھوٹے رسائل جو اس زمانہ میں عام طور پر پڑھائے جاتے تھے۔ ہم نے گھر ہی میں پڑھے۔ حفظِ قرآن کی بدولت محنت کی عادت پڑ گئی تھی اور حافظہ قوی ہو گیا جو کچھ پڑھتے تھے چند بار دہرانے سے ازبر ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ گلستاں اور بوستاں دونوں کتابیں پوری پوری یاد کر ڈالیں۔ ہم جمعرات کو ان کے ایک ایک باب کا اموختہ کھڑے ہو کر سنایا کرتے تھے۔ قواعد کی مشق لکھا کر کرائی گئی۔ چنانچہ اس نوشتہ کو "قواعد السلمیہ" کے نام سے میں نے اسی زمانہ میں سرکاری مطبع میں طبع کرا دیا تھا۔ ایک جزء کا مختصر رسالہ سلیس فارسی زبان میں ہے۔

اس کے بعد مولانا احسن صاحب شاعر گر[1] کے دو رسالے پنج سبق اور دہ سبق معہ تحریری مشق کے پڑھے

---

[1] مولانا احسن صاحب بلگرامی اپنے فن کے ایک ہی شخص تھے انہوں نے ایک نقشۂ الف ترتیب دیا ہے جس سے ہر شخص بالغور و فکر کی زحمت کے فارسی اور اردو شعر کہہ سکتا ہے یا اشعار کا چربہ اتار سکتا ہے۔ بھوپال میں یہ مشہور تھا کہ مولوی احسن کا سایہ بھی کسی پر پڑ جائے تو وہ شاعر ہو جائے یہی وجہ تھی کہ ان کا لقب شاعر گر تھا۔ ان کا یہ نقشہ اب بھی میرے پاس ہے لیکن مرموز ہے جس کو حل کرنے والا ابھی تک کوئی نہیں ملا۔ ۱۹۱۷ء میں میں نے بھوپال کا سفر اسی لئے کیا تھا۔ مگر اس وقت وہاں ان کا کوئی شاگرد جس نے ان سے یہ نقشہ پڑھا ہو نہیں مل سکا۔

جن سے صحیح فارسی لکھنے کا ڈھنگ آگیا۔ فارسی کی دیگر درسی کتب کی تعلیم والد نے مولوی فتح اللہ صاحب کے سپرد کردی۔

مولوی صاحب موصوف نے ایک دن ظلمات اور آب حیات کے قصہ میں فرمایا کہ اس کی حقیقت بھی کچھ سمجھے؟ ظلمات سے مراد سیاہ حروف ہیں اور آب حیات سے معانی۔ جو شخص عبارت سے مطلب نکال لیتا ہے۔ وہ گویا خضر ہے کہ ظلمات میں سے آب حیات لاتا ہے اور یہ قدرت صرف مطالعہ کی قوت بڑھانے سے حاصل ہوتی ہے اور جو شخص ہر قدم پر استاد کا محتاج ہے وہ اس سے محروم رہتا ہے۔ جیسے سکندر کہ خضر کی رہنمائی سے بھی آب حیوان اس کو نصیب نہ ہو سکا۔ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ اسی دن سے میں نے آئندہ سبق کا مطالعہ لازم سمجھا جس کی بدولت ہر کتاب آسان ہو گئی اور فارسی کا درسی نصاب جلد ختم کر لیا۔ اس کے ساتھ بہت سی بالائی کتابیں مثلاً شاہنامہ فردوسی و دواوین اساتذہ و مثنویاں وغیرہ خود اپنے شوق سے دیکھ ڈالیں۔

اس زمانہ میں بھوپال میں فارسی کا چرچا عام تھا۔ میں اس میں شعر بھی کہنے لگا تھا مگر والد کو جب علم ہوا تو انہوں نے تضیع اوقات کے خیال سے منع کر دیا۔ فارسی کا کل مرحلہ چار سال کے اندر ہی ختم ہو گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ریاضی بھی۔

ریاضی حساب، اقلیدس، مساحت اور جبر و مقابلہ پڑھانے کے لئے مولوی شاہ محمد صاحب جو بھوپال کے مشہور ریاضی دان تھے مقرر ہوئے۔ روزانہ ہمارے گھر آ کر تعلیم دیتے تھے۔ ایک دن انہوں نے امتحان لیا۔ کسر مؤلف کا سوال تھا۔ سب سے پہلے اس کا جواب میں نے دیا۔ انہوں نے سلیٹ کو دیکھا اور الٹ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد میرے اور ساتھیوں نے اپنی اپنی سلیٹیں دیں۔ وہ ان کو اسی ترتیب سے ایک دوسرے پر رکھتے گئے۔ جب سب کے جوابات آ گئے تو غالباً اس وجہ سے کہ پہلی نظر میں ان کو میرا جواب غلط معلوم ہوا تھا بے ساختہ ایک طمانچہ مجھ کو مار دیا۔ میری زندگی میں یہ بالکل نیا اور غیر متوقع واقعہ تھا اس لئے میں مضطرب ہو گیا اور میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے مگر خاموش بیٹھا رہا۔ جب انہوں نے اطمینان سے جوابات دیکھے تو کسی کا عمل غلط تھا اور کسی کا جواب۔ لیکن میرا جواب اور عمل دونوں ٹھیک نکلے۔ میں نے پوچھا کیا غلطی ہوئی؟ کچھ نہیں بولے میں اٹھ کر سیدھا اپنے کمرہ میں چلا آیا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ مجھے سخت رنج تھا۔ کیونکہ میں ہر استاد کی عظمت کا لحاظ رکھتا تھا اور اس کے ہر حکم پر اس کی منشا کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتا تھا کبھی کسی استاد کو ناراض ہونے کا موقعہ نہیں دیا اور ان کی طرف سے بھی سوائے شفقت اور محبت کے کوئی دوسری بات نہیں دیکھی۔ اس

لئے اس واقعہ سے نہ صرف میری عزتِ نفس بلکہ اس اعتماد کو بھی صدمہ پہنچا جو میں استادوں پر رکھتا تھا۔ اگرچہ تسلی کے لئے یہ بات کافی تھی کہ استاد اور ساتھیوں دونوں پر ظاہر ہو گیا تھا کہ میں بے قصور ہوں مگر پھر بھی قلق تھا کہ یہ بات ہی کیوں پیش آئی۔

مجھے معلوم نہیں کہ اس کے بعد واقعہ کی رفتار کیا ہوئی مگر پھر مولوی صاحب موصوف ہم کو پڑھانے کے لئے نہیں آئے بلکہ ان کی جگہ مولوی محمد اکبر خاں صاحب جو مدرسہ جہانگیری میں ریاضی کے مدرس تھے آنے لگے۔

میرے نزدیک استاد اور شاگرد کا تعلق دماغی ہے۔ یہ نہ بیٹے اور باپ کا سا رشتہ ہے نہ بھائی اور بھائی کا سا۔ بلکہ افادہ اور استفادہ اور خوردی اور بزرگی کا ایک مصاحبانہ مگر مقدس تعلق ہے جس کا احترام شاگرد سے زیادہ خود استاد پر لازم ہے کیونکہ استاد کی ذرا سی بھی غلطی سے شاگرد کو بہت نقصان پہنچ جاتا ہے بخلاف اس کے شاگرد کی غلطی استاد کے لئے زیادہ خطرناک نہیں ہے۔

ریاضی ختم کرنے کے بعد ایک ماسٹر صاحب مجھے انگریزی پڑھانے کے لئے اسی وقت میں آنے لگے۔

صرف و نحو

ان کی تعلیم میں کتابوں کی بجائے اصل فن کی سکھانے پر نظر رکھی گئی۔ طریقہ یہ تھا کہ مولوی فتح اللہ صاحب دن کو سبق پڑھاتے اور شام کو بعد مغرب ہمارے یہاں آجاتے۔ ان کے مواجہہ میں والد مجھے حکم دیتے تھے کہ جو کچھ تم نے پڑھا ہے بیان کرو۔ میں روزانہ اپنے ہر ایک سبق کی صاف اور سلجھی ہوئی تقریر تیار کر رکھتا تھا۔ کھڑے ہو کر سنا دیتا۔ اگر کوئی اعتراض ہوتا تو اس کا بھی جواب دیتا۔ ہر مہینہ کے آخر میں اس مہینہ کی پوری پڑھائی اپنی عبارت میں لکھ کر پیش کرنی پڑتی تھی۔ یہ سلسلہ فصولِ اکبری اور کافیہ تک رہا جو بر زبان یاد کرائی گئی تھیں۔

بھوپال میں اس وقت صرف و نحو کے اچھے اچھے استاد تھے۔ جب اُن میں سے کوئی ہمارے یہاں آتا تو امتحان لیتا۔ میرے ساتھی اس کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن مجھے خوشی ہوتی تھی کیونکہ میں ہر سوال کا جواب دینے کو تیار تھا۔

جب شرح جامی شروع ہوئی تو میرے ساتھیوں کی تعداد ۱۲ تک پہنچ گئی۔ میں اپنا سبق مطالعہ کر کے ایسا تیار کر لیتا تھا کہ استاد سے کسی بات کے سمجھنے یا پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی۔ ان کو یہ بات معلوم تھی اس وجہ سے سبق کے وقت تقریر مجھ سے ہی کراتے تھے۔

تکرار[1] میں مَیں اطمینان کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو سمجھاتا تھا۔ ان میں ایک شخص مولوی محمد عبدالصمد صاحب سرحد کے رہنے والے تھے۔ جن کی عمر تیس سال سے کم نہ تھی۔ وہ بارہا شرح جامی مختلف مدرسوں میں پڑھ چکے تھے بلکہ انہوں نے خود کافیہ کی ایک شرح فارسی میں لکھی تھی۔ تحریر سنبٹ ان کو مستحضر تھی اس کے اعتراضات کرتے تھے مگر وہ کتاب میرے پاس بھی تھی اس لئے میں جوابوں کے واسطے تیار ہو کر آتا تھا۔

فقہ و اصول مولوی فتح اللہ صاحب جس طرح صرف و نحو میں اچھے استاد سمجھے جاتے تھے اسی طرح فقہ اور اصول میں بھی ان کی شہرت تھی۔ والد نے ان علوم کی تعلیم بھی انہیں کے سپرد کی۔ اہل حدیث کے نزدیک فقہ کی دینی اہمیت نہیں ہے۔ اس کی تعلیم محض اتمام نصاب کے لئے دی جاتی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے اکثر مسائل سے ہماری روح بغاوت کرتی تھی۔

ایک بار قاضی شیخ محمد صاحب جعفری نے مجھ سے پوچھا کہ تم کیا پڑھ رہے ہو؟ میں نے کہا کہ شرح وقایہ پھر پوچھا کہ حدیث کی بھی کوئی کتاب پڑھی ہے یا نہیں؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ کہنے لگے کہ تمہارے والد بہت دانشمند ہیں۔ وہ پہلے تاریکی کی سیر کراتے ہیں تاکہ روشنی کی قدر معلوم ہو سکے۔

اصولِ فقہ قیاسی علم ہے جس سے مجھ کو دلچسپی ہو سکتی تھی مگر نصاب میں جو کتابیں ہیں ان کا علمی پہلو نہایت حقیر ہے۔ والد نے جب شکایت سنی تو غزالی کی "المستصفیٰ" کے مطالعہ کا مشورہ دیا۔

سراجی میں جب حجب کا مسئلہ آیا اور معلوم ہوا کہ حافظ عبدالاعلیٰ محجوب الارث ہیں تو اُن سے زیادہ مجھ کو قلق ہوا۔ میرا دل مطلقاً قبول نہیں کر سکا کہ یہ اسلام کی تعلیم ہو سکتی ہے کہ یتیم پوتا جملہ خاندانی ملکیت سے محروم کر کے گھر سے خارج کر دیا جائے۔ لیکن جس قدر اس کی تحقیق کی اسی قدر اس پر نہ صرف مذاہب اربعہ بلکہ جملہ ائمہ حدیث علماء سلف کو متفق پایا۔ اور ساری اسلامی تاریخ میں ایک شخص بھی ایسا نہ ملا جس نے اس کی مخالفت کی ہو۔ مگر دل میں یہ خلش برابر رہی۔ الحمد للہ کہ قرآن کریم نے رہنمائی کی اور سورج کی طرح واضح کر دیا کہ یہ مسئلہ صحیح نہیں ہے۔ آخر میں خواجہ احمد دین صاحبؒ امرتسری کے رسائل سے جو انہوں نے اس مسئلہ پر لکھے تھے۔ مجھے مزید دلائل مل گئے۔ میں نے سالہا سال تک بہت سے اہل علم سے زبانی گفتگو کی اور جو اہل فتویٰ ہیں ان سے تحریری مناظرے

---

[1] یہ طلباء کا اصطلاحی لفظ ہے۔ استاد سے سبق پڑھ لینے کے بعد جماعت الگ بیٹھ کر اسی سبق کو آپس میں مل کر دہراتی تھی اسی کا نام تکرار تھا۔ یہ اس زمانہ میں عام تھا اور بالخصوص ہماری تعلیم میں لازمی قرار دیا گیا تھا۔

کئے، مگر کسی کے پاس میری دلیلوں کے جواب نہ نکلے۔ اس وقت رسالہ محجوب الارث لکھ کر شائع کیا جس میں ثابت کیا کہ قرآن اور حدیث تو خیر خود فقہ کی رُو سے بھی یتیم اولاد محجوب نہیں ہو سکتی۔

اس مسئلہ کے علاوہ میراث کی تدوین میں بنیادی غلطیاں ہو گئی ہیں جن کو خواجہ احمد الدین صاحبؒ نے اپنے رسالہ معجزۂ قرآن میں تفصیل کے ساتھ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے ان کو علمی شکل میں ترتیب دے کر عربی زبان میں "الوراثۃ فی الاسلام" کے نام سے شائع کیا۔

منطق و فلسفہ ۔ والد نے خود صغرے وکبرے وغیرہ پڑھا کر منطق کے اصول ذہن نشین کرائے۔ پھر تہذیب زبانی یاد کرائی۔ اس کے بعد شرح تہذیب اور ہدایت الحکمۃ ساتھ ساتھ پڑھائی۔ روزانہ دو سبق فقہ اور اصول کے مولوی فتح اللہ صاحب کے یہاں ہوتے تھے اور دو سبق منطق و فلسفہ کے والد کے یہاں۔ لطوالت میں پہنچ کر صرف ایک سبق روزانہ رہ گئے۔ جن کو والد خود ہی پڑھاتے تھے۔ صدرا اور شمس بازغہ تک یہی سلسلہ رہا۔ ضیاۃ میں تصریح اور شرح چغمینی بھی والد ہی نے پڑھائی۔

ادب ۔ والد نے پہلے زمخشری کی اطواق الذہب حفظ کرائی۔ پھر نفحۃ الیمن پڑھائی۔ ہمارے مکان سے ملا ہوا مکان مولانا عباس کا تھا جو صاحب نفحۃ الیمن احمد شروانی یمنی کے بیٹے تھے۔ میرا خیال تھا کہ باپ کی تصنیف بیٹے سے پڑھیں۔ لیکن والد کو ان کی عربیت پر اعتماد نہ تھا۔

صحابہ کرام کے رجزیہ وبعض دیگر شعراء کا ایک مختصر مجموعہ والد نے کیا تھا۔ اس کو ہم سب نے نقل کر لیا اور سبقاً سبقاً پڑھ کر یاد کیا۔ پھر مقامات زمخشری پڑھی اور سبعہ معلقہ ازبر کیا۔ حریری اور ہمدانی کے مقامات اور دیوان متنبی وحماسہ کے انتخابات تقریباً نصف نصف جو خود والد نے کر دیئے تھے پڑھے۔

حکیم معز الدین خاں صاحب سابق افسر الاطباء بھوپال نے مطول کو محشی کر کے نہایت خوبی کے ساتھ چھپوایا تھا جس زمانہ میں اس کتاب کو میں شروع کرنے والا تھا انہوں نے ایک نسخہ والد کے لئے اور ایک نسخہ میرے لئے بھیج دیا۔ اس وقت خوشی اور ممنونیت کا جذبہ جو میرے دل میں پیدا ہوا تھا آج تک یاد ہے۔

ادب کی تعلیم عربی ہی زبان میں دی جاتی تھی اور ہر ہفتہ میں ایک فقرہ عربی میں ترجمہ کرایا جاتا تھا۔ مطالعہ کے لئے واقدی کی فتوح الشام اور الف لیلہ کی جلدیں جن کو میں نے چند ہفتوں میں ختم کر ڈالا تھا پھر محاضرات اور تراجم ادباء کی کتابیں دیکھنی شروع کیں۔

حدیث ۔ سب سے پہلے شیخ محمد بن عبد الوہاب سندھی کے رسائل کا مجموعہ جو دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اور

جس میں کتاب التوحید اور کتاب الایمان وغیرہ ہیں سبقاً سبقاً پڑھایا گیا۔ اس کے بعد بلوغ المرام اور موطا امام مالکؒ اصول حدیث میں نخبہ و دیگر رسائل سے جملہ اقسام حدیث اور ان کے علل کے شجرے لکھا کر یاد کرائے گئے۔ آخر میں صحیح بخاری پڑھائی گئی پھر صحیح مسلم۔

میرا خیال تھا کہ کوئی ایک کتاب شیخ حسین عرب سے بھی پڑھ لیتے جو اس وقت حدیث کے حجت استاد تھے مگر والد سند کے زیادہ قائل نہیں تھے وہ لیاقت پیدا کرنی چاہتے تھے۔

قرآن : والد نے کہا کہ میں قرآن پڑھاؤں گا۔ تم میں سے ہر ایک اپنے لئے ایک ایک الگ الگ تفسیر منتخب کرلے اور سبق اسی سے تیار کرکے لائے۔ میں تفسیر کبیر چاہتا تھا مگر اس کو میرے عزیز ترین ہم سبق نور الحسن نے چن لیا۔ کشاف کو عبد الغفور نے لیا۔ میں نے اپنے واسطے شیخ علی مہائمی کی تبصیر الرحمٰن رکھی جس میں آیات کا ربط دکھانے کی کوشش کی گئی ہے اور دوں میں سے کسی نے ابن کثیر کو لیا کسی نے بیضاوی کو۔ کسی نے جامع البیان کو کسی نے جلالین کو۔ والد کے سامنے معالم التنزیل رہتی تھی۔ میں اس کا بھی ایک نسخہ اپنے مطالعہ میں رکھتا تھا۔

یہ سبق روزانہ ظہر کے بعد کم و بیش دو گھنٹہ میں ہوتا تھا۔ ہر آیت بلکہ ہر لفظ کے متعلق تفسیری مباحث مختلف پہلوؤں سے درمیان میں آتے تھے۔

درسی نصاب : جو علوم ہم کو پڑھائے جاتے ہیں ان کی غرض و غایت فنی حیثیت سے اگر یہ بیان کر دی جاتی تھی۔ مگر ہماری نگاہ میں صرف یہ بات تھی کہ جاننے والے معزز اور مولانا سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کا جاننا ہی بجائے خود انسانیت کے لئے شرف ہے۔ اس وقت کسی درسی علم کے ضروری یا غیر ضروری، مفید یا غیر مفید ہونے کا کوئی خیال ہمارے ذہنوں میں نہ تھا۔ لیکن دو باتیں بالخصوص میری نگاہ میں اس وقت بھی کھٹکتی تھیں۔

ایک تو یہ کہ حدیث کے سوا باقی علوم میں خواہ وہ عقلی ہوں یا نقلی جو کتابیں درس میں رکھی گئی ہیں۔ وہ تقریباً تمام کی تمام شرحیں ہیں جن میں نہ صرف غیر ضروری بلکہ غیر متعلق اور لاطائل بحثیں بھری ہوتی ہیں میں سوچتا تھا کہ خود متون مثلاً شمسیہ، مسلم العلوم، مسلم الثبوت اور وقایہ وغیرہ کیوں نہیں پڑھائے جاتے اور ان شروح کی تعلیم میں کیوں فضول وقت ضائع کیا جاتا ہے۔ مگر جب ان متون پر غور کیا تو اس قدر معلق نظر آئے کہ پڑھانے کے قابل نہیں معلوم ہوئے کیونکہ ان کے مصنفوں کے نزدیک بڑا کمال یہ تھا کہ کم سے کم الفاظ میں مسائل کی طرف اجمالی اشارات کر دیئے جائیں خواہ وہ معما ہی کیوں نہ بن جائیں۔

شروح اور متون کی ان خرابیوں کے متعلق اسی زمانہ میں میں نے ایک طالب العلمانہ غزل بھی لکھی تھی جس کے

چند شعر یہ ہیں۔

چیستانِ سُلّم، مسلّم سر بسر ابہام ہے | کچھ عبارت سے نہ حل عقدۂ باطن ہوا
ہوسکے شرحوں سے شرحِ صدر کی امید کیا | شارحوں میں بحث لفظی کا مرض مزمن ہوا
ایک کا اجمال مہمل ایک کی تفصیل لغو | علم تھا جتنا وہ نذرِ شارح و ماتن ہوا

بے شک ان سب میں سراجی ایسی ہے جس کو متن متین کہا جاسکتا ہے۔ اس کے مصنف نے نہ معلوم کس وقتِ نظر کے ساتھ اس کو لکھا ہے کہ بے کم وکاست پورا فن اس سے حل ہو جاتا ہے۔ ساری کتاب میں اگر کہیں ایک لفظ بھی بڑھایا یا گھٹایا، یا بدلا جائے تو وہیں مطلب خبط ہو جائے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس فن کی تدوین ہی میں اصولی غلطیاں ہوئی ہیں۔ جن سے اس کے بہت سے مسائل قرآن کے خلاف پڑتے ہیں لیکن یہ مصنف کا قصور نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ نہ صرف عقائد و اصول و فقہ بلکہ منطق و فلسفہ و ہیأۃ وغیرہ پر بھی جو غیر شرعی علوم ہیں قدامت کے تقدس کا ایک غلاف چڑھا دیا گیا ہے۔ اور جو کچھ کتابوں میں لکھا جا چکا ہے اساتذہ کی نگاہوں میں آخری الفاظ بلکہ مسلمات ہیں جن میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ میری طبیعت میں کچھ تو فطرۃً تنقید کا مادہ ہے اور کچھ والد کی تعلیم نے اس سونے پر سہاگہ کا کام کیا جو بار بار یہ حقیقت ذہن نشین کراتے رہتے تھے کہ سوائے ان چیزوں کے جن پر تم ایمان لائے ہو ہر شے پر تم کو تنقید کا پورا حق حاصل ہے اس لئے میں ان مصنفوں کی بزرگی کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی ان کی جن باتوں کو غلط سمجھتا تھا اُن پر اعتراض کرتا تھا۔ میرے استاد اس روّیہ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ شرح عقائد نسفی پڑھتے وقت میں نے ملّا عبدالحکیم کی ایک صریح غلطی نکالی جو انہوں نے خیالی کی توضیح میں کی ہے۔ استاد نے باوجود اس کے کہ اُن کی مدافعت نہ کر سکے اُن کو اعتراضات سے بالاتر قرار دیا اور ان کی شان میں یہ اشعار سنا کر مجھے خاموش کر دیا۔

خیالاتِ خیالی بس بلند است | در انجا جائے قل احمد نہ جند است[1]
و لے عبدالحکیم خوش خصالی | کہ حل کردہ خیالاتِ خیالی

یہ استاد غیر مقلد تھے مگر مقلد یا غیر مقلد کسی کی تخصیص نہیں، مسلمان من حیث القوم صدیوں سے ماضی

---

[1] مولانا ہندا اور قل احمد خیالی کے دو حاشیہ نگاروں کے نام ہیں۔

پرستی میں مبتلا ہیں۔ ان کی مثال مکہ کے اس نابینائی کی ہے جو باسی روٹی کم تازی سے زیادہ قیمت پر بیچتا تھا۔ کسی نے جب پوچھا تو کہا کہ وہ اس سے مقدم اور عہد رسالتؐ سے ایک رات قریب تر ہے اس لئے اس کے دام زیادہ ہیں۔

اب اگر پوچھئے تو ایک مدت تک غور و فکر کرنے اور نتائج کو دیکھنے کے بعد ان درسی علوم کی نسبت جو مشرقی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں میرا خیال یہ ہے کہ ان میں سے اکثر مردہ علوم کی لاشیں ہیں جن کو ہمارے اساتذہ صدیوں سے اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں اور جن کی عفونت سے عقل اور دین کوسوں بھاگتے ہیں۔

میں اسی میں کسی تبدیلی یا ترمیم کا قائل نہیں ہوں بلکہ کوئی انقلاب چاہتا ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ طلباء کو عربی زبان پختہ طور پر پڑھا کر خالص قرآن و سنت متواترہ یعنی عمل بالقرآن کی تعلیم دینی چاہیے اور بس اس کے بعد ان کو زندہ دنیاوی علوم سکھانے چاہئیں جن سے وہ روزی پیدا کر سکیں اور دین کو دنیا کمانے اور ملت میں تفرقہ ڈالنے کا ذریعہ نہ بنائیں۔

مجھے امید ہے کہ امت میں جس دن مرکزیت آجائے گی اور اجتماعی مقاصد کی تشکیل ہوگی اس دن سوائے قرآن کریم کے کوئی دوسرا دینی نصاب ہمارا قرار نہ پاسکے گا۔

تربیت ، والد نے ہم کو پوری آزادی دے رکھی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اصلاح وہی ہے جو خود اپنے علم سے ہو۔ کسی بزرگ کا یہ مقولہ کئی بار ان کی زبان سے سُنا۔

طَلَبْنَا الْعِلْمَ لِلدُّنْيَا لٰكِنْ اَبَى الْعِلْمُ اَنْ يَّكُوْنَ اِلَّا لِلّٰهِ

صرف ایک چیز تھی جس کی خاص طور پر وہ عزت کرتے تھے یعنی جاہلوں کی صحبت سے پرہیز۔

ہم نے محل کے نیچے کا ایک بڑا حصہ جو مسجد کی جانب ہے پڑھائی کے لئے مخصوص کر رکھا تھا اس میں دن بھر میں اور میرے دس بارہ ساتھی رہتے تھے۔ سوائے پڑھنے، پڑھانے اور علمی بحثوں کے کوئی دوسری بات نہ تھی اور نہ وہاں کوئی بجز اہل علم یعنی علماء و طلباء کے آتا جاتا تھا۔ والد بھی اسی میں بیٹھا کرتے تھے اور اکثر اسی جگہ پڑھاتے بھی تھے۔ وہ ہمیشہ خوش باش رہتے تھے اور ایسا ہی ہم کو بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی محبت اور عظمت کا گھر بھر پر اس قدر اچھا اثر چھایا ہوا تھا کہ ان کی منشا کے خلاف کوئی بات نہیں ہوسکتی تھی۔ اگر احیاناً کوئی غلطی ہو جاتی تو متنبہ کر دیتے تھے مگر دلپذیر انداز کے ساتھ نہ تحکمانہ۔

ایک بار رسالہ کے دوافسر ملنے کے لئے آئے۔ جب اوپر آکر والد کے پاس بیٹھ گئے تو میں چپکے سے نیچے

اُترا اور ان کے گھوڑوں میں سے ایک گھوڑے پر سوار ہوا۔ محل کے سامنے ایک بڑا احاطہ ہے جس میں منشی امتیاز علی صاحب وزیر کی توجہ سے جو صدر منزل میں ہمارے بالمقابل رہتے تھے چاروں طرف سڑک چھوڑ کر اس وقت ایک خوشنما چمن لگایا گیا تھا۔ اسی سڑک پر میں نے گھوڑے کو تیزی سے دو چکر دیئے۔ والد نے ٹاپوں کی آواز سنی ہو گی لہذا یہ بھی اندازہ کر لیا ہو گا کہ کون ہے۔ جب میں اُوپر آیا تو اپنے قریب بلا کر یہ جملہ فرمایا جو حدیث کا ایک ٹکڑا ہے۔

اِنَّكَ امْرَءٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ

بھوپال میں اس زمانہ میں ایک حنفی مولوی جو نیک اور پرہیزگار تھے روزانہ صبح کو اپنے محلہ کی مسجد میں قرآن کا ترجمہ سنایا کرتے تھے شہر کے لوگ دُور دُور سے اس میں اکثر شریک ہوتے تھے۔ والد کی محفل میں ایک ڈاکٹر نے ان کے ترجمہ کی تعریف کی اور اسی کے ساتھ ان کی علمیت کی بھی مدح کرنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ وہ صرف علوم دینیہ سے واقف ہیں اور معقولات نہیں جانتے اور میرے نزدیک اس وقت جو معقولی نہ ہو وہ عالم کہے جانے کا مستحق نہ تھا اس وجہ سے بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا کہ ان کو علم سے کیا واسطہ۔ والد نے میری طرف دیکھا اور یہ شعر پڑھا۔ ؎

وَمَا عَبَّرَ الْإِنْسَانُ عَنْ فَضْلِ نَفْسِهِ بِمِثْلِ اعْتِقَادِ الْفَضْلِ فِي كُلِّ فَاضِلِ

ایک دن ہم کئی طالب علم کسی بحث میں اُلجھے ہوئے تھے۔ والد مغرب کی جماعت پڑھ کر آ گئے۔ ہم کو اس حالت میں دیکھ کر بولے کہ کیسے شیاطین ہیں کہ جماعت کا بھی خیال نہیں کرتے۔ عمر بھر میں یہی ایک سخت لفظ تھا جو ہم نے ان کی زبان سے اپنی بابت سنا۔ لیکن کون کہتا ہے کہ اس موقع پر اس کا استعمال بجا نہ تھا۔

ان کا برتاؤ ہم سب کے ساتھ ایک سا تھا۔ خاص کر حافظ عبدالاعلیٰ اور میرے درمیان میں تو وہ کسی امر میں تفرق جائز ہی نہیں رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم دونوں کے لباس بھی بالعموم ایک ہی کپڑے کے ہوتے تھے مگر ایک بات کا مجھے علم تھا جس کی وجہ سے یہ ظاہری مساوات ناگوار نہیں تھی وہ یہ کہ میرے رات کے رہنے کا کمرہ اُوپر والد کے کمرے کے بازو میں تھا۔ گرمیوں میں جب وہ سائبان میں تہجد کی نماز پڑھتے تھے تو میں ان کی دعائیں سنتا تھا دین اور دنیا کی کون سی خوبی تھی جس کو میرے لئے نہیں مانگتے تھے۔ خاص کر جب وہ مجھ کو اللہ کی امانت قرار دے کر الحاح وزاری کے ساتھ اس کی حمایت اور حفاظت میں سپرد کرتے تھے اس وقت فرطِ رقت سے بستر پہ پڑے پڑے میری آنکھوں سے آنسو کے قطرے تکیہ پر ٹپک پڑتے تھے اور دل ہی دل میں آمین آمین کہتا تھا اس لئے میں جانتا تھا کہ ان کے دل کی دنیا میں میرا کیا مقام ہے اور سمجھ گیا تھا کہ باپ کا رشتہ بیٹے کے ساتھ صرف حسبی نہیں

بلکہ روحی بھی ہے۔

انہوں نے ہمارے لئے ایک استاد بھی مقرر کر دیا تھا جو روزانہ شام کو آکر بانک۔ بانا اور بنوٹ وغیرہ سکھاتے تھے جس سے ورزش بھی ہو جاتی تھی۔ میں نے بندوق کی نشانہ بازی کی بھی مشق کی تھی مگر شکار کی اجازت اسی وقت ملتی تھی جب ریاست کے دورہ میں کبھی والد کے ساتھ ہوتا تھا۔

عرب: والد کو عربوں کے ساتھ بہت محبت تھی وہ ہمیشہ ایک دو عرب خواہ بطور طالب علم خواہ بطور مہمان اپنے یہاں رکھا کرتے تھے۔ جب ہم نے عربی شروع کی تھی اس وقت نجد کے ایک جوان صالح علی بن ناصر ہمارے یہاں رہتے تھے جو نہایت مستعد طالب علم تھے۔ والد کا صحیح بخاری کا درس مشہور تھا جس دور میں علی بن ناصر تھے۔ وہ یادگار دور تھا۔ اس میں اچھے اچھے مشہور اہل علم شریک تھے مثلاً مولوی عبدالحمید بنگالی بستی کے مولانا دیانت اللہ۔ بہار کے مولانا حضرت علی۔ ٹونک کے سید محمد عرفان وغیرہ جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے ناحیہ کا مقتدا تھا۔ ان میں اکثر ایسے تھے جن کی عمریں خود والد سے زیادہ تھیں۔ یہ لوگ ۱۶۔ ۱۷ آدمی تھے۔ جس وقت سبق کے لئے بیٹھتے والد کا کمرہ داڑھیوں سے بھر جاتا۔ انہیں میں مولانا افضل تھے جن کی حنائی داڑھی اس قدر بڑی اور گھنی تھی کہ آجتک میری آنکھوں نے ایسی داڑھی نہیں دیکھی۔ یہ جہانگیر آباد میں رہتے تھے جو ہمارے مکان سے دو میل کے فاصلہ پر ہے اور وہاں سے روزانہ دوپہر کے وقت آتے تھے۔

لطیفہ: اسی زمانہ میں بھوپال میں ایک حافظ صاحب تھے جن کی داڑھی مولانا افضل سے دوم درجہ کی سمجھی جاتی تھی۔ وہ چونکہ نقوش۔ تعویذات اور عملیات کا پیشہ رکھتے تھے جس میں یہ شے بہت کار آمد ہوتی ہے۔ اس وجہ سے مختلف روغن استعمال کر کے اس کو اور بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب مولانا افضل کا انتقال ہو گیا تو چند زندہ دل حافظ صاحب کے پاس پہنچے اور ان کو اس بات کی مبارکباد دی کہ اب آپ کی داڑھی شہر بھر میں بے نظیر ہو گئی۔

علی بن ناصر حدیث ختم کر کے نجد چلے گئے۔ والد کی زندگی تک علماء نجد کی تصنیفات جہاں کہیں بھی چھپتی تھیں برابر بھیجتے رہتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد مکہ کے ایک بزرگ عرب جو شریف صاحب کہلاتے تھے کئی سال ہمارے یہاں مہمان رہے۔ بڑے جہاندیدہ اور خوش طبع تھے۔ دن بھر ان کا سماوار گرم رہتا تھا۔ عربی کتابی اور فصیح بولتے تھے۔ مجھ سے فارسی بھی سیکھ لی اور چند مہینوں میں اس میں بھی گفتگو کرنے لگے۔ آخر میں عبداللہ آیا۔ یہ ایک نجدی نوجوان تھا نہایت وحشی مگر بے حد محنتی۔ اردو ایک حرف نہیں جانتا تھا۔ اس کو حجرہ

مسجد میں ولادیا گیا تھا لیکن ہر شخص سے لڑتا تھا۔ اس لئے دن بھر میرے پاس ہی رہتا تھا۔

عاشورہ کے دن کہنے لگا کہ میلہ دیکھنے چلو۔ میں نے سمجھایا کہ یہ مشرکانہ رسم ہے جس میں شریک ہونا گناہ ہے پھر میرے والد واعظ شہر اور موحدوں کے سرگروہ ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ میں نے بھی یہ میلہ کبھی نہیں دیکھا تھا اس کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ خیال تھا کہ والد کو خبر نہ ہو سکے گی مگر دوسرے دن کسی نے کہہ دیا مجھے بلایا اور پوچھا کہ کل تم کربلا میں گئے تھے؟ یہ سوال ایسا اچانک تھا کہ میں خاص کر سننے کے لئے تیار تھا نہ جواب دینے کے لئے۔ خاموش کھڑا رہا۔ وہ تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے کہنے لگے بولو۔ میں نے کہا کہ اگر میں اپنی آنکھوں سے ایسے مقامات کو نہ دیکھوں گا تو ان میں جو خرابیاں ہوتی ہیں ان کا علم مجھے کیونکر ہوگا۔ یہ جواب سنتے ہی ان کے چہرے سے عتاب کا رنگ جاتا رہا۔ اب صرف یہ شکایت رہ گئی کہ نئی ٹوپی لگا کر اور ہاتھی پر سوار ہو کر میلے میں جانا خود اپنی ذلت ہے اور علم کی اہانت۔

ہم سبق: حفظ قرآن کے بعد میرے خاندان کے دو تین لڑکے بھوپال میں آگئے تھے جو میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ جب میں نے عربی شروع کی اس وقت بعض اعیان و امراء بھوپال یہ سوچ کر کہ مولانا اپنے اکلوتے بیٹے کو خاص توجہ کے ساتھ پڑھائیں گے اپنے اپنے بیٹوں کو میرے ساتھ پڑھنے کے لئے بھیجنے لگے۔ قطبی اور میر قطبی تک ۱۷، ۱۸ ہم سبق ہو گئے۔ دن بھر ہمارا مدرسہ خوب آباد رہتا تھا مگر پھر یہ تعداد گھٹ گئی۔ کیونکہ ہم ذہنی زندگی کی گہرائیوں میں اس قدر گھس گئے تھے کہ مطالعہ اور سبق، تکرار اور بحث ہمارے لئے دماغی آسائش کی چیزیں بن گئی تھیں۔ اس لئے یہ نازوں کے پالے جن کی علمی بنیادیں بھی کمزور تھیں ہمارے ساتھ کیسے چل سکتے تھے مگر ان سے جو تعلقات پیدا ہو گئے تھے وہ برابر قائم رہے۔

میرے ساتھیوں میں سے دو شخص صحیح معنوں میں طالب علم اور سچے رفیق تھے ان کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

عبدالغفور۔ یہ کشمیر کے رہنے والے ۲۲۔ ۲۳ سال کے نوجوان تھے۔ مختلف شہروں سے تحصیل علم کرتے ہوئے بھوپال آئے اور ہمارے ساتھ مقامات حریری میں شریک ہوئے۔ ان کو ادب کے ساتھ خاص ذوق تھا۔ جاہلی شعراء سے لیکر متاخرین تک کے چیدہ چیدہ ہزاروں اشعار، سینکڑوں لطائف اور نکات ازبر تھے۔ یہی حال فارسی میں بھی تھا۔ ان کی وجہ سے میرے ادبی ذوق میں بہت ترقی ہوئی۔

اس زمانہ میں ٹونک کے ایک نامور ادیب مولوی محمد صاحب اعرج ہمارے قرب میں رہتے تھے وہ اپنے

وقت کے حماد الراویہ تھے۔ عربی کا کون سا پسندیدہ کلام تھا جو ان کو یاد نہ تھا۔ خود بھی بے تکلف عربی نظمیں اور قصیدے لکھتے تھے۔ ہم دونوں اکثر ان کے پاس جاکر بیٹھا کرتے۔ عبدالغفور کی آواز اچھی تھی۔ اور شعر پڑھنے کا انداز دلکش۔ روح کی پوری حدت صرف کر دیتے تھے۔ چہرہ پر پسینے کے قطرے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے گلاب کے پھول پر شبنم کی بوندیں۔ میں نے ایک بار شیخ ابن الفارض کا قصیدہ تائیہ خمریہ جو مجھے پسند ہے ان سے پڑھوا کر سنا۔ بیحد لطف آیا۔ خاص کر اس شعر پر پہنچ کر تو وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

لَهَا صَلَوَاتِیْ بِالْمَقَامِ اُقِیْمُهَا ‏ ‏ ‏ ‏ وَاَشْهَدُ فِیْهَا اَنَّهَا لِیْ صَلَّتِ

چند روز کے بعد عبدالغفور خود اسی وزن اور قافیہ میں ۶۰۔۷۰ شعروں کا قصیدہ لکھ کر لائے اور سنایا۔ میں غور سے سنتا رہا کہیں حرف رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ خوش ہوکر ان سے کہا کہ لاؤ وہ ہاتھ دو جس سے اس کو لکھا ہے تاکہ چوم لوں۔

انہوں نے آخر میں میرا بھی ذکر کیا تھا اور جوش میں یہاں تک کہہ گئے تھے کہ

فَیَا لَیْتَنِیْ یَوْمًا اَکُوْنُ کَمِثْلِهٖ ‏ ‏ ‏ ‏ وَیَا لَیْتَنِیْ یَوْمًا اَفُوْزُ بِمُنْیَتِیْ

اس لئے میں نے کاغذ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور اس پر یہ اشعار لکھ دیئے۔

مُحَیَّاکَ یَا عَبْدَ الْغَفُوْرِ مَسَرَّتِیْ ‏ ‏ ‏ ‏ فَلُقْیَاکَ رَیْحَانِیْ وَرَوْحِیْ وَجَنَّتِیْ
وَصَوْتُکَ فِیْ سَمْعِیْ کَمُطْرِبِ نَغْمَةٍ ‏ ‏ ‏ ‏ وَشِعْرُکَ فِیْ قَلْبِیْ کَاَطْیَبِ لَذَّةٍ
وَخُلْقُکَ رَوْضٌ مِنْ رِیَاضٍ لَطِیْفَةٍ ‏ ‏ ‏ ‏ وَحُسْنُکَ مِنْ اٰلَاءِ رَبِّ الْبَرِیَّةِ
فَفِیْ اَیِّ شَیْءٍ خِلْتَنِیْ مِنْکَ فَاَتِّقَا ‏ ‏ ‏ ‏ وَفِیْ مَا اَرَی وَصْفٌ انْتَصَبْتُ لِغِبْطَتِیْ

توقیر الحسن: دوسرے ہم سبق جن کی محبت سے میرا دل لبریز ہے توقیر الحسن تھے۔ یہ بہار کے رہنے والے تھے جہاں کا پانی چالیس دن اگر کوئی غبی بھی پی لے تو ذہین ہو جائے۔ مولوی عبدالوہاب صاحب بہاری دکن سے اپنے وطن جاتے ہوئے جب بھوپال میں ٹھہرے تھے تو ان کے ساتھ چند طالب علم بھی تھے جن میں سے توقیر کو قسمت نے ہمارے لئے چن لیا۔ یہ بھوپال ہی میں رہ گئے اور ہدایہ و حمد اللہ میں ہمارے ساتھ ہو گئے۔ دبلے، دراز قد، نہ جسم نہ صورت مگر دل اور دماغ ایسا کہ کمتر کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ ابراہیم پورہ کی مسجد میں مقیم تھے مگر صبح سے شام تک میرے ہی پاس رہتے تھے۔ روزانہ علمی مسائل پر بحث ہوتی تھی اور جمعہ کا دن تو اس کے لئے مخصوص تھا۔ ہم نے رشیدیہ میں مناظرہ کے جو اصول پڑھے تھے انہیں کو پیش نظر رکھتے تھے۔ اس سلئے ہماری بحثیں

حاصل جل جل کر کسی مسئلہ کی تحقیق کے مترادف نہیں، اور جدل و مکابرہ سے یکسر خالی۔ جس سے باہمی محبت میں فرق نہیں آتا تھا۔

ایک بار مجھے صدر کی شکایت تھی۔ توقیر ملنے کے لئے اوپر آئے۔ ڈاکٹر ولی محمد نے جو میرے معالج تھے "وائن آف کاڈلور آئل" کی شیشی استعمال کے لیے دی تھی۔ اس سے مجھے نمایاں فائدہ تھا۔ توقیر نے جب اس کو دیکھا تو کہا کہ یہ تو شراب ہے حرام، جس میں کوئی نفع نہیں۔ میں نے کہا کہ کتابیں دیکھنے کے بعد اس کی حرمت ثابت کرنا۔ جمعہ کے دن جب بحث ہوئی تو ہم کسی قطعی فیصلہ پر نہیں پہنچ سکے۔ دوسرے جمعہ کو ایک مولانا صاحب حکم مانے گئے۔ انہوں نے فریقین کی تقریریں سن کر میرے دلائل کو قوی بتایا مجھے خوشی تو ہوئی مگر معا دل میں یہ اضطراب پیدا ہوا کہ توقیر کو رنج نہ پہنچا ہو کیونکہ میں نے تیمور کے سامنے سید شریف اور علامہ تفتازانی کی بحث کا حال سنا تھا کہ کسی درباری نے کہہ دیا کہ سید کی تقریر چست تھی اس صدمہ سے علامہ تفتازانی صاحب فراش ہو گئے۔ لیکن جس وقت ہم کمرہ سے نکلنے لگے تو توقیر نے مسکرا کر کہا کہ دراصل جو پہلو میں نے اختیار کیا تھا وہ کمزور تھا۔ یہ سن کر میرے دل کا کانٹا نکل گیا۔ خوش ہو کر ان سے لپٹ گیا اور کہا کہ تم کس قدر حق شناس ہو۔ تمہاری انصاف پسندی پر مجھ کو رشک ہے۔

ایک دن مولوی محمد بشیر صاحب والد سے ملنے آئے۔ ہم لوگ بھی جا کر ان کے پاس بیٹھے۔ اثنائے گفتگو میں انہوں نے فرمایا کہ طالب العلمی کے زمانہ میں میں اور میرے ایک ہم سبق تقلید شخصی کے متعلق بحث کیا کرتے تھے اور ہمیشہ اسی نتیجہ پر پہنچتے تھے کہ وہ جائز نہیں ہو سکتی۔ کوئی عالم خود یا اپنے دو چار شاگرد دو ایک رفیقوں کو لے کر اگر اپنے حجرہ میں رائے اور قیاس سے ایک فقہ مرتب کر دے تو وہ امت کے لئے دائمی شرعی قانون کیسے بن سکتی ہے۔ یہ شرک فی النبوۃ ہی نہیں بلکہ شرک باللہ ہے کہ کسی غیر مامور کا قول بلا دلیل اس طرح تسلیم کیا جائے جس طرح اللہ کا قول۔ اسی کو قرآن کی زبان میں ند کہا گیا ہے

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا (۲/۱۶۵)

میرے اور توقیر کے لئے یہ ایک عمدہ مبحث تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ ہم دونوں اس عالم میں بستے تھے جس کے آسمان کے نیچے اور جس کی زمین کے اوپر تقلید شخصی کا وجود ہی نہ تھا۔ پھر اس کے متعلق بحث کیا کرتے لہذا ہم نے یہ تحقیق شروع کر دی کہ تقلید مسلمانوں پر مسلط کیونکر ہوئی۔ کئی ہفتہ کی محنت اور کوشش سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ فقہ جو شرعی قوانین کا نام ہے اس کی ترتیب خود مرکز کا فریضہ ہے اور اس کو ہر ماحول میں ضرورت

کے مطابق اس میں ترمیم و تنسیخ و تبدیل کا اختیار ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد متغلبین نے جو مرکزیت پر قابض ہو گئے تھے اپنے اس فریضہ کا لحاظ نہیں رکھا اور امور سلطنت کے عملدرآمد کے لئے کسی ایک عالم کی فقہ اختیار کر لی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کو اجتہاد مطلق کا دروازہ بھی بند کرنا پڑا تاکہ ان کی مروجہ فقہ سے تصادم نہ ہو سکے۔ اس طرح پر استبداد نے جہاں مسلم کو حریت عمل سے محروم کیا تھا وہاں حریت فکر بھی اس سے غصب کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری امت شخصی حکومت کی طرح شخصی تقلید میں گرفتار ہو گئی۔ چونکہ مختلف استبدادی سلطنتوں نے مختلف علماء کی فقہیں اختیار کیں۔ اس لئے امت متعدد فرقوں میں بٹ گئی۔ ان مقتدین کا اختلاف بظاہر فروعی کہا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں اصولی ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص امام کی تقلید کا بھی عقیدہ رکھتا ہے۔ لہٰذا جس طرح سُنی اور شیعہ میں اصولی اختلاف ہے اسی طرح اہل سنت کے مذاہب اربعہ بھی جدا جدا فرقے ہیں۔ ہر ایک کے امام الگ الگ ہیں۔ کتابیں الگ ہیں اور علماء الگ الگ ہیں۔

اس نتیجہ پر پہنچتے ہی دفعۃً حدیث کی حالت بھی سامنے آگئی کہ وہ بھی مرکز سے نہیں ملی ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے صحیح جانشینوں نے اس کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے امت کے حوالہ نہیں کیا۔ بلکہ تمام تر رواۃ سے ملی ہے۔ جنہوں نے رضاکارانہ اس کو روایت کیا ہے اور جن کی کوئی مرکزی حیثیت نہیں تھی۔

اس حقیقت پر نگاہ پڑتے ہی میری رُوح لرز اٹھی اور میں نے کہا یا اللہ! سوائے تیری کتاب کے کہیں پناہ نہیں ہے۔ جیسا کہ تو نے خود فرمایا ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا (۱۸/۲۷)

کچھ حدیث کے متعلق۔ یہ خیال اسی وقت دل میں بمنزلہ تخم کے پڑ گیا جو برابر پرورش پاتا رہا۔ ۱۹۰۲ء میں لاہور میں مجھ کو معلوم ہوا کہ مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی حدیث کے قائل نہیں ہیں۔ ان سے جا کر ملا اور گھنٹوں تک گفتگو رہی جن کو انہوں نے اسی بحث میں ضائع کر دیا کہ رسول کا لفظ کلام مجید میں جہاں جہاں آیا ہے اس سے مراد قرآن ہے نہ کہ ایک مخصوص انسان۔ میں نے دیکھا کہ وہ حقیقت آشنا نہیں ہیں۔ انہوں نے سنت متواترہ یعنی عمل بالقرآن کا بھی انکار کر دیا تھا۔ اس وجہ سے سخت مشکل میں گرفتار تھے۔ اور سوائے تاویلات رکیکہ کے حل کے لئے کوئی راستہ نہیں پاتے تھے۔ پھر دوبارہ کبھی ان کی ملاقات کا موقع نہیں ملا۔

جب قرآنی حقائق اللہ نے میرے دل پر کھولے اس وقت حدیث کی اصلی حیثیت واضح ہو گئی کہ وہ

دینی تاریخ ہے۔ خود اس کو دین سمجھنا صحیح نہیں۔ اگر دین ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کی طرح اس کو بھی لکھوا کر امت کو دے جاتے۔ دین کے لئے قرآن کافی ہے جو کامل کتاب ہے اور جس میں دین مکمل کردیا گیا ہے۔

کچھ قرآن کی نسبت ، قرآن کو میں نے توجہ اور محنت کے ساتھ پڑھا تھا لیکن جس طرح ہمارے مفسرین نے اس کو ایک علمی اور نظری کتاب بنا رکھا ہے اسی طرح میں بھی سمجھتا تھا۔ زیادہ توجہ علمی و ادبی لطائف یا فقہی و کلامی دلائل کی طرف تھی اور حقائق جن کی تعلیم کے لئے وہ نازل کیا گیا ہے۔ نظروں سے نہاں تھے۔ ایک بار میں نے ایک خواب دیکھا جس کے بعد میری نگاہ میں حقائق کا جلوہ شروع ہوا۔ میں اپنے جیسے لوگوں کے خوابوں کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں۔ لیکن اس خواب کا اثر چونکہ میری زندگی پر پڑا ہے اس وجہ سے بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

۱۹۱۲ء میں جب میں علی گڑھ کالج میں مدرس تھا ایک رات خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پہاڑی پر اکیلا گھوم رہا ہوں۔ اس کے دامن میں سبز وادی ہے جس میں کہیں کہیں پھول بھی نظر آتے ہیں، وادی کے وسط میں ایک عمارت تھی۔ میں پہاڑی سے اتر کر اس کی طرف گیا۔ جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ تمام تر سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے۔ چاروں طرف سے سیڑھیاں ہیں سیڑھیوں میں اوپر پہنچکر ایک چبوترہ بن گیا ہے جس کے چاروں کونوں پر چار بڑے بڑے کمرے ہیں۔ ان کے درمیان تقریباً تین تین گز چوڑے راستے مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ہیں۔ ان چاروں کمروں کے بیچ میں ایک گنبد ہے جو بہت بلند نہیں ہے۔ میں مشرق کی جانب سے چڑھا تھا جب گنبد کے نیچے پہنچا اور اوپر کی جانب دیکھا تو اس میں پانچ غیر مادی انسانی پیکر جو نورانی تھے اس طرح نظر آئے جیسے فانوس میں تصویریں ہوتی ہیں۔ ان سب میں ایک پیکر زیادہ ممتاز تھا۔ میں حیرت سے دیکھنے لگا یہاں تک کہ ان میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ روشنی کی طرح نیچے اتر کر جنوبی رُخ کی سیڑھیوں سے چلے گئے۔ اس کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ مغربی جنوبی کمرے سے بہت سے آدمی جلدی جلدی نکل کر اس کے سامنے والے شمالی کمرے میں گھس رہے ہیں۔ کوئی کسی سے نہیں بولتا، سب چپ ہیں۔ سب سر برہنہ اور جوان، سب کے سروں پر سیاہ گیسو ہیں۔ اور چہروں پر سیاہ داڑھیاں۔ ہر ایک کے جسم پر ایک ہی لباس ہے یعنی گردن سے پنڈلیوں تک سیاہ اطلس کی عبائیں جو کمروں پر پیلے ریشم کی ڈوریوں سے بندھی ہوئی ہیں۔ میں نے ان میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا کہ یہاں کیا ہے؟ بولا کہ حفاظ جماعت پڑھیں گے۔ میں نے کہا کہ میں بھی شریک ہو جاؤں۔ اس نے کہا کہیے نہ۔ سلام پھرتے ہی وہ اسی طرح جلدی جلدی جنوبی کمرے میں جانے لگے جس طرح اس میں سے نکلے تھے میری

نگاہ کمرے سے نکلتے ہی گنبد کی طرف گئی۔ اور میں نے دیکھا کہ پانچوں شکلیں پھر اپنی جگہ پر ہیں۔ اب میں نے ان نمازیوں میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس ممتاز پیکر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ اس نے کہا تم نہیں پہچانتے یہ حضرت یوسفؑ ہیں۔ میں نے کہا اس کے بعد۔ اس نے جواب دیا کہ ابوبکرؓ۔ میں پھر نے کہا پھر کون ہے؟ بولا کہ عمرؓ۔ میں حیران ہوا کہ یہ یوسفؑ نہیں کے ساتھ ابوبکرؓ و عمرؓ!! معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہمارے یوسف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اسی کا دل کو یقین آ گیا اور میں نے تعظیم کے ساتھ سلام کیا۔ آپ نے ایک شخص سے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ فلاں کا بیٹا فلاں آ گیا ہے اس کی امانت اس کے حوالے کر دو۔ وہ مسکراتا ہوا میری طرف آیا پہلے ایک کلام مجید دیا جس کو میں نے دائیں بغل میں دبایا پھر سات رنگ کے شیشوں کی ایک بڑی رحل جس کو بائیں بغل میں رکھا۔ اس کے بعد ایک قلمدان جس کو دائیں ہاتھ میں لیا۔ یہ چیزیں پاکر میرا دل خوشی سے معمور ہو گیا۔ میں نے گردن جھکا کر شکریہ کا سلام کیا اور ان کو لیئے ہوئے مغربی سیڑھیوں سے اُتر کر چلا آیا۔

اس کے بعد سے روزانہ تلاوت میں فہم معانی میں نیا راستہ کھلنے لگا۔ یعنی آیات کی تفاصیل خود آیات سے سمجھ میں آنے لگیں۔ اور قرآنی حقائق کے چہرہ سے نقاب اُٹھتا گیا۔ رفتہ رفتہ ایک مدتِ مدید کے بعد وہ حقیقتیں عین الیقین بن کر سامنے آ گئیں۔

۱۔ قرآن دینِ الٰہی کا کامل اور بے شائبہ مجموعہ ہے جو ہر زمان و مکان میں انسانی بصیرت کی تنویر اور اس کی ہدایت کے لیئے کافی ہے۔

۲۔ قرآن ایک مکمل کتاب ہے جو اپنی تشریح میں سوائے عربی زبان کے مطلقاً کسی روایت یا انسانی خیال کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی ہر آیت بلکہ ہر لفظ کی تفسیر خود اسی میں ہے۔ اور اختلافِ فہم کی صورت میں حقیقی مفہوم کے تعین اور فیصلہ کی وہ پوری قدرت رکھتا ہے۔

ان حقیقتوں کے ظہور سے قرآن اپنی پوری معجزانہ شکل میں میری بصیرت کے سامنے آ گیا۔ اور مجھے نظر آنے لگا کہ کیوں اس کی تعلیمات ہدایت، رحمت، نور، شفاء لما فی الصدور بلکہ سرتاسر نجات ہیں۔

اِس نعمتِ عظمیٰ پر میں اپنے ربّ کا شکر گذار ہوں جس نے قرآن نازل کیا اور اس کے سمجھنے کی توفیق دی اور اس دربار کا بھی جہاں سے یہ امانت مجھے ملی اور اپنے باپ کا بھی جس نے مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔ پھر اس کو دلسوزی کے ساتھ پڑھایا اور اپنی نیم شبی مناجاتوں میں میری ہدایت کے لیئے رو رو کر دُعائیں مانگیں۔

انہیں دونوں باتوں کو سمجھانے کے لیئے میں نے تعلیماتِ قرآن لکھ کر شائع کی جو اسلام میں اپنی

نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ یعنی قرآن کی تشریح خود قرآن سے اور اس کے کافی اور مکمل ہونے کی شہادت۔
یہ کتاب عقائد و اصول سے متعلق ہے۔ اب اسی نہج پر میرے مخلص دوست چودھری غلام احمد پرویز بی ملت نے پورے قرآن کی آیات کو ترتیب دیا ہے۔ یہ کتاب اگر شائع ہو گئی تو قرآن کو قرآن سے سمجھنا نہ صرف آسان بلکہ دلکش مشغلہ ہو جائے گا۔ اور ترجموں اور تفسیروں سے یکسر بے نیازی ہو جائے گی۔

کاش آج اگر توقیر الحسن زندہ ہوتے تو میرا ساتھ دیتے۔ بچارے عبد الغفور کی زندگی تکمیل علم سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔ اور توقیر چند سال درس دینے کے بعد وفات پا گئے۔ اب جب کبھی یہ ہنستے بولتے میرے تصور میں آجاتے ہیں تو اس وقت کا پورا ماحول اپنے ساتھ لاتے ہیں اور مجھے کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔

لے عیش رفتہ پھر تجھے پاؤں کہاں سے ‏ جو دن گذر گئے انہیں لاؤں کہاں سے

دہلی میں میرے ساتھیوں میں سے مولوی عبد الحفیظ صاحب ہیں جو میاں صاحب کے حقیقی بھتیجے ہیں۔ جب میں پڑھتا تھا اس وقت میاں صاحب نے ان کو بھوپال بھیج دیا۔ یہ رہتے تھے شیخ حسین عرب کے یہاں اور پڑھتے تھے ہمارے ساتھ۔ سوائے دینی بحثوں کے اور کسی بحث میں کم حصہ لیتے تھے اب جو کبھی اہلحدیث کے کسی جلسہ میں مل جاتے ہیں تو پرانی صحبتوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

اساتذہ۔ میرے استاد دراصل دو ہی تھے۔ مولوی فتح اللہ صاحب اور والد۔ ان کے حالات نہایت اختصار کے ساتھ لکھتا ہوں۔

مولوی فتح اللہ صاحب۔ موضع مہوارہ ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے ہمارے ہم وطن تھے انہوں نے اپنے والد سے ابتدائی تعلیم پائی پڑھا۔ جبکہ وہ بنارس میں مدرس دیتے تھے والد نے اپنی مہتمی کے زمانہ میں مدرسہ سلیمانیہ میں عربی کے مدرس دوم کی جگہ ان کو بلا لیا۔ پڑھانے سے عشق تھا۔ کبھی چھٹی نہیں لیتے تھے۔ اور ہمیشہ وقت سے پہلے مدرسہ پہنچ جاتے تھے۔ مدرس اول مولوی مظہر حسین صاحب کہ وہ بھی مہوارہ کے متصل موضع بھادول کے رہنے والے تھے جب بھوپالی رباط کے منتظم بنا کر مکہ مکرمہ بھیج دیئے گئے۔ اس وقت ان کی جگہ مولوی فتح اللہ صاحب کو ملی۔ آخر میں یہ مدرسہ سلیمانیہ کے مہتمم ہو گئے تھے پھر پنشن لے لی۔ سال گذشتہ یعنی ۱۹۲۳ء میں مارچ کے مہینہ میں تقریباً ۸۲ سال کی عمر میں اپنے وطن میں انتقال کر گئے۔

جس وقت میں بھوپال میں آیا تھا ان کی اہلیہ زندہ تھیں۔ وہ کبھی کبھی والدہ کے پاس بھی آیا کرتی تھیں۔ لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد انتقال کر گئیں۔ مولوی صاحب نے پھر نکاح نہیں کیا ان کے کوئی اولاد بھی نہیں

تھی۔ تنہا ایک چھوٹے سے مکان میں تیرن بی کی مسجد کے متصل جو ہمارے گھر سے کسی قدر فاصلے پر ہے رہتے تھے۔ نہایت باوضع اور پابندِ اوقات، نہ کبھی تہجد ناغہ ہوئی نہ جماعت الاماشاء اللہ۔

لباس اور غذا میں صفائی اور سادگی کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ میں نے کبھی ان کو بیمار نہیں دیکھا۔ طبیعت ایسی کہ کسی کو ان سے اور کسی سے ان کو شکایت نہیں پیدا ہوئی۔ آخر میں دو حج بھی کئے عام طور پر لوگ اور بالخصوص اہل محلہ ان کو قطب سمجھتے تھے۔ ایک بار ہماری جماعت میں ان کی ذات زیرِ تنقید آگئی۔ بجز اس کے کوئی گرفت نہ ہو سکی کہ کسی قدر زیادہ بولتے ہیں۔ والد بھی آگئے۔ انہوں نے جب ہماری رائے سُنی تو فرمایا کہ فرغل پر دو شالہ بھی تو اوڑھتے ہیں اور پھوٹ قلاقند کے ساتھ کھاتے ہیں۔ ہم سب ہنسنے لگے۔

میں نے جب سے اُن سے پڑھنا شروع کیا اس وقت سے میرے اوپر اُن کی شفقت برابر بڑھتی گئی۔ وہ مجھ کو بمنزلہ فرزند کے گنتے تھے اور پدرانہ محبت رکھتے تھے۔ وفات سے چار سال پہلے ڈاکٹر شراف کو آنکھیں دکھانے اور مجھے دیکھنے کے لیے دہلی آئے تھے۔

مولوی سلامت اللہ صاحب: یہ میرے والد کا نام ہے۔ تاریخِ ولادت صحیح نہیں معلوم۔ مگر ایک بار اُن کی زبان سے سُنا تھا کہ غدر ۱۸۵۷ء میں سات سال کے تھے۔ ان کے باپ شیخ رجب علی جو درویش صفت آدمی تھے اور میاں صاحب بولے جاتے تھے اُن کو دس سال کا چھوڑ کر انتقال کر گئے۔ دو چھوٹی بہنیں تھیں اور والدہ۔ کوئی سرپرست نہیں تھا۔ میاں صاحب نے کچھ ابتدائی تعلیم دے دی تھی جس کی وجہ سے علم کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے گھر سے بے سروسامانی کے ساتھ نکلے اور جونپور میں جا کر مولوی حیدر حسین صاحب کے مدرسہ میں داخل ہو گئے۔ وہاں دس برس تک پڑھتے رہے۔ ذہانت شوق اور محنت تینوں چیزیں انکے اندر جمع تھیں اس وجہ سے ممتاز طالب علم مانے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں وہاں مفتی محمد یوسف صاحب محلی مدرس تھے۔ جو علومِ عقلیہ اور درویشی دونوں میں کامل تھے ان سے درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر مولانا محمد قاسم دیوبندی علیہ الرحمۃ کے پاس جا کر ایک سال رہے اور وعظ و ارشاد کا طریق سیکھا۔ اس کے بعد دہلی میں میاں صاحب سے دو سال تک حدیث پڑھی اور انہیں کا رنگ اختیار کر لیا۔

وطن واپس جانے کے بعد کتاب و سنت کی ترویج اور شرک و بدعت کے مٹانے میں معروف ہوئے۔ جابجا مواضع میں ان کی تلقین سے اہل حدیث کی جماعتیں پیدا ہو گئیں۔ قبر پرستی، پیر پرستی اور تعزیہ پرستی کو ضلع کے اکثر حصہ سے مٹا دیا۔ اس زمانہ میں جیراجپور میں جو لوگ اُن سے حدیث پڑھتے تھے۔ اُن میں مولوی عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری

بھی تھے۔

ہمارے گاؤں سے ملا ہوا ایک دوسرا موضع بندول ہے جہاں کے ایک معزز وکیل کے بیٹے مولوی شبلی صاحب نعمانی اس زمانہ میں تکمیلِ علوم کر کے آئے تھے۔ اُن کے اُوپر تقلید کا غلبہ تھا۔ اس وجہ سے انہوں نے والد کے ساتھ بعض امور پر مباحثہ کرنا چاہا۔ والد بحث کو ناپسند کرتے تھے۔ مگر ان کے بعض شاگرد ول خاص کر مولوی اسداللہ صاحب نے جو موضع رواں کے رہنے والے تھے جوابات دیئے اور طرفین میں رسالہ بازی ہوئی۔

دو سال کے بعد والد بنارس بلائے گئے۔ وہاں تلوچن محلّہ کے مدرسہ میں پڑھانا شروع کیا۔ ان کے اس وقت کے شاگردوں میں سے اب صرف ایک شخص شمس العلماء مولوی حفیظ اللہ صاحب سابق مہتمم دارالعلوم ندوہ لکھنؤ زندہ ہیں۔

بنارس میں والد کے تعلقات پنڈتوں کے ساتھ بھی ہو گئے تھے۔ ان سے یوگ کا فن سیکھا چنانچہ بھوپال میں ہر جمعرات کی شام کو ان کے پاس شہر کے بڑے بڑے پنڈت رُوپ رام اور کنھیالال وغیرہ آ کر جمع ہوتے اور یوگ کے مسائل سمجھتے۔ نیز جب کوئی نامی پنڈت پریاگ یا اجودھیا وغیرہ کا وہاں آتا تو والد ایک رات ضرور اپنے یہاں محفل منعقد کر کے اس کو معہ بھوپال کے پنڈتوں کے بلاتے اور گھنٹہ دو گھنٹہ علمی گفتگو کرتے۔

بنارس میں کم و بیش آٹھ سال رہے۔ پھر حج کو گئے واپسی کے بعد بھوپال بلائے گئے۔

والد اگرچہ خالص اہلحدیث تھے مگر ان میں تعصب مطلق نہ تھا۔ ہر فرقہ اور ہر جماعت کے لوگ ان کے پاس آتے تھے اور جہاں تک ان کے بس میں ہوتا تھا سب کی مدارات اور مدد کرتے تھے۔ کسی سے بحث یا جھگڑا بالکل ان کو ناگوار تھا۔ ایک بار مولوی محمد شریف صاحب نے ایک شیعہ وکیل[لہ] کو ریاست سے نکلوا دیا۔ والد کو جب اطلاع ہوئی تو فوراً مولوی صاحب کے پاس سمجھانے کے لیئے گئے مگر اس سے پہلے سرکاری احکامات نکل چکے تھے۔

مولوی محمد شریف صاحب نے جب یہ مسئلہ نکالا کہ قربانی آخر ذی الحجہ تک سنّت ہے اور اس پر عمل کا اعلان کیا تو لوگوں نے والد سے آ کر بیان کیا کہ شائد اس مسئلہ کی مخالفت کریں گے مگر انہوں نے مجھے حکم دیا کہ مولوی صاحب کے یہاں دام دے آؤ کہ جس دن وہ قربانی کریں اس میں ایک حصّہ ہمارا بھی رکھیں۔

لہ یہ وکیل مرزا ثاقب قزلباش کے والد تھے جو لکھنؤ کے موجودہ شعراء میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ ان کی غزلیں اس وقت بھی جب کہ وہ بالکل جوان تھے میرے لیئے دلکش تھیں۔

وہ واعظ شہر تھے اور ہر جمعہ کو جامع مسجد میں وعظ کہتے تھے اور اہلِ شہر بالعموم حنفی تھے مگر کبھی کسی کو ان سے شکایت نہیں پیدا ہوئی۔ بلکہ ہر چھوٹے بڑے میں ان کا وعظ مقبول تھا اور ان کی شخصیت محبوب تھی۔ ریاستوں میں اکثر معاملات میں بھی گروہ بندیاں رہا کرتی ہیں۔ وہ کبھی کسی فریق میں شامل نہیں ہوتے اور نہ کسی کی بے جا طرف داری کی۔

جس عسرت میں انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی اس کے لحاظ سے ان کی نگاہ میں روپیہ کی بہت قدر ہونی چاہیے تھی مگر وہ اس کو ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہمیشہ اُن کی تنخواہ خود ہی لاکر اپنے پاس رکھتا تھا اور خانگی ضروریات میں خرچ کرتا تھا۔ کبھی حساب تک بھی تک نہیں پوچھا۔ ان کی توجہ تمام تر اسی پر مبذول رہتی تھی کہ خالق اور مخلوق دونوں کے ساتھ معاملہ کو صاف رکھیں تاکہ حساب کے دن باز پرس نہ ہو۔ جب کبھی اُن کو بخار آتا تو گھر بھر کو اپنے گرد جمع کر کے وصیت کرنے لگتے جس کا ماحصل یہی ہوتا تھا کہ ظاہر اور باطن میں اللہ کا کوئی گناہ نہ ہونے پائے اور کسی بندہ کا کوئی حق سر پر رہ نہ جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ باوجود غفور و رحیم ہونے کے بھی حقوقِ عباد کو معاف نہیں کرے گا۔

جب نواب علی حسن خان نے جو نواب صدیق حسن خان کے بیٹے تھے محکمہ تعلیم کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس وقت شاہجہان بیگم نے والد کی وہی تنخواہ جو مہتممی کی تھی محکمہ مناصب میں منتقل کر دی اور جملہ حقوق برقرار رکھے شرط یہ تھی کہ بھوپال ہی میں رہ کر اپنے گھر پر طلبا کو پڑھاتے رہیں۔

میں تعلیم ختم کرنے کے بعد ۱۹۰۳ء میں پیسہ اخبار لاہور میں مترجم ہو کر چلا گیا تھا۔ دوسرے سال جون کے مہینہ میں والد کی علالت کا تار ملا۔ فوراً بھوپال آیا۔ ذات الجنب کا عارضہ تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی سر گود میں لیکر پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا کہ تم اچھے بیٹے ہو، میں تم سے خوش ہوں۔ میں نے دل میں کہا کہ اے اللہ میرے باپ کے ان لفظوں پر تو گواہ رہنا۔ یہ میرے حساب کے دن کا ذخیرہ ہیں۔

دوسرے دن اُن کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ عشاء کے وقت چارپائی سائبان میں تھی دو ملازم پنکھا جھل رہے تھے خیال تھا کہ نیند آگئی ہے۔ میں ان کے قریب ہی نماز پڑھنے لگا۔ یکایک انہوں نے زور کا ایک سانس لیا۔ نوکروں کو احساس بھی نہ ہوا مگر میرا دل کھٹکا۔ سلام پھیرنے کے بعد دیکھا تو وہی آخری سانس تھا۔ اُن کے سرہانے صحن میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اللہ کا احسان ہے جس نے رنج کے پہلے ہی حملہ میں دل پر صبر انڈیل دیا۔ جہاں تک ہو سکا قرآن پڑھتا رہا لیکن تاہم وہ رات میرے اوپر سخت گزر گئی۔ وہ میری زندگی میں

انقلاب کی رات تھی۔ والد کے چہرہ کے ساتھ دنیا جس قدر مجھ کو خوشنما نظر آتی تھی اُن کے بعد پھر کبھی ویسی نظر نہ آئی۔

أَلَا فَلْيَمُتْ مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ إِنَّمَا　　　عَلَيْكَ مِنَ الْأَقْدَارِ كَانَ حِذَارِيَا

ان کا انتقال ۲۰ ربیع الاوّل ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۵ رجون ۱۹۰۴ء کو ہوا۔

نمازِ فجر کے بعد شیخ حسین عرب آئے۔ اُنہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے غسل دیا۔ جب جنازہ لیکر نکلے تو باہر بڑا ہجوم تھا۔ محبت شاہ کے تکیے میں جو نواب صدیق حسن خاں کے مقبرہ کے مشرق جانب سڑک سے ملا ہوا ہے لیجاکر دفن کیا۔ آنے والوں کا تانتا نہیں ٹوٹتا تھا۔ تین بار جنازہ کی جماعت ہوئی۔

اس واقعہ کے ایک مدت کے بعد ۱۹۱۷ء میں مجھے بھوپال جانے کا اتفاق ہوا۔ والد کے مزار پر گیا۔ دیکھا کہ اس تکیہ کے متصل گوجروں کا ایک محلہ آباد ہو گیا ہے جن کی وجہ سے اس میں جابجا گندگی پھیلی ہوئی ہے۔ دل کو سخت رنج ہوا۔ اسی دن مندرجہ ذیل نظم لکھ کر والیۂ بھوپال کی خدمت میں بھیجی۔

حضرتِ نواب سلطانِ جہاں گردون وقار　　　آنکہ با صد حشمت و شوکت جہانبانی کند
قرۂ اقبال اسمش را مسمّیٰ کردہ است　　　در جہاں چوں نامِ خود بنگر کہ سلطانی کند
مادرِ مشفق بود بہرِ مسلمانانِ ہند　　　مشکلاتِ قومِ ما را حل بآسانی کند
نیتِ پاکش چو صافی تر ز آبِ گوہر است　　　در ہمہ کارش مدد تائیدِ یزدانی کند
مدح مقصد نیست اینجا مدعائے دیگر است　　　ورنہ ناسعلم ہم تواند آنچہ خاقانی کند
بندہ بر درگاہِ تو یک التماس آوردہ ام　　　زیدار لطفت نگاہے سوئش ارزانی کند
چوں پس از قرنے گذارِ من بہ بھوپال اوفتاد　　　جاوداں ز آفاتِ دہرش حق نگہبانی کند
بیقرارانہ دواں رفتم سوئے گورِ پدر　　　ہمچو پروانہ کہ گردِ شمع جولانی کند
دل پُراز سوزِ محبت چشم پُراز اشکِ غم　　　شمع ساں کز شعلۂ خود قطرہ افشانی کند
تکیۂ شاہِ محبت آنکہ مدفن گاہِ اوست　　　بندہ را اندر رشتۂ جاں جذبِ پنہانی کند
اندراں تکیہ کہ برو ئے رحمتِ بسیار باد　　　حالتے دیدم کہ بیدار تیرہ روحانی کند
از غلاظتہا کہ نا اہلاں دراں تکیہ کنند　　　دل نمی خواہد کہ آنجا فاتحہ خوانی کند
بر سرِ گورِ مسلماناں غلاظت کے رواست　　　ایں چنیں بے حرمتیہا خانہ ویرانی کند
دیو سیرت مردمانند اندراں قرب و جوار　　　آں گروہِ کافراں ایں نامسلمانی کند

چشم میدارم کہ سرکار از رہِ لطفِ عمیم
انسدادِ ایں چنیں افعالِ شیطانی کند

آفتابِ دولت واقبالِ تو تابندہ باد
خطۂ بھوپال راعدلِ تو نورانی کند

حسب توقع صفائی کا حکم ہو گیا اور آئندہ کے لیۓ بندوبست کر دیا گیا۔

والد کو لکھنے سے ذوق نہ تھا۔ ایک رسالہ تصوف میں لکھا تھا جس کو میں نے پیسہ اخبار کے دفتر میں چھپنے میں بھیج دیا تھا۔ اس نے میری عدم موجودگی میں غلط فہمی سے اس کو میرے ہی نام سے شائع کر دیا۔ ادھر چند چند سال ہوئے حکیم احمد حسین صاحب الہ آبادی اس کو چھاپنے کیلئے لے گئے۔ میں نے تصحیح بھی کر دی تھی۔ اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا اور مجھے معلوم نہ ہوا کہ اس کو شائع بھی کیا یا نہیں۔ بیعت کے متعلق بھی ایک مختصر تحریر والد کی ملی تھی جس کو انہوں نے چھاپا تھا۔ اس کی چند کاپیاں مجھے بھیج دی تھیں۔

مطالعہ :۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ مطالعہ کی عادت میں نے ڈال لی تھی اور تحصیلِ علم میں اس کی اہمیت عملاً مجھے معلوم ہو چکی تھی۔ اس لیۓ ہمیشہ اس پر اس قدر سختی کے ساتھ مزاولت رکھی کہ کبھی بلا مطالعہ کۓ سبق نہیں پڑھا رات کو لغات و شروح سے مدد لے کر آنے والے سبق کو کوشش کے ساتھ حل کرتا تھا اور یہ سوچتا تھا کہ انہیں عبارتوں سے اُستاد مطلب سمجھ لیتا ہے پھر میں کیوں نہیں سمجھ سکتا۔ رفتہ رفتہ اس میں کامیاب ہو گیا۔ اُستاد بھی میری اس بات سے واقف تھے اس لیۓ سبق کے وقت زیادہ تر خارجی بحثیں کرتے تھے۔ تکرار میں مَیں اپنے ساتھیوں کو پڑھاتا تھا اور میرے ہی بھروسے پر اُستاد کے سامنے سبق میں وہ خاموش بیٹھے رہتے تھے۔

مطالعہ کی عادت نے مجھے اپنا اُستاد آپ بنا دیا تھا۔ دراصل میرے سبق پڑھنے کا وقت مدرسہ میں نہیں تھا بلکہ رات کو تھا جبکہ میں اپنے کمرہ کی خاموش تنہائی میں کتابیں لیکر غور کے ساتھ اپنے سبقوں کو حل کیا کرتا تھا والد کی توجہ کا ہاتھ ہمیشہ میرے دل ودماغ کی نبض پر رہتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مطالعہ کی یکسوئی میں خلل پڑنے سے مجھ کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس وجہ سے خود اس کا خیال رکھتے تھے۔ ایک بار میں نے دیکھا کہ عشار کے بعد میری بہن جو مجھ سے بہت مانوس تھی اور جس کی عمر اس وقت ۵ - ٦ سال کی تھی، میرے کمرے میں آرہی تھی۔ والد نے اس کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا اور سمجھا دیا کہ رات کو کھانے کے بعد بھائی کے پاس مت آیا کرو۔

اگر کسی رات مطالعہ کا موقع نہیں ملتا تھا تو دن کو اُستاد سے کہہ دیتا کہ آج سبق نہیں پڑھوں گا۔

درس :۔ بھوپال میں اس زمانہ میں عربی کے طلبار کی کثرت تھی اور الحمدللہ کہ میں ان میں مقبول تھا۔ اس لیۓ

نہیں کہ یہ مہتمم مدرسہ کا بیٹا تھا بلکہ اس لیئے کہ خود مستعد اور ملنسار طالب علم تھا۔ میں ان سے محبت کرتا تھا وہ مجھ سے محبت کرتے تھے۔ اور بعض بعض میرے پاس پڑھنے کے لیئے بھی آتے تھے۔ اور میں ان کو پڑھاتا بھی تھا والد بھی یہی چاہتے تھے۔ ایک بار انہوں نے ایک ولایتی طالب علم پیر محمد کو میرے سپرد کیا۔ میں ان کو پڑھانے لگا۔ قطبی میں نسبت حکمیہ کی بحث آئی میں نے تقریر کی' وہ نہیں سمجھے۔ دوبارہ بیان کیا ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ تیسری بار سمجھانے کی پوری کوشش کی۔ لیکن پھر وہ ہمہ تن سوال ہی بنے بیٹھے تھے اگرچہ ان کا سن مجھ سے دگنا تھا اور قد بھی مگر میں نے تنگ آکر کتاب اُن کے سر سے ماری اور اُٹھ کر چلا آیا۔ لیکن دل میں سخت اضطراب پیدا ہوا۔ کیا اللہ کے خوف سے؟ نہیں۔ کیا اس کی وجہ یہ کہ اخلاقی حدود توڑے تھے؟ نہیں۔ بلکہ صرف اس لیئے کہ والد جب سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ کیونکہ اس امر کی برداشت کی طاقت میں نہیں رکھتا تھا۔ کہ میری کسی حرکت سے ان کے دل پر کلفت کا غبار آئے۔ سوچتا ہوا سیدھا انہیں کے پاس گیا اور کہا کہ میں ملا پیر و کو نہیں پڑھاؤں گا۔ بولے کہ کیوں؟ میں نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ اُنکے پڑھانے سے میں غبی ہو جاؤں گا۔ والد قیافہ شناس تھے' میرے چہرے پر نگاہ ڈالی گھبراہٹ اور غصہ کے آثار دیکھے۔ کہنے لگے اچھا جاؤ میں اُن کو کسی اور کے حوالے کر دونگا۔

مصیبت اس وقت آتی تھی جب وہ کسی بنگالی طالب علم کو میرے حوالہ کرتے تھے کہ اس کو عربی پڑھاؤ۔ عربی مدارس کو جس قسم کے بنگالی طلبا میسر ہوتے ہیں اُن سے اکثر اساتذہ واقف ہیں سال بھر میں بھی اگر میں اس کو سراجی پڑھا لیتا تو اللہ کا شکر ادا کرتا تھا۔

کتب بینی: بعض بعض بحثوں میں میں نے دیکھا کہ توقیر مجھ سے بازی لے جاتے تھے۔ اس لیئے نہیں کہ اُن کا انتقالِ ذہنی مجھ سے تیز تھا یا وہ تقریر میں مجھ سے بہتر تھے بلکہ صرف اس لیئے کہ ان کا مطالعہ زیادہ وسیع تھا۔ چنانچہ میں نے بھی اس کمی کو پورا کرنے کے لیئے کتب بینی شروع کی اور ابتدا میں کم سے کم سو صفحوں کی رفتار رکھی کتب خانہ مفید عام جس کا ذخیرہ بڑھ کر اب بھوپال لائبریری قائم کی گئی ہے اس زمانہ میں والد کی ماتحتی میں تھا اس میں سے جس قدر کتابیں چاہتا لا کر پڑھتا۔ ادب، مذہب اور تاریخ سے والد کو ذوق تھا۔ انہیں سے مجھ کو دلچسپی ہوئی۔

علامہ ابنِ تیمیہ اور ابن القیم کی جس قدر کتابیں اس وقت تک شائع ہوئی تھیں ان کا ذخیرہ والد خود اپنی الماری میں رکھتے تھے۔ بحرین کے سب سے بڑے موتی کے تاجر شیخ مقبل جوان دونوں بزرگوں کی کتابیں مصر سے شائع کراتے تھے والد کے دوست تھے۔ جو کتاب چھپواتے اس کا نسخہ ضرور بھیجتے۔ علی بن ماضی کی بدولت

علماء نجد کی کتابیں آتی رہتی تھیں۔ نواب صدیق حسن خاں نے جس قدر کتابیں چھپوائی تھیں۔ ان کا ہونا تو ہمارے پاس لازمی تھا۔ فتح الباری، نیل الاوطار، اور فتح البیان کی کل جلدیں ایک ایک ورق دیکھ کر خود لایا تھا۔ اردو کی جدید تصنیفات اس زمانہ میں لکھنؤ، علی گڑھ اور لاہور سے جس قدر شائع ہوئی تھیں ان سب کو میں نے منگایا آخر میں یہ سودا اس قدر بڑھ گیا کہ کتابیں پڑھنے سے سیری ہی نہیں ہوتی تھی اور مسبب الاسباب اس کا سامان بھی کرتا رہا۔ لاہور گیا تو وہاں کی پبلک لائبریری کے علاوہ مولوی عبداللہ صاحب ٹونکی کی مہربانی سے مستشار العلماء کا کتب خانہ میرے لیئے وقف تھا۔ علی گڑھ کالج میں رہا تو مشرقی کتب خانہ خود میری نگرانی میں تھا۔ جو کتابیں اب تک نہیں مل سکی تھیں وہ یہاں ملیں۔ پڑھتا رہا اور پڑھتا رہا۔ آخر میں یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ پڑھنے سیکھنے اور عمل کرنے کیلئے روئے زمین پر صرف ایک ہی کتاب ہے جو عرش سے اُتری ہے اور جس کا نام قرآن ہے۔

چہل سال رنج و غصہ کشیدیم معاقبت
تدبیر ما بدست شراب دو سالہ بود

ملازمت ۔ ۱۹۰۲ء کے اواخر میں بھوپال سے پیسہ اخبار لاہور میں عربی کا مترجم ہو کر ملا۔ وہاں دو سال رہا اور اخبار نویسی کا تجربہ حاصل کیا۔

۱۹۰۶ء میں علی گڑھ کالج میں آیا۔ یہاں کالجیٹ اسکول میں عربی اور فارسی کا مدرس ہوا۔ چھ سال کے بعد کالج کی لٹن لائبریری میں مشرقی کتب کا شعبہ میرے سپرد کیا گیا۔ اور میں نے اس کی فہرست مرتب کی۔

کچھ زمانے کے بعد جب کالج یونیورسٹی ہو گیا اس وقت یونیورسٹی میں عربی اور فارسی کا پروفیسر مقرر ہوا زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ترک موالات کے سلسلہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے اصرار سے میں اس میں چلا آیا اور تاریخ اسلام کا مضمون میرے سپرد ہوا۔ یہی سلسلہ آج تک چلا جاتا ہے۔

تصنیف ۔ لکھنے کا مجھے بچپن سے شوق ہے۔ جب میری عمر بارہ سال کی تھی اس وقت فارسی قواعد میں ایک مختصر رسالہ فارسی زبان میں "قواعد اسلیہ" کے نام سے لکھ کر بھوپال کے مطبع سے شائع کرایا تھا۔ لیکن میری تصنیفی زندگی دراصل علی گڑھ کالج سے شروع ہوئی۔ سب سے پہلے وہاں میں نے ۱۳۲۵ھ میں تاریخ القرآن لکھی جو اسلامیہ ہائی سکول اٹاوہ نیز علی گڑھ کالج میں دینیات کے نصاب میں داخل کی گئی اور عرصہ تک رہی۔

۱۹۰۸ء خواجہ حافظ شیرازی کی لائف "حیات حافظ" لکھ کر علیگڑھ کالج سے شائع کی۔ یہ کتاب اس وقت بہت مقبول ہوئی۔ چنانچہ متحدہ آگرہ و اودھ کی ایڈمنسٹریشن رپورٹ ۱۹۰۸ء-۱۹۰۹ء میں اس سال کی جملہ اردو میں

شائع شدہ کتابوں میں چوٹی کی کتاب تسلیم کی گئی ہے۔ اس کے دوسرے سال "حیاتِ جامی" لکھی جو اس سے بھی زیادہ مقبول ہوئی۔

فرائض جنفی یعنی فنِ وراثت میں مجھے بعض بنیادی غلطیاں نظر آئیں۔ میں نے اچھی طرح تحقیق کی۔ بالآخر غور و خوض کے بعد اس کی تمام اصولی غلطیاں میرے سامنے نمایاں ہوگئیں۔ چنانچہ میں نے "الوراثۃ فی الاسلام" کے نام سے عربی زبان میں ایک کتاب لکھی جس کو ٹائپ میں چھپوا کر شائع کیا۔ اس میں وہ تمام باتیں دلائل کے ساتھ واضح کیں جو اس فن کی تدوین میں قرآن کے خلاف واقع ہوئی ہیں۔

علی گڑھ یونیورسٹی ہی میں میں نے تاریخ الامت لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا لیکن اس کی اشاعت اس وقت ہوئی جب میں جامعہ ملیہ میں آگیا۔ کئی سال میں اس کے سات حصے لکھے گئے۔ جس میں ابتدارِ اسلام سے مصطفےٰ کمال مرحوم کے الغارِ خلافت تک اسلام کی تاریخ آگئی۔ اس کی زبان سادہ رکھی اور طرزِ بیان آسان تاکہ ہر مسلمان طالب علم بلکہ ہر پڑھنے والا اس سے آسانی کے ساتھ فائدہ اٹھا سکے۔ چنانچہ بلا کسی کوشش اور سفارش کے مختلف حصے، مختلف یونیورسٹیوں، اسلامی کالجوں اور اسکولوں کے نصاب میں داخل ہوگئے۔ خاص کر اس کی پہلی جلد (سیرۃ الرسولؐ) بیشتر اسلامی سکولوں کے نصاب میں ہندوستان کے طول و عرض میں لے لی گئی۔ یہی کتاب ہے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ سے عام دلچسپی پیدا کرائی۔ بالخصوص مسلمان طلبار میں۔

دینیات کے نصاب کے لیۓ دو مختصر رسالے مسلمان طلبا کے لیۓ لکھے۔ ایک عقائد میں "عقائدِ اسلام" کے نام سے۔ دوسرا شریعت میں "ارکانِ اسلام"۔ ان کو ایسے آسان، جدید اور دلچسپ ڈھنگ سے لکھا کہ بہت مقبول ہوئے اور مختلف مقامات پر دینیات کے نصاب میں شامل کیے گئے۔

اسی طرح قومی، ملّی اور تاریخی نظمیں جو میں نے مختلف موقعوں پر لکھی تھیں ان میں سے دس نظموں کا مجموعہ "جواہرِ ملیہ" کے نام سے جامعہ ملیہ نے چھاپ کر اردو ادب کے نصابِ تعلیم میں داخل کیا۔

جب اہلِ نجد کا ۱۹۲۴ء میں ظہور اور غلبہ ہوا اور وہ حرم مکہ پر قابض ہوگئے اور شریف حسین کو وہاں سے نکالا اس وقت ان کی تاریخ کی ہندوستان کے ہر گوشہ سے مانگ ہوئی۔ میں نے لوگوں کے حسبِ طلب "تاریخِ نجد" لکھی۔ بہت سی غلط فہمیاں جو ہندوستان کے مسلمانوں میں نجدیوں کی بابت تھیں اس کتاب سے رفع ہوگئیں۔

اس سے پہلے فاتح مصر حضرت عمرو بن العاصؓ کی مفصل سیرت لکھی تھی۔ آخر میں تعلیماتِ قرآن لکھی جس میں اصول و عقائدِ اسلام کی خود اس کی آیات سے تفصیل کی اور یہ ثابت کر دیا کہ قرآنِ کریم اسلام کی مستقل اور مکمل

کتاب ہے اور وہ اپنی تفسیر آپ کرتا ہے ۔

علماءِ اہلحدیث

یُوں تو کون سا دن ناغہ جاتا تھا جس میں ہمارے یہاں کوئی مولوی یا عالم نہ آتا ہو مگر میں صرف انہی حضرات کا ذکر کرونگا جو علم و فضل میں نمایاں شہرت رکھتے تھے اور اپنے زمانہ میں ممتاز تھے ۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب

میں جب بھوپال میں آیا ہوں اس وقت نواب صاحب زندہ اور خطاب و سلامی کے انتزاع کے بعد سے ہمہ تن علمی اور دینی شغل میں مصروف تھے ۔ شہر میں ان کی بدولت علوم دینیہ بالخصوص حدیث کا بہت چرچہ تھا انہوں نے اندھوں کے لیئے وظائف مقرر کیئے تھے تاکہ قرآن اور ہو سکے تو حدیث بھی حفظ کریں ۔ چنانچہ اس زمانہ میں اکثر نابینا حافظ تھے ۔ یہاں تک کہ وہاں اندھوں کو بالعموم حافظ جی کہتے تھے اور بہت سے ایسے بھی تھے جنہوں نے قرآن کے ساتھ بلوغ المرام یا مشکوٰۃ بھی یاد کر رکھی تھی ۔

کتبِ حدیث مثلاً فتح الباری اور نیل الاوطار وغیرہ نیز اپنی تصنیفات کی اشاعت میں وہ بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے اور ان کو اکثر مفت تقسیم کراتے تھے ۔ انہوں نے اپنی جاگیر میں سے پانچ سو روپیہ ماہوار شاہجہان بیگم صاحبہ کے لئے بعوض زوجیت کے لیئے منظور کیئے تھے لیکن وہ اس کی محتاج نہ تھیں اس وجہ سے اس رقم کو کتاب و سُنّت کی اشاعت میں صرف کرتی تھیں اور اُن علماء کو وظائف دیتی تھیں جو اقطاع ہند میں جابجا حدیث پڑھاتے یا مقلّدوں سے مناظرے کرتے تھے ۔ یہ سلسلہ نواب صاحب کے انتقال کے بعد بھی ۱۹۱۹ء تک جاری رہا جب تک کہ بیگم صاحبہ زندہ رہیں ۔ اس کے علاوہ بھی بیگم صاحبہ نے اپنی فیاضی سے علماء کی تنخواہیں اور طلباء کے لیئے مختلف قسم کے وظائف اور گزارے مقرر کر رکھے تھے ۔ جن کی بدولت لوگ فارغ البالی کے ساتھ پڑھتے پڑھاتے تھے ۔

سنہ ۱۳۰۶ھ میں بقرعید کے دن جب والد صاحب نواب صاحب سے ملنے گئے میں بھی ساتھ تھا ۔ تاج محل کے صدر دروازہ کے اُوپر والے کمرے میں بیٹھے تھے ۔ ان سے زیادہ حسین بڈھا آج تک میری آنکھوں نے نہیں دیکھا ۔ کبھی میں اُن کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی باہر دروازہ کے سامنے جہاں اونٹ نحر کیئے جا رہے تھے اور جو میرے لیئے ایک نیا اور دلچسپ نظارہ تھا ۔ انہوں نے ایک رکوع مجھ سے پڑھوایا اور سُنکر خوش ہوئے ۔

واپسی میں میں نے والد سے کہا کہ نواب صاحب تو مرد ہیں پھر گلے میں موتیوں کی مالا کیوں پہن رکھی ہے۔ کہنے لگے کہ مالا نہیں ہے بلکہ تسبیح ہے۔ میں نے کہا تو کیا یہ اہل حدیث کے نزدیک بدعت نہیں ہے؟ بولے کہ کیوں نہیں، مگر انہوں نے عید کی وجہ سے گلے میں ڈال لی ہو گی پڑھنے کے لیئے نہیں۔

دوسرے سال رجب میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مولوی ذوالفقار احمد صاحب تصنیف کے صیغہ میں نواب صاحب کے رفیق تھے۔ قد چھوٹا اور رنگ سانولا تھا۔ مگر نیکی اور خوش خلقی کا مجسمہ تھے۔ عربی جس قدر پختہ لکھتے تھا اردو اسی قدر خام۔ والد کے ساتھ مخلصانہ محبت رکھتے تھے اور کبھی کبھی ملنے کے لیئے آتے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں میں بھوپال گیا تھا تو زندہ تھے۔ مجھے دیکھکر والد کو یاد کر کے بہت روئے۔ زہد و عبادت کے علاوہ ان میں تواضع کی صفت ایسی تھی جو ہر انسان پر اثر ڈالتی تھی۔

شیخ حسین عرب یمنی انصاری۔ حدیث کے مسلم اُستاد۔ نواب صدیق حسن خاں نے بھی انہیں سے حدیث پڑھی تھی۔ اُن کا مشغلہ رات دن حدیث تھا۔ پڑھنا اور پڑھانا۔ کوئی حدیث ایسی نہ تھی جس کو یہ نہ جانتے ہوں یا اُس کے طریق روایت سے واقف نہ ہوں۔ کُتبِ حدیث کا بڑا ذخیرہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ اُن کا مکان ہم سے قریب تھا۔ اکثر آتے رہتے تھے۔ نہایت بے تکلف، مخلص اور زندہ دل۔ ان کو معلوم تھا کہ نیچے کا مکان مردانہ ہے مگر جب آتے تو اسلامی دستور کے مطابق اجازت کے لیئے کُنڈی کھٹکھٹاتے میں پوچھتا کون؟ کہتے بدو۔ فوراً لپک کر استقبال کیلئے بڑھتا اور سلام کرتا جواب میں فرماتے أسلم سالمہ اللہ ان کا لباس اور انکی گفتگو سب عربی تھی۔ مدتہائے دراز تک بھوپال میں رہنے کے بعد بھی اُردو کم سیکھی تھی۔ اس کو بھی عربی لہجے میں بولتے تھے۔

لطیفہ:۔ ایک دفعہ دہلی سے میاں صاحب کے پوتے مولوی عبدالسلام صاحب بھوپال میں آئے تھے والد نے شام کے وقت مجھ سے کہا کہ جاکر شیخ صاحب کے یہاں سے اُن کو ساتھ لاؤ۔ میں گیا دیکھا کہ شیخ صاحب اکیلے اپنی بیٹھک میں ہیں۔ پوچھا کہ مولوی عبدالسلام کہاں ہیں؟ بولے فل فر۔ میں نہیں سمجھ سکا۔ پھر کہا فل فر اب بھی سمجھ میں نہ آیا۔ پھر انہوں نے اسی کو دہرایا۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ باللہ یاشیخ قل بالعربیہ بولے علی الجسر (پل پر) یہ سُن کر میں ہنستا ہوا پل کی طرف گیا جو اُن کے مکان سے ایک فرلانگ سے زیادہ دُور نہیں ہے اور جہاں مخلوق کھڑی ہوئی تال کے سیلاب کا تماشہ دیکھ رہی تھی۔ مولوی صاحب وہاں ملے۔ اُن کو

یہ لطیفہ سُنایا اور اپنے ساتھ لایا۔

ایک بار والد کی آنت میں تکلیف لاحق ہو۔ ایک حکیم صاحب نے جو ہمارے گھر کے معالج تھے منضج پلایا۔ پھر اطریفل کا بڑا مسہل دیا لیکن کوئی اجابت نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ یکے بعد دیگرے تین مسہل دیئے اور سب ہضم ہوگئے۔ گرمی کی وجہ سے دماغ بے چین رہنے لگا اور نیند نہیں آتی تھی۔ تین ہفتوں سے زیادہ اسی حالت میں گزر گئے۔ پلنگ پر پڑے پڑے پشت اور پہلو کی کھال اُدھڑنے لگی آنکھیں حلقوں میں گھس گئیں اور غذا نہ ہونے کی وجہ سے سخت کمزوری آگئی۔ ایک دن صبح کو شیخ صاحب آئے۔ والد کے پاس جاکر انکی حالت دیکھی تو پلنگ کے پاس بیٹھ گئے اور اپنا سر انکی بغل میں ڈال کر رونے لگے والد کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہوگئے یہ دیکھ کر میرا دل بھر آیا اور میں اپنے کمرہ میں آگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد گیا۔ شیخ صاحب نے پوچھا دوا پلائی ہے؟ میں نے کہا کہ ابھی نہیں اور میرا تو خیال یہ ہے کہ حکیم کی دوا سے کوئی فائدہ نظر نہیں آتا ڈاکٹر کا علاج ہونا چاہیے۔ شیخ صاحب نے کہا بیشک علاج بدلنا چاہیئے۔ والد بھی انکے کہنے سے راضی ہوگئے ورنہ وہ ڈاکٹری علاج کو پسند نہیں کرتے تھے۔

میں اسی وقت ڈاکٹر ولی محمد کے پاس گیا جو سلطان جہاں بیگم ولی عہد کے معالج تھے جن کا محل ہم سے بہت قریب تھا ڈاکٹر صاحب فوراً آگئے۔ اُنہوں نے اچھی طرح دیکھا پھر مجھے ساتھ لیکر چلے۔ راستہ میں کہنے لگے جب حکیم نے مار ڈالا اس وقت مجھے اطلاع دی۔ منضج پر منضج مسہل پر مسہل اور بیماری کی خبر ہی نہیں۔ میں نے پوچھا کیا بیماری ہے۔ کہنے لگے کہ آنت میں عقدہ ہے جب تک وہ نہیں ٹوٹے گا کچھ معدہ سے خارج نہ ہوسکے گا۔ انہوں نے پارے کا مرہم دیا کہ اس کو شکم پر ملو۔ اور بلاڈونا کہ اس کو پانی میں اُبال کر فلالین کے ٹکڑوں کو تر کرکے سنکائی کرو۔ یہی میں نے کیا۔ گھنٹہ بھر کے بعد چھی لگائی گئی۔ معدہ بالکل صاف ہوگیا اور مرض جاتا رہا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ شفاء عاجل شیخ صاحب کی مخلصانہ دعا کا نتیجہ ہے۔

بیگم صاحبہ جب مرض الموت میں گرفتار ہوئیں تو اُن کی شفا کے لئے شیخ صاحب نے بخاری کا ختم تجویز کیا جو انہیں کے مکان پر شروع کیا گیا۔ ہر مہینہ ختم خوانوں کے لئے جو روپیہ آتا اس میں سے والد کا حصہ جو منتظمین میں سے تھے میں جاکر لاتا تھا۔ اچھی خاصی رقم مل جاتی تھی۔ عام اہلحدیث کی طرح میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ یہ مال طیب اور حلال ہے۔

بیگم صاحبہ کی علالت نے زیادہ طول کھینچا اور اس ختم کا سلسلہ تقریباً سال بھر جاری رہا۔ پڑھنے والے بہت خوش تھے۔ اس تمام مدت میں صرف ایک دن میں نے انکو افسردہ خاطر دیکھا جس دن کہ انہوں نے یہ سُنا تھا کہ فلاں پیر صاحب کی بیگم نے بیس ہزار روپے بھیجے ہیں۔

شیخ صاحب کے چھ بیٹے تھے۔ سب سے بڑے شیخ محمد عرب تھے جو والد کے خاص انیس و جلیس تھے وہ رات دن کے ۲۴ گھنٹوں میں سے کم سے کم چھ گھنٹے روزانہ والد ہی کے پاس گزارتے تھے۔ آخر میں دارالعلوم ندوہ میں ادیب ہوکر چلے گئے تھے۔

ہمارا جو تعلق اس خاندان سے تھا بحمد للہ کہ اب تک باقی ہے اور شیخ محمد کے بیٹے شیخ خلیل عرب جو لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں مجھے اسی قدر عزیز ہیں جس قدر اُنکے والد میرے والد کو عزیز تھے۔

مولوی محمد بشیر صاحب سہسوانی

علم و فضل میں وحید عصر تھے۔ والد فرمایا کرتے تھے کہ مولوی محمد بشیر صاحب کی قوتِ مطالعہ بے مثل ہے، عبارات و اشارات کا صحیح مفہوم سمجھنے والا اُن سے بہتر میں نے کسی کو نہیں پایا۔" نواب صدیق حسن خاں مدرسہ سلیمانیہ کی مہتمی سے جب میر دبیر کے عہدے پر گئے تو ان کی جگہ یہ مہتمم مدارس ہوئے مگر ان کو انتظامی امور سے دلچسپی نہ تھی اس لئے شاہجہاں بیگم نے جو بڑی مردم شناس تھیں ان کی تنخواہ مناصب میں منتقل کر دی۔ اور خدمات مہتمی والد کے سپرد کر کے ان کو سبکدوش کر دیا۔ ہر دوشنبہ کو تاج محل میں بلا کر ان کا وعظ سنا کرتی تھیں۔ مناظرہ میں بے نظیر تھے۔ حج کے لئے گئے وہاں شیخ دحلان سے مقابلہ ہوا۔ اس کے رد میں صیانۃ لہ الانسان ایسی کتاب لکھی کہ وہ جواب نہ دے سکا۔ عربی نہایت عمدہ لکھتے تھے۔ ایک بار میرے ساتھیوں میں سے ایک شخص ان کے یہاں سے میر زاہد رسالہ عاریۃً پڑھنے کے لئے لائے۔ اس میں مولانا عبدالحی لکھنوی کا ایک خط ملا جو ان کے نام تھا۔ باوجود اس کے کہ اس وقت مولانا عبدالحی ان کے ساتھ اس مسئلہ کے خلاف رسالہ بازی کر رہے تھے کہ حج میں مدینہ کی زیارت لازم نہیں ہے پھر بھی اس طرح ان کو خطاب کیا تھا جیسے کوئی شاگرد اپنے اُستاد کو لکھتا ہے اور ان کی عربیت کی فوقیت کو تسلیم کیا تھا۔

مرزا غلام احمد قادیانی جب دہلی میں میاں صاحب سے بحث کرنے آئے تھے اس وقت ان کے مشورہ سے یہی مقابلہ کے لئے بھوپال سے بلائے گئے تھے۔ ان کی تقریر جذبات سے خالی اور دلائل سے لبریز ہوتی تھی۔ ہمارے محل کے سامنے ہیرا مسجد ہے اس میں ہر جمعہ کو وعظ فرماتے تھے۔ کبھی کبھی میں بھی سننے کو چلا جاتا تھا۔ سامعین کی تعداد تھوڑی ہوتی تھی۔ وعظ کیا کرتے تھے اچھا خاصا سبق پڑھاتے تھے۔

یہ ہم سے فاصلے پر رہتے تھے لیکن تاہم مہینے میں ایک دو بار ضرور والد کے پاس آتے تھے میں اُن کی بڑی تکریم کرتا تھا اور مجھ پر شفقت بھی بہت فرماتے تھے۔ تقویٰ اور عبادت میں ان کا درجہ بلند تھا مگر دنیا میں رہنے کا ڈھنگ نہیں جانتے تھے۔ کبھی کبھی بے تدبیر مصاحبوں کے اغوا سے بے قرینہ

لہ ادھر چند سال ہوئے سید رشید رضا مرحوم نے اس کتاب کو اپنے مقدمہ کے ساتھ مصر سے شائع کیا۔

شادیاں کر بیٹھتے تھے جو نہ صرف ان کے لئے بلکہ ان کے خیر خواہوں کے لئے بھی پریشانی کا موجب ہوتی تھیں۔ اکثر والد کو یہ جھگڑے سلجھانے پڑتے تھے۔

ان کی بیٹی کو بیاہنے کے لئے سہسوان کے ایک معزز اور دولتمند رئیس آئے۔ جماعت اہل حدیث میں اس کی شادی کی بڑی دھوم تھی۔ میں بھی والد کے ساتھ مدار المہام صاحب کی مسجد میں گیا۔ جہاں نکاح تھا مجھے تعجب ہوا کہ مہر پچاس ہزار اشرفی مقرر کیا گیا۔

واپسی میں جب ہم سوار ہوئے تو میں نے والد سے کہا کہ اس قدر مہر تو سنّت کے خلاف ہے ہماری مسجد کے موذن حاجی نعمت اللہ پرتاب گڈھی بھی ساتھ تھے جنہوں نے اجودھیا کے جہاد میں مولوی امیر علی کا ساتھ دیا تھا۔ متقی۔ مجاہد اور سوائے اللہ کے کسی سے نہ ڈرنے والے۔ میری بات سن کر بولے کہ "مولویوں کا حال مجھ سے سنو۔ یہی مولوی محمد بشیر اور قاضی شیخ محمد اور فلاں و فلاں ہماری مسجد میں ایک دن بیٹھے ہوئے گفتگو کر رہے تھے مسئلہ یہ طے ہوا کہ خانہ خدا میں سوائے اللہ کے کسی کی تعظیم کے لئے کھڑا ہونا جائز نہیں ہے۔ اسی درمیان میں نواب صدیق حسن خاں آگئے جو اس وقت شیش محل میں رہتے تھے اور جماعت اسی مسجد میں پڑھتے تھے۔ یہ سارے مولوی ان کی تعظیم کیلئے کھڑے ہوگئے تھے۔ صرف میں بیٹھا ہوا تھا اور ہنس رہا تھا۔ نواب صاحب نے پوچھا کہ کیا بات ہے میں نے سارا قصہ سنایا۔ وہ بھی ہنس پڑے۔ یہ مولوی ہم کو تو حدیث سناتے ہیں کہ جس عورت کا مہر کم ہو وہ برکت والی ہوتی ہے اور خود اپنی بیٹیوں کا مہر بندھواتے ہیں پچاس ہزار دینار سرخ۔

ایک بار رمضان میں ایک شاہ صاحب جو کمبل پوش کے لقب سے مشہور تھے۔ بھوپال میں آکر مولوی صاحب کے یہاں ٹھہرے، وہ صاحب علم تو نہ تھے مگر خوش بیان واعظ تھے۔ اُن کی باتوں میں آکر مولوی صاحب اُن کے مرید ہو گئے یہاں تک کہ اُن کے ہاتھ پر بیعت بھی کرلی۔ والد کو یہ بات بہت ناگوار گزری، جاکر اُن کو سمجھایا کہ جس چیز کو ہم مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں اس کو جب ہماری ہی جماعت کے علماء خود اختیار کریں گے تو کامیابی کیونکر ہو گی۔ انہوں نے نہیں سُنا۔ بلکہ آخر رمضان میں ایک اشتہار شائع کیا کہ اب کے شاہ کمبل پوش کی معیت میں دعا و عبادت و ذکر و شغل میں وہ لطف آیا جو اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ والد نے تمام جماعتِ اہل حدیث کو بلاکر کہدیا کہ جب تک مولوی صاحب اس بیعت سے رجوع نہ کریں اس وقت تک ان کے ساتھ سلام و کلام ترک کردو۔

اتفاق ایسا ہوا کہ عید کے بعد کمبل پوش ایک حسین لڑکے کو لے کر بھاگ گئے اب مولوی صاحب کو فسخ بیعت کا اعلان کرنا پڑا والد نے سنا تو فوراً مجھے بیجا کران کو معان کے حواریوں کے آج کی دعوت دے آؤ۔ دوسرے دن انہوں نے ہم کو بلایا مگر ان دونوں موقعوں پر نہ شاہ صاحب کا ذکر درمیان میں آیا نہ بیعت اور فسخ بیعت کا۔ میں سمجھ گیا کہ جو بات فیما بین ملال کا موجب ہوئی تھی اس کے ذکر کو بھی یہ حضرات جفا خیاں کرتے ہیں۔

یہ لڑکا میرے پاس بھی آیا کرتا تھا سپاہی زادہ تھا اور بے علم مگر نہایت شائستہ اور جامہ زیب شکل کے لحاظ سے زیادہ خوبصورت نہ تھا لیکن نقاشِ قدرت نے ندرت کاری سے اس کی ہلالی پیشانی کے نیچے نسوانی آنکھیں لگادی تھیں جن میں طلسمات کے کارخانے تھے اور جادو ڈھلتا تھا اسی سحر بابل میں کمبل پوش گرفتار ہوگیا۔

ایک مدت کے بعد جبکہ میں علی گڑھ کالج میں پروفیسر تھا کمبل پوش ایک دن مولانا عبداللہ صاحب ناظم دینیات کے حجرہ میں نظر آئے۔ مجھ کو پہچان لیا، اٹھ کر بغلگیر ہوئے۔ میں نے ٹھہرانا چاہا، کہنے لگے کہ مجھے ابھی حیدر آباد سندھ کو روانہ ہونا ہے۔ وہاں کے ایک دولت مند زرگر نے بلایا ہے، جس کے نوجوان بیٹے کے سر پر جن آتا ہے۔ اس کا تار بھی مجھ کو دکھایا۔ میں نے دل میں کہا سبحان اللہ۔

مَا اَشْبَہَ اللَّیْلَۃَ بِالْبَارِحَۃِ

مولوی محمد بشیر صاحب نے اپنے مکان پر مقارنہ کی بنیاد ڈالی یعنی حفاظ اور قراء کا اجتماع کر کے ایک ایک رکوع پڑھواتے۔ اس زمانہ میں شہر بھوپال میں قرآن خوانی کا بڑا چرچا تھا۔ اس کے ۴۴ ہزار باشندوں میں سے جن میں ہر قوم و ملت کے لوگ شامل تھے کم و بیش چھ ہزار مسلمان زن و مرد حافظ شمار کئے گئے تھے، بہت سے پورے گھر کے گھر حافظ تھے۔ اصولِ تجوید کے مطابق پڑھنے والے اچھے اچھے قاری بھی تھے، مثلاً قاری سلیمان۔ قاری عبدالہادی وغیرہ جو دور دور تک مشہور تھے اس محفل میں عوام کے علاوہ اُمراء رؤساء بھی شریک ہونے لگے۔ ایک بار ملک شام کے ایک نامور قاری آئے ہوئے تھے۔ اس وقت جلسہ کے لئے پری گھاٹ میں ایک جاگیردار کا بڑا محل خالی کرایا گیا تھا شامی صاحب کی عمر تقریباً ساٹھ سال تھی مگر جوانوں سے زیادہ تولانا و تندرست تھے اور رنگ سرخ و سفید کلیجے کے زور پر پڑھتے تھے۔ سورۂ یٰسین شروع کی نصف تک پہنچتے پہنچتے ایسا معلوم ہونے لگا

کہ اب ان کا جگر شق ہو جائے گا یا چہرہ سے خون چھلکنے لگے گا۔ بارے وہیں ختم کر دیا۔ مجھے یہ ناگوار قرأت سُن کر سخت کوفت ہوئی۔

بالآخر ایک دن والد نے مولوی صاحب کو سمجھایا کہ اکثر مذہبی رسمیں شروع شروع میں معصوم نظر آتی ہیں مگر جب جڑ پکڑ لیتی ہیں تو پھر ان کا مٹانا محال ہو جاتا ہے۔ مقارنہ میں بھی مولود کی طرح عالمگیر ہو جانے کی صلاحیت ہے، لہٰذا ابھی سے اس کو روکنا مناسب ہے۔ مولوی صاحب نے اُن کی بات مان لی اور پھر اس کی محفل نہیں منعقد کی۔

مولوی محمد احسن صاحب امروہوی

بھوپال میں محکمۂ مصارف کے بخشی تھے جو بالکل ہمارے محل سے متصل تھا۔ کبھی کبھی شام کو جب وہ اپنی کچہری سے نکلتے اور میں باہر ہوتا تو ان کو سلام کرتا۔ وہ صرف جواب دینے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ قریب آکر گھر بھر کی خیریت پوچھتے۔ کبھی میری پڑھائی لکھائی کا حال دریافت کرتے۔ کبھی کوئی مختصر قصہ یا نصیحت سناتے۔ ان کی صورت سے نیکی ٹپکتی تھی۔ بڑے مناظر مشہور تھے۔

جب اُن کے قادیانی ہو جانے کی خبر پھیلی اس زمانہ میں ایک دن والد کے پاس مدرسہ سلیمانیہ میں کسی کام سے آئے۔ وہاں کئی مولوی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک نے سوال کیا کہ آپ نے کس دلیل سے مرزا کو مسیح موعود مانا۔ مولوی صاحب جلدی یا گھبراہٹ میں بے سوچے بول اُٹھے کہ ایک میں کیا ہزاروں ہیں جو اُن کو ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا کہ اگر یہی دلیل ہے تو حضرت عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے سے آپ کیوں انکار کرتے ہیں کیونکہ کروڑوں ہیں جو اُن کو ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ مولوی صاحب ایسے شکنجے میں پھنس گئے کہ کچھ بس نہ چلا۔ جھنجھلاتے۔ چہرہ سُرخ ہو گیا۔ گردن کی رگیں پھول آئیں۔ والد نے یہ کیفیت دیکھی تو فوراً بحث کو روک دیا۔ مجھے مولوی صاحب کی حالت پر اس وقت بڑا ترس آیا۔

مولوی ابراھیم صاحب آروی

آرہ کے رئیس تھے اور علماء اہل حدیث میں ممتاز علم کے لحاظ سے بھی اور جسم کے لحاظ سے بھی۔ غالباً ۱۳۱۰ھ میں رمضان کے مہینہ میں بھوپال تشریف لائے تھے۔ حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری بھی ساتھ تھے۔ یہ دونوں حضرات جماعت اہل حدیث کے شمس و قمر خیال کئے جاتے تھے۔ ہمارے اور مولوی محمد بشیر صاحب کے مکان کے وسط میں ریتی گھاٹ پر شیخ حسین صاحب عرب کی مسجد میں عشرۂ اخیرہ میں

تہجد باجماعت کا بندوبست کیا گیا۔ تاکہ سب وہاں جمع ہوسکیں، اکثر علماء وطلباء آکر شریک ہوتے تھے ایک رات میں بھی والد کے ساتھ گیا۔ حافظ عبداللہ صاحب پیش نماز تھے۔ ہر ہر رکوع میں ایک ایک دو دو لقمے لیتے تھے۔ گھر آکر میں نے والد سے کہا کہ حافظ صاحب اتنے بڑے عالم ہوکر اس قدر بھولتے کیوں ہیں۔ کہنے لگے کہ ان کی توجہ الفاظ سے زیادہ معانی کی طرف رہتی ہے۔

مولانا ابراہیم صاحب کا وعظ ہندوستان بھر میں مشہور تھا۔ جمعہ کے دن جامع مسجد میں ان کے وعظ کا اعلان کرایا گیا۔ ہم سب لوگ معہ مولانائے موصوف کے اپنی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھ کر جامع مسجد گئے۔ بے اندازہ مجمع تھا۔ وسطِ مسجد میں کھڑے ہوکر وعظ فرمایا۔ چونکہ شکل وصورت میں والد سے مشابہ تھے اسی لئے شہر میں یہی مشہور ہوا کہ مولانا کے بڑے بھائی کا وعظ تھا۔

حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری

مشرقی ہند میں حدیث میں امام اور جملہ علوم متداولہ میں کامل تسلیم کئے جاتے تھے۔ بھوپال میں کئی بار تشریف لائے۔ والد جب وطن جاتے تو وہ ملاقات کے لئے غازی پور سے دو ایک روز کے لئے جیراجپور ضرور آتے۔ ان کی سادگی، کم سخنی، نرم زبانی اور اذان سننے کے بعد ہی مسجد میں آنے کی پابندی کی باتیں مجھے یاد ہیں۔ آخری بار علی گڑھ میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت عربی مدارس اور ان کے نصاب سے بہت مایوس نظر آئے۔

مولوی عبدالوہاب صاحب بہاری

علوم عقلیہ کے مسلّم اُستاد اور میدانِ مناظرہ کے شہسوار تھے۔ ان کی طبیعت ادیبانہ تھی، اور مزاج میں ظرافت، اس وجہ سے کبھی بحث میں ان کو غصہ نہیں آتا تھا۔ مجھ کو دیگر علماء حدیث کی بہ نسبت اُن سے زیادہ دلچسپی ہوئی۔ نہایت خوش گپ تھے اور اپنے سامنے کسی کو بولنے نہیں دیتے تھے۔ کسی بات پر کوئی ٹوک دیتا تو پوری منطق مقابلہ میں صرف کرتے اور آخر منوا کر چھوڑتے پھر بھی دلیلوں کا سلسلہ نہیں ٹوٹتا تھا۔ سانڈے کی حلت کے قائل تھے۔ انہیں کے طلباء میں سے توقیر الحسن ہم کو ملے۔

قاضی شیخ محمد صاحب جعفری

مچھلی شہر ضلع جونپور کے بڑے نامی خاندان سے تھے جس میں علم موروثی تھا۔ کسی زمانہ میں بھوپال میں قاضی

تھے اور اسی محل میں رہتے تھے جن میں ہماری سکونت تھی۔ انہیں کے نام سے ہماری مسجد قاضی جی کی مسجد بولی جاتی تھی۔ تقوے میں بزرگان سلف کا نمونہ سمجھے جاتے تھے۔ بڑھاپا اس پر عوارض کی کثرت۔ پھر غذا برائے نام رہ گئی تھی مگر کیا ممکن جو جماعت ترک ہو جائے۔ ایک بار سخت نقاہت تھی میرا سہارا لے کر اٹھے، صحنِ مسجد میں پہنچ کر بدن کانپنے لگا۔ آگے بڑھنے کی طاقت نہ دیکھی بیٹھ گئے اور وہیں سے امام کے پیچھے نیت باندھ لی۔

پہلی بار جب یہ والد کے پاس ٹھہرے تھے۔ اس وقت ہم وطن میں تھے۔ جس روز آئے تو والد نے صبح کو ہم سے کہا کہ قاضی صاحب اوپر کے کمرے میں ہیں۔ وہ ابھی یہاں آئیں گے تم لوگ خاموش رہنا اور سوائے سلام کے کچھ نہ بولنا۔ میں ان سے حدیث مسلسل بالاولیہ کی فرمائش کروں گا وہ تم کو سنا دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جن جن طلباء نے سنا تھا سب کو انہوں نے سندیں دیں مگر مجھ کو نہیں دی۔ اور فرمایا کہ تمہارا پائجامہ شرعی حد سے زیادہ نیچا ہے۔

اس زمانہ میں ایک طالب علم میرے ضلع کا ابراہیم پورہ کی مسجد میں رہا کرتا تھا۔ جو بارہ سال تک طالب العلمی کرنے کے بعد بھی صرف میر اور نحو میر ختم نہیں کر سکا تھا۔ میں نے اس کو بیکار دیکھ کر خدمت کے لئے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ وہ بھی ایک دن خوش خوش آیا۔ اور کہنے لگا کہ قاضی صاحب نے مجھ کو مسلسل بالاولیہ کی دے دی۔ میں نے ہنس کر کہا کہ تجھ کو سند نہیں ملی ہے بلکہ تیرے پائجامہ کو ملی ہے۔

حدیث و رجالِ حدیث کے متعلق ان کا علم بہت وسیع تھا۔ ہم لوگ جب کبھی ان کے پاس بیٹھتے سوائے حدثنا و اخبرنا کے کوئی دنیاوی بات کم کرتے تھے۔

مولوی محمد سعید صاحب بنارسی یہ اپنی ذات سے مسلمان ہوئے تھے اور دینی علوم سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ بنارس محلہ مدنپورہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ حدیث پڑھاتے بھی تھے۔ اور اس کی اشاعت بھی کرتے تھے۔ میں نے ایسا پرہیزگار مولوی کم دیکھا۔ صورت بھی فرشتوں کی اور سیرت بھی فرشتوں کی۔ جب یہ بھوپال آتے تھے تو میرا دل بہت خوش ہوتا تھا۔ میں لڑکپن سے ہر

سلہ اس میں شرط یہ تھی کہ پہلی گفتگو یہی حدیث ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قاضی صاحب تک بسلسلہ اسناد اسی صورت میں پہنچتی تھی۔ اوّل ما قال الخ

دوسرے سال اپنی خالہ کو دیکھنے کے لئے بنارس جایا کرتا ہوں، جب تک مولوی صاحب زندہ رہے انکی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔ وہ کوئی عذر قبول نہیں کرتے تھے اور بلا دعوت کھلائے راضی نہیں ہوتے تھے۔ ان کے کئی بیٹے اہل علم و فضل ہیں جن میں سے مولوی ابوالقاسم صاحب سیف اہل حدیث میں نمایاں شہرت رکھتے ہیں۔

مولوی محمد علی صاحب

موضع اعظم گڑھ کے رہنے والے ذی لیاقت اور زبردست مناظر تھے شوق نیموی کے نہایت عمدہ جوابات لکھے اور متعدد مقلد مولویوں کے مقابلے کئے۔ دبلے، سیاہ فام مگر ذہانت کے پتلے۔ تقریر بھی چست تھی اور تحریر بھی۔ کبھی کبھی بھوپال آیا کرتے تھے ایک بار اُن کو بارہ سو روپے ملے۔ لاکر صندوق میں رکھا ان کا پلنگ میرے کمرے کے متصل برآمدے میں تھا جس کے سامنے ایک چھوٹا سا حجرہ تھا اس میں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تپائیاں تھیں جن پر کتابیں اور کپڑے رکھے ہوئے تھے بیچ میں ایک چھینکا لٹکا ہوا تھا جس میں گھی کی ہانڈی تھی۔ مولوی صاحب نے حفاظت کی غرض سے اپنا صندوق اسی حجرہ میں تپائی پر لیجا کر رکھا اور اس کا دروازہ مقفل کر دیا۔ اتفاقات کو چھینکے کی بوسیدہ رسّی ٹوٹ گئی اور ہانڈی نیچے گری۔ مولوی صاحب اسکی آواز سے چونک پڑے۔ فوراً جاکر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ میں نے بھی لالٹین جلائی۔ وہاں گیا دیکھا صندوق کو پکڑے ہوئے تپائی پر بیٹھے ہیں اور دونوں پاؤں گھی میں بھرے ہوئے ہیں والد بھی جاگ اٹھے تھے مجھے بلا کر پوچھا کہ کیا ہوا۔ میں نے کہا کہ گھی کی ہانڈی گر پڑی ہے کہنے لگے کوئی چیز خراب تو نہیں ہوئی۔ میں نے کہا نہیں بجز مولوی صاحب کے پاؤں کے۔ والد یہ سنکر ہنس پڑے۔

مولوی صاحب موصوف نے اچھی عمر پاکر چند سال ہوئے انتقال فرمایا۔

مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی

انکا خطاب شمس العلماء تھا جو صرف معنی بلکہ صورت کے لحاظ سے بھی اُن کے واسطے موزوں تھا۔ پنجاب کے اکثر مناظرے انہوں نے جیتے مولانا ابوالوفا ثناء اللہ سے پہلے شیر پنجاب انہیں کو سمجھنا چاہیئے۔ ایک ماہانہ رسالہ اشاعۃ السنہ نکالتے تھے۔ ان کی علمی قابلیت مسلّم تھی اور اہلحدیث میں خاص نظر سے دیکھے جاتے تھے سنہ ۱۹۰۹ء میں کسی ضرورت سے لاہور آئے تھے مجھکو دیکھنے کیلئے پیسہ اخبار کے دفتر میں تشریف لائے۔ اسوقت انکی شکل ایسی ہو گئی تھی کہ میں مشکل سے پہچان سکا۔

مولوی عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی

بھوپال میں کبھی تشریف نہیں لائے مگر مرشد آباد کے مناظرہ اور مولوی شبلی نعمانی کی سیرۃ النعمان کی تنقید حسن البیان نے انکو اہلحدیث میں بہت مقبول بنا دیا تھا۔ مجھے ان کو دیکھنے اور ان سے ملنے کی آرزو تھی جس زمانہ میں علی گڑھ میں تھا اس زمانہ میں وہاں آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس کے جلسہ میں تشریف لائے تھے۔ جاکر ملاقات کی اور کئی گھنٹے خدمت میں رہا۔ انکی متانت اور معقولیت دلکش تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ نہ صرف عالمانہ بلکہ مجاہدانہ صفات کے آدمی ہیں۔

یہ حضرات جن کا ذکر میں نے کیا اس زمانہ کے چوٹی کے علماء اہل حدیث تھے جو نہ صرف علمیت میں بلند پایہ تھے بلکہ دینداری، پرہیزگاری، اور اخلاص و ریاضت میں بھی ممتاز تھے۔ ان کی خوبیاں اس قدر نمایاں تھیں جن کو دیکھ کر لاکھوں مسلمانوں نے ان کا رنگ اختیار کر لیا۔ اور جماعت اہل حدیث کی علمی اور دینی ساکھ ہر جگہ قائم ہو گئی۔ ان کی کوششوں سے ہندوستان میں شرک و بدعت کا بہت کچھ ازالہ اور کتاب و سنت کا منارہ بلند ہوا متعصب مخالفوں کے مقابلوں میں انہوں نے جس صبر و ثبات سے کام لیا وہ نہ صرف قابل تحسین بلکہ ان کے ایمانوں کی پختگی کا نشان تھا۔ یہ بھی مانتا ہوں کہ اسی جماعت کی بدولت ہندوستان میں تقلید کا جمود ٹوٹا جس سے دماغوں میں روشنی اور وسعت پیدا ہوئی لیکن تصویر کا دوسرا رخ بھی جسے میں دیکھ رہا ہوں اگر بیان نہ کروں تو حقیقت پوشی کا مجرم ٹھہروں گا۔

کچھ اہلِ حدیث کی نسبت

ابتداء میں یہ جماعت اعلاء کلمۃ الحق کے جمہوری مقصد کو لے کر اٹھی تھی۔ اور اس نے اپنا کوئی امتیازی نشان قائم کر کے اپنے آپ کو ایک جداگانہ فرقہ بنانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن مولانا اسمٰعیل شہید علیہ الرحمہ کی کوششوں کی ناکامی کے بعد غیر شعوری طور پر اس کا رخ بدل گیا اور بجائے احیاءِ ملت کے صرف احیاء سنت مطمح نظر رہ گیا۔ جس کی وجہ سے اس کا تمام تر مقابلہ دوسرے اسلامی فرقوں کے ساتھ آ پڑا۔ اور یہ بھی ایک فرقہ بن کر رہ گئی جس کے تمام مقاصد جماعتی ہو گئے اور بجائے کفار اور دشمنانِ اسلام کے خود مسلمانوں بالخصوص مقلدوں کے ساتھ اس کو تعصب پیدا ہوا۔

چونکہ حدیث کی بنیاد پر یہ عقیدہ قائم کیا گیا کہ جو کوئی کسی مردہ سنت کو زندہ کرتا ہے اس کو سو ۱۰۰ شہیدوں کا ثواب ملتا ہے اس لئے اس جہاد اکبر یعنی احیائے سنت کے واسطے روایات میں حد سے زیادہ غلو ہو گیا۔ گوشوں گوشوں سے چھپی ہوئی حدیثیں علماء نے نکالنی شروع کیں اور ان ہی مخصوص سنتوں کے احیاء کو اپنا طرۂ امتیاز بنا لیا کسی نے سانڈے کی حلت کا فتویٰ دیا اور اس کی بحث شروع کر دی۔ کسی نے ایک ہی ہاتھ سے مصافحہ کو سنت بتایا اور اس پر رسالہ بازی کرنے لگا، کسی نے آخری ذی الحجہ تک قربانی کو سنت کہا اور اسی کی اشاعت میں لگ گیا اور کسی نے کہا کہ سر پر بالوں کا رکھنا سنت ہے۔ اور جو نہ رکھے اس کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ غرض ایک ایک مولوی ایک ایک سنت کے احیاء اور سو سو شہیدوں کا ثواب لینے کے پیچھے لگ گیا۔ غدر کے بعد سے آج تک امن کا ایک طویل زمانہ

ان کو نصیب ہوا جس میں اصلاح و ترقیٔ ملت کے بڑے بڑے کام ہو سکتے تھے مگر ان کی اس ہفتاد سالہ دینی بحثوں اور کوششوں پر اگر نظر ڈالی جائے تو وہ بیشتر شاعر کے اس قول کی مصداق ہیں

غنیمت ہے شبِ فرقت کی فرصت
رسالہ لکھیے تحقیقِ کمر میں

اس میں کچھ شک نہیں کہ محکومیت میں قومیں بیکار ہو کر بند پانی کی طرح سڑتی ہیں اور باہمی فرقہ بندیوں جھگڑوں سے اسی قسم کی فساد کی بو ان میں پیدا ہوئی ہے۔ مگر ایک اہم سبب اس کا قرآن سے غفلت بھی ہے۔ جو حدیثوں میں انہماک کی وجہ سے پیدا ہوا۔ یہ قرآن کو پڑھتے ضرور ہیں۔ اس میں غور بھی کرتے ہیں۔ اس کی تفسیریں بھی لکھتے ہیں۔ لیکن محض علمی حیثیت یا حدیثوں کی تائید کی غرض سے انہوں نے اصلِ دین روایات کو قرار دے رکھا ہے۔ جن کے اوپر ان کے تمام اعمال کا دارومدار ہے۔ ہر امر میں روایتی سند کے اس قدر خوگر ہو گئے ہیں کہ تمام تر اپنے آپ کو ماضی سے وابستہ کر لیا ہے۔ پھر آگے کیسے بڑھیں اور تقدم کی صلاحیت کہاں سے پیدا ہو۔ یہ تو صرف قرآن ہے جو زندہ ہے اور زندگی بخش ہے۔ اسی سے مسلمان اپنا مستقبل تعمیر کر سکتے ہیں وہ نورِ مبین ہے جو انسان کے دل و دماغ کو منور کر کے اس کی بصیرت کو حقائق کی گہرائیوں تک پہنچاتا اور وسعتِ نظر پیدا کرتا ہے۔ اگر اس کی تعلیمات کو خود اسی سے سمجھنے کی کوشش کی جائے اور روایات کے غلاف اسکے اوپر نہ چڑھائے جائیں تو اُمِ اسلامیہ میں جس قدر تفرقے اشخاص و روایات پرستی سے پیدا ہوئے ہیں سب کو مٹا کر ملت کو متحد کر سکتا ہے۔ اگر ہندوستان میں ایک جماعت ایسی نکل آئی جس نے اپنے علم و عمل کا مرکز اسی کتابِ کریم کو قرار دیا تو سمجھنا چاہیئے کہ یہاں غیر مقلدیت کی تحریک بار آور ہوئی۔

میں اس موقع پر ان نوجوان سعادتمند روحوں سے خطاب کرتا ہوں کہ جن کے اندر اُمت کا درد اور حق کی محبت ہے کہ اللہ کی اس کامل کتاب کی طرف رجوع کریں۔ جو ہر تاریکی کے لئے نور اور ہر دکھ کے لیے شفا ہے اور جس میں دین مکمل کر دیا گیا ہے۔ سب سے اہلحدیث تو۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو — جو روایات پہ قرآن کو فدا کرتے ہیں
راویوں پر انہیں ایمان ہے نبیوں کی طرح — جو کہ تقلید کو بھی شرک کہا کرتے ہیں

ان بزرگوں کا عقیدہ ہے کہ ناقص ہے کتاب
جس کی تکمیل حدیثوں سے کیا کرتے ہیں

علماء حنفیہ

مولوی عبدالحق صاحب

شہر بھوپال کے قاضی تھے اور علوم دینیہ و عقلیہ میں فاضل صوبۂ سرحد کے باشندے تھے اور ولایتیوں کے محلہ چھاؤنی میں رہتے تھے جہاں اب میوزیم ہے۔ محکمۂ قضا کا کام کم تھا اس وجہ سے زیادہ تدریس میں صرف وقت کرتے تھے اور اچھے مدرس مشہور تھے۔ ابتدائی کتابوں سے لے کر اوپر تک کی تمام کتابیں پڑھاتے تھے والد میں اور ان میں باہمی محبت ایسی تھی جیسی دو بھائیوں میں ہوتی ہے۔ ان کا دفتر ہمارے محل کے قریب تھا۔ اس وجہ سے کبھی کبھی ہمارے یہاں آجاتے تھے۔ ان کو عام طور پر طلباء اور بالخصوص میری جماعت سے بہت دلچسپی تھی جب آتے تو ہم سب ان کے ارد گرد بیٹھ جاتے اور کوئی نہ کوئی علمی بحث چھیڑ دیتے۔ وہ ہر بحث میں خوشی کے ساتھ حصہ لیتے اس لئے ان کی صحبت ہمارے لئے بہت پُرلطف ہوتی تھی۔ وہ مجھکو مولانا حافظ کہتے تھے اور یہ خطاب میں نے اُن سے حاصل کیا تھا۔ صورت یہ ہوئی کہ ایک بار وہ تشریف لائے۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک شخص مولوی فتح محمد بڑے صرفی تھے انہوں نے یہ بحث اٹھائی کہ صرفیوں نے ثلاثی مجرد کا آٹھواں باب ماضی مضموم العین اور مضارع مفتوح العین کیوں رکھا جبکہ ان کو ساری عربی زبان میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی سوائے "کادیکاد" معتل العین کے نہ مل سکا۔ مضارع کو تو ہم مان لیتے ہیں کہ مفتوح العین ہے مگر ماضی کو مضموم العین یقین کرنے کی کیا صورت ہے اس لئے کہ اس کے عین کلمہ کی کوئی بھی حرکت ہو تعلیل سے واو الف سے بدل جائے گا۔ قاضی صاحب نے کہا کہ تمہارا اعتراض درست ہے۔ اکثر علمائے صرف نے آٹھویں باب کو تسلیم نہیں کیا ہے اور کادیکاد کو سمع یسمع سے قرار دیا ہے۔ میں نے کہا کہ جناب آٹھواں باب قرآن میں مستعمل ہے اور اگرچہ صرفیوں کو اس کی کوئی مثال نہیں مل سکی لیکن میں نے تلاش کر لی ہے۔ قاضی صاحب نے پوچھا کہ کہاں؟ میں نے کہا سورۂ کہف کے پہلے رکوع میں ہے۔ "كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ" ماضی مضموم العین اور سورۂ نساء کے پہلے رکوع میں ہے۔ "وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا" مضارع مفتوح العین انہوں نے فوراً قرآن منگایا۔ جب دیکھ کر اچھی طرح اطمینان کر لیا تو بہت خوش ہوئے اور والد کے سامنے مجھ کو مولانا حافظ کا خطاب دیا۔

وہ کبھی کبھی والد کو اور مجھ کو اپنے یہاں مدعو کرتے ۔ عشاء کے بہت دیر بعد تک باتیں رہتیں ۔ اس قدر شگفتہ اور ہنس مکھ تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کا کوئی تردد ، فکر یا رنج کبھی ان کے پاس نہیں پھٹکتا ۔ ریاضت کا نور چہرے سے برستا تھا اور گفتگو سراسر علمی ہوتی تھی اور دل کش ۔ میں جب تک ان کی خدمت میں بیٹھتا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنت الفردوس میں ہوں ۔

ایک بار انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کا ذکر چھیڑا کہ اس کا ایک خلیفہ ڈاکٹر عبدالحکیم ہے جو الہام کا مدعی ہوا ہے مرزا نے تصدیق کی ہے کہ اس کا الہام صحیح ہوتا ہے ۔ اب ڈاکٹر کو الہام ہوا ہے کہ مرزا جھوٹا ہے ۔ یہ کہہ کر مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور فرمایا کہ اب بولو مرزا سچا ہے کہ جھوٹا ۔ میں نے کہا کہ یہ تو وہی ملا حسن کے قضیہ منطقیہ "کلامی ھذا کاذب" والی بحث ہے کہ اگر نسبت حکمیہ صحیح نہیں تو قائل کے کذب میں کیا شبہ ہے اور اگر صحیح ہے تو چونکہ محمول کاذب ہے ۔ اس لئے وہ صادق ہونے پر بھی کاذب ہی ہوگا ۔ یہ جواب سنکر بہت خوش ہوئے اور والد کی طرف آنکھوں سے اشارہ کرکے میرے انتقال ذہنی کی داد دی ۔ واپسی میں میں نے والد سے کہا کہ قاضی صاحب اگرچہ حنفی ہیں مگر امید ہے کہ جنتی ہوں گے ۔ وہ یہ سن کر مسکرائے ان کے مسکرانے کی وجہ یہ تھی کہ ہماری جماعت میں چند دنوں پہلے یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ فرقہ ناجیہ کون ہے جس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ہمارے قرآن کے سبق میں شیخ محمد عرب صاحب بھی والد کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ۔ کشاف کا ایک نکتہ تفسیری بہت پسند کیا گیا ۔

شیخ محمد نے فرط خوشی سے کہا کہ زمخشری اگرچہ معتزلی تھا لیکن امید ہے کہ اس کی بخشش ہوگی اس پر ہمارے ساتھیوں میں سے عبداللہ جُدلی جو کٹر اہلحدیث تھے بول اٹھے کہ فرقہ ناجیہ تو صرف اہل حدیث ہے اور "لا تزال طائفۃ من امتی یقاتلون علی الحق الخ" کی پیشگوئی انہیں کے لئے ہے ۔ اس بحث نے طول کھینچا آخر میں والد نے کہا کہ جنت کا وعدہ اللہ نے ایمان اور عمل صالح پر فرمایا ہے جس کے لئے کوئی فرقہ مخصوص نہیں ۔ میری سمجھ میں یہ بات آگئی لیکن میرے بعض ساتھی اپنے خیال پر اڑتے رہے ۔ انہوں نے شہر کے تمام طلباء میں اس مسئلہ کو پھیلایا اور جا بجا اس پر بحثیں ہونے لگیں ۔

جُدلی نے ایک دن مجھ سے کہا کہ تم کس کو فرقہ ناجیہ سمجھتے ہو؟ میں نے کہا کہ "میں تم سے متفق ہوں کیونکہ حضرت انس رض کی روایت ہے " اکثر اھل الجنۃ البلہ " اور جنتی ہونے کی وجہ یہ علامت زیادہ تر اسی فرقہ میں دیکھتا ہوں کہنے لگے کہ یہ تو مذاق ہے ۔ صحیح رائے بیان کرو ۔ میں نے کہا کہ جب تم حدیث نہیں مانتے تو رائے کیا مانو گے ۔

مولوی ماجد علی صاحب مولانا عبدالحق صاحب خیرآبادی کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ مشہور یہ تھا کہ اٹھارہ سال تک ان سے منطق پڑھی ہے۔ مجھے اس زمانہ میں منطقیوں کے ساتھ بڑی دلچسپی تھی اور میں ان کو اہل علم میں سب سے زیادہ معزز سمجھتا تھا۔ مولوی صاحب چونکہ مانی ضلع جون پور کے رہنے والے تھے اس لئے ہموطنی کے تعلق سے کئی بار ہمارے یہاں آئے۔ مجھے ان کی باتیں بہت پسند تھیں نیز منطقیانہ طنزیات اور تجہیل عالم کے چٹکلے جو خیرآبادیوں کی مخصوص چیزیں ہیں۔ میں نے انھیں کے لباس جیسا لباس بھی اپنے لئے تیار کرایا تھا مگر اس کو پہنا نہیں کیونکہ یہ ڈر ہوا کہ والد اس منطقی وردی میں مجھ کو دیکھیں گے تو خیال کریں گے کہ معتقد ہے۔ ان کے رشتہ کے ایک بھائی باب اللہ ہمارے ساتھ پڑھتے تھے۔

مولوی برکات احمد صاحب ٹونکی یہ بھی مولانا عبدالحق صاحب خیرآبادی کے شاگردوں میں سے تھے بھوپال میں قاضی محمد ایوب صاحب کے یہاں رہتے تھے۔ میرا ارادہ ہوا کہ ان کی صحبت میں حاضر ہوں مگر سنا کہ وہ اہلحدیث کو کافر سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے ملاقات کا شوق کچھ گیا۔ یہ کفر کی خلیج اہل حدیث اور خیرآبادیوں کے درمیان مولانا فضل حق کے وقت سے حائل ہوئی جنہوں نے امتناع نظیر کے مسئلہ پر کتاب لکھ کر مولانا اسمعیل رح کی تکفیر کی۔ اسی کا سلسلہ آج تک چلا جاتا ہے۔ ان کے عقیدہ کی بنیاد یہ ہے کہ الوہیت نے جب تعین اختیار کیا تو وہی حقیقت محمدیہ ہوگئی جیسا کہ ان کے شاعر نے کہا ہے۔

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر — اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر

لہٰذا نہ صرف اس کا نظیر ممتنع ہے بلکہ اس کو بشر سمجھنا بھی غلطی ہے۔

مولوی صاحب کے پاس منطق پڑھنے کے لئے طلباء کی ایک جماعت جاتی تھی جن میں سے ایک شخص محمد عمر سیستانی صاحب استعداد تھے۔ انہوں نے مولوی ماجد علی صاحب سے بھی کچھ دنوں پڑھا تھا کہتے تھے کہ مولوی صاحب کو مسائل مستحضر ہیں مگر ذہانت وہ نہیں ہے جو مولوی ماجد علی میں ہے۔

ان کے انتقال کے بعد ان کے حالات نظر سے گزرے جن کو ان کے نزدیک شاگرد نے لکھکر شائع کرایا تھا اور ان کو زمانۂ گزشتہ کے کسی بڑے امام سے بھی کچھ بڑھ کر دکھلانے کی کوشش کی تھی مجھے دیکھ کر حیرت ہوگئی۔ میرا خیال ہے کہ اگر استاد کی شاگرد، پیر کی مرید، اور باپ کی بیٹا تاریخ لکھے تو سوائے واقعات کے اور باتیں بہت احتیاط کے ساتھ قبول کرنی چاہئیں۔ بلکہ واقعات میں بھی تنقید اور تحقیق کی ضرورت ہے۔

مولوی لطف الرحمٰن صاحب بردوانی ، وزیر عبدالجبار خان کے ساتھ کلکتہ سے آئے تھے اور ان کے چھوٹے

بیٹے عبدالعلیم کے مائگین تھے۔ منطق میں ان کا دعویٰ آسمان سے بھی زیادہ اونچا تھا مگر چونکہ حدیث دہلی میں میاں صاحب سے پڑھی تھی اس وجہ سے اہل حدیث کو کافر نہیں سمجھتے تھے۔

وزارتِ خانہ صدر منزل میں ہمارے دروازے کے بالکل سامنے تھا۔ میں وہاں روزانہ شام کو اخبارات پڑھنے کے لئے جاتا تھا۔ مولوی صاحب میرے منتظر رہتے تھے۔ وہ چونکہ اپنی تعریف سے خوش ہوتے تھے اس وجہ سے یہ صحبت بہت پُر لطف ہوتی تھی۔ حکیم عبدالکریم بھی جو شہر کے منصف اور میرے دوست تھے اس وقت آجاتے تھے مولوی صاحب کو بھی خوش کرتے تھے اور مجھے بھی ہنساتے تھے۔

مولوی صاحب نے بنگال میں کسی مقام پر رضاعی بھائی بہن کا نکاح کرادیا تھا اس پر وہاں کے مولویوں نے ان کے خلاف رسالے لکھے انہوں نے یہ پہلو اختیار کیا کہ زید نے ہندہ کا دودھ پیا لیکن زینب کو جو ہندہ کی بیٹی ہے اپنی ماں کا دودھ نصیب نہیں ہوا۔ لہذا زید اور زینب میں نہ رضاعت کا رشتہ ثابت ہے نہ ولادت کا۔ اس لئے ان کے نکاح پر حرمت کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ جوابات ایسی منطقی زبان میں لکھتے تھے جن کو ان کے سوا کوئی دوسرا سمجھ نہیں سکتا تھا۔ آخر بنگالی مولوی خاموش ہوگئے۔

فارسی دانی کا بھی دعوے رکھتے تھے۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی تخت نشینی کے موقع پر فارسی نظم و نثر میں تہنیت نامہ لکھا جو سرتاسر منطقی اصطلاحات سے لبریز تھا۔ مجھ سے تقریظ کی فرمائش کی۔ میں نے ایک لطیف نظم لکھ کر دی جس کو بہت پسند کیا اور اس کے ساتھ طبع کرالیا۔ اس کا ایک شعر یہ ہے۔

منطقی ایسے کہ گویا ہیں مجسم منطق   جس نے دیکھا نہ ہو منطق کو وہ کر لے درشن

شعرائے بھوپال کو طبع آزمائی کا ایک اور موقع مل گیا۔ انہوں نے بھی ذو معنین نظمیں لکھ کر ان کے پاس بھیجیں۔ مولوی صاحب نے ان سب کے ساتھ پھر دوبارہ اس کو طبع کرایا۔ وہ مجموعہ آج بھی جب کبھی میری نظر کے سامنے آجاتا ہے تو پڑھ کر لطف اندوز ہوتا ہوں۔

مولوی ہدایت اللہ خانصاحب رامپوری

مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی کے شاگرد رشید تھے۔ جون پور کے مدرسہ میں مفتی محمد یوسف صاحب کے بعد

لہ اچھے شاعر تھے پہلے عیش تخلص کرتے تھے ایک ناگوار حادثہ پیش آگیا جس کی وجہ سے بھوپال چھوڑنا پڑا اسوقت برہم تخلص رکھا اور گورکھپور جاکر وہاں سے مشرق نامی اخبار نکالنا شروع کیا۔

مدرس ہوئے اور وہیں اپنی زندگی گزار دی [illegible] مولوی [illegible] صاحب کے استاد تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے ان کو بھوپال میں بلا لیا تھا۔ مدیر صاحب کے یہاں مہمان تھے۔ والد نے بھی جون پور ہی کے مدرسہ میں تعلیم پائی تھی۔ اسی وجہ سے ان سے شاگردوں کی طرح جاکر ملے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ پھر وہ ہمارے گھر بھی کئی بار آئے۔ بہت کم سخن تھے۔ بس یہی اس وقت زیادہ ہو گیا تھا۔ درویشوں خاص کر مجددوں کے حد سے زیادہ معتقد تھے۔

مولوی لطف اللہ صاحب

علی گڑھ کے مشہور استاد حیدرآباد دکن میں عدالت العالیہ کے مفتی ہو گئے تھے ایک بار وطن جاتے ہوئے بھوپال میں ٹھہرے، والد کے ساتھ میں بھی ملنے کے لئے گیا۔ یہ بھی کم سخن تھے اور مریض۔ واپس آ کر والد نے کہا کہ ان کو کسی دشمن نے زہر دے دیا تھا جس کا اثر برابر چلا جاتا ہے۔ جب میں علی گڑھ کالج میں آیا تو کئی بار ان کے مکان پر جاکر زیارت کی۔ اس وقت خانہ نشین تھے بعد آنکھوں سے معذور۔ علم ہیأۃ میں خاص طور پر شہرت رکھتے تھے۔ قاضی عبد الکریم نے جن کے نام سے علی گڑھ کا چوک مشہور ہے مجھ سے کہا کہ وہ مدتوں اہل حدیث رہ چکے تھے۔

یہ چند سطریں [illegible] میں جانتا ہوں کہ یہ عوام کے لئے دل کش نہ ہوں گی [illegible] اور شعراء کے ساتھ تھے تو غالباً دلچسپ داستان ہوگی۔ مگر دین یا اصلاح ملت سے اس کا تعلق نہیں ہے اس لئے غیر ضروری سمجھتا ہوں۔

مرثیہ کیوں؟

آپ گھر میں ہوں یا دفتر میں، بازار میں ہوں یا دکان پر، ریل میں ہوں یا بس میں، تانگے میں ہوں یا ٹرام میں، بارات میں ہوں یا جنازے کے ساتھ — جہاں کہیں دو مسلمان جمع ہوں وہ مسلمانوں کی عام حالت کے مرثیہ خواں نظر آئیں گے۔ پہلے تو صرف اتنا ہی کہا جاتا تھا کہ قوم میں سخت افلاس ہے۔ لوگوں کے پاس کھانے کو روٹی، پہننے کو کپڑا اور رہنے کو مکان نہیں۔ بیمار پڑ جائیں تو دوا نہیں اور مر جائیں تو کفن دفن تک کے لیے پیسے نہیں۔ اب اس کے ساتھ اس کا بھی اضافہ ہوتا ہے کہ لوگ بددیانت ہیں، بے ایمان ہیں، چور ہیں، جھوٹے ہیں۔ بلیک مارکیٹ، رشوت، نفع خوری، خود غرضی اور اقربا نوازی عام ہے۔ اگر اس سے آگے کو حدوں تک جائیے تو مسلمانوں کا ہر ملک تباہ حال ہے، عوام میں جہالت اور غربت ہے، خواص خائن اور غدار ہیں۔ یہ مرثیہ تو عام ہے لیکن کوئی یہ نہیں بتاتا کہ

اس کی آخر وجہ کیا ہے

مسلمان کیوں ہر جگہ پستی اور ذلت میں ہیں؟

اگر آپ کو اس سوال سے دلچسپی ہے تو آپ وہ کتاب ضرور دیکھیے جس کا نام ہے

اسبابِ زوالِ امت

اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں

قیمت: (تازہ ایڈیشن): -/۵ روپے